"ترکشِ مارا خدنگِ آخرین"!

محمد علیؒ

ذاتی ڈائری کے چند ورق

حصۂ دوم

از

عبدالماجد دریابادی

صاحبِ تفسیر القرآن، مؤلف حکیم الامت، مدیر صدق جدید (لکھنؤ)

....

باہتمام

مولوی مسعود علی ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

قیمت:۔ صر (اقبال احمد تحریر نمود) ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء

فہرست مضامین

محمد علی

حصۂ دوم

ALLAMA IQBAL LIBRARY
19105

Acc No: 19105

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب (۶۸)

۱۹۲۷ء (۳)

بیباکی، شوخی، فراخ دلی

اسی ۲۷ء کا جون یا جولائی ہے۔ اور محمد علی لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ شہر کے ایک معزز گھرانے میں تقریب ہے۔ مولوی عبدالغنی پنشنر ڈسٹرکٹ وسشن جج[1] ہیں تو پنجابی، مگر لکھنؤ ہو چکے ہیں۔ اُن ہی کی تیسری لڑکی کی شادی، مشہور اسلامی مشنری خواجہ کمال الدین احمدی لاہوری (ووکنگ مشن والے) کے لڑکے کے ساتھ ہے۔ اور بارات لاہور سے آئی ہوئی ہے۔ محمد علی کے تعلقات دلہن کے گھرانے سے بڑے پرانے اور گہرے ہیں۔ بڑی لڑکی کے شوہر حسن محمد حیات ہیں۔ محمد علی کے رفیق قدیم اور ان کے ۲۰ء والے یورپی وفد خلافت کے سکریٹری۔ محمد علی اسی خصوصیت سے وہاں وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے ہیں، اور حیات صاحب کے بچوں اور بچیوں سے کھیل رہے ہیں ——— ایک بار پھر یاد کر لیجئے کہ مولانا بچوں بچیوں کے ساتھ کھیلنے کے حریص تھے ———
بعد مغرب بزم عقد آراستہ ہوئی۔ عین اس زمانہ میں مصر کی ایک بڑی "روشن خیال" خاتون ہندوستان آئی ہوئی تھیں اور اس وقت لکھنؤ کے اونچے حلقوں میں شمع بزم بنی ہوئی تھیں، کیسے ممکن تھا کہ یہ

[1] اودھ چیف کورٹ کے چیف جج اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج، جسٹس غلام حسن بٹ کے ماموں اور خسر اور اب مرحوم۔ (دسمبر ۱۹۵۱ء)

جلسہ ان سے محروم رہتا۔ اودھ چیف کورٹ کے ایک مشہور جج (غالباً اُس وقت چیف جسٹس) معزز ترین مہمان تھے۔ ان ہی کے پہلو میں اپنے برہنہ بازوؤں اور گوری پنڈلیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی۔ خواجہ صاحب ایجاب وقبول سے قبل تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، اور سورۂ نسا کی جو آیتیں نکاح کے خطبۂ مسنون کا جزو ہیں، انھیں پڑھ کر ان کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ فرنگی تہذیب کی بے اعتدالیوں اور بےحیائیوں کا ذکر یوں بھی لانا ضروری تھا، اور پھر اب تو سامنے فرنگیت کا ایک مجسم نمونہ بھی موجود تھا، تقریر کا رخ ابھی یورپی مشاہدات کی طرف مڑا ہی تھا کہ ان چیف جسٹس صاحب نے اپنے عہدہ و مرتبہ کی بڑائی سے فائدہ اٹھا کر اور عام آداب محفل کو ٹھکرا کر، مقرر سے ارشاد فرمایا "بس ان حملوں کو ختم کیجیے۔ یورپ کی زندگی کا تجربہ رکھنے والے دوسرے بھی ہیں" —— خواجہ صاحب ایک مشہور مقرر، مبلغ و مناظر ہی نہ تھے، اس محفل میں تو سمدھی کی اور نوشہ کے باپ کی حیثیت سے بھی ہر لحاظ اور احترام کے مستحق تھے۔ کوئی دوسرا انھیں یوں ٹوکنے کی جرأت کرتا، تو شاید اس کا منہ نوچ لیا جاتا۔ اور عجب نہیں جو صاحب خانہ اسے اپنی ذاتی توہین سمجھ کر ایسے مہمان کو محفل ہی میں موجود رہنے کی تکلیف نہ دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ اودھ کے سب سے بڑے عدالتی حاکم تھا۔ حاضر الوقت وکیلوں، بیرسٹروں، ڈپٹیوں، منصفوں بلکہ ججوں میں سے کسی کی مجال تھی، جو "ہوں" بھی کر سکے!

جسٹس موصوف کے فقرہ کی گونج ابھی فضا میں ختم ہوئی تھی کہ بجلی کی سی تیزی سے ایک آواز بلند ہوئی: "اور آپ کے ان یورپی تجربوں میں شریک رہنے والا اور ان کا گواہ کوئی اور بھی ہے"۔ آواز صدر محفل سے نہیں، دور سے ایک گوشہ سے آئی تھی، معاً سیکڑوں گردنیں اُدھر مڑ گئیں، صدہا آنکھیں اُدھر اٹھ گئیں۔ کہ ایسا بیباک اور سر پھرا ہو کون سکتا ہے! —— دیکھنے والوں نے دیکھا، تو یہ لقمہ دینے والا، داڑھی رکھائے ہوئے اور کھدری عبا پہنے ہوئے، آکسفورڈ کا گریجویٹ

محمد علی تھا! محمد علی، نوشہ کا تخت اور صدر مجلس کے صوفے اور کوچ چھوڑ عام حاضرین میں ملے جلے کھڑے ہوئے تھے، اور وہیں سے یہ فقرہ بول اٹھے تھے ——— جاننے والوں پر روشن تھا کہ اس وقت کے جسٹس صاحب ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ کے ایک ایڈوکیٹ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے، اور اسی سکریٹری کی حیثیت سے ان ہی محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی رفاقت میں بہ سلسلۂ ہنگامۂ مسجد کانپور[1] وفد لندن روانہ ہو گئے تھے، اور وہاں ان کی زندگی کا کوئی سا بھی گوشہ محمد علی سے مخفی نہیں رہا تھا، تلمیح بہت بلیغ اور معنی خیز تھی۔ لیکن بجز اس کے کہ اس تلخ گھونٹ کو خاموشی سے اتار لیا جائے، کوئی اور چارہ ہی کیا تھا؟

محمد علی کے لیے خلوت و جلوت یکساں تھی۔ اور جہاں تک مذہب و اخلاق کی نصرت و حمایت کا تعلق تھا، وہ ان کے لیے ہر جگہ ہر وقت شمشیر برہنہ ہی تھے۔

یہی محفل عقد جمی ہوئی ہے۔ مخصوص معززین صدر میں صوفوں اور کوچوں پر بیٹھے ہوئے ہیں باقی اِدھر اُدھر ٹھٹ لگائے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں علی گڈھ کے اولڈ بوائے ایک ڈپٹی صاحب بھی ہیں۔ جو غالباً اس وقت لکھنؤ ہی میں مجسٹریٹ ہیں۔ خواجہ صاحب کی تقریر ہو رہی ہے، اور لوگ سننے میں منہمک ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب دبے پاؤں ان مجسٹریٹ صاحب تک ان کی پشت کی طرف سے پہنچتے ہیں، اور سر پر ایک چپت جما دیتے ہیں! ڈپٹی صاحب، شہر کے حاکم اور پھر اتفاق سے خان صاحب بھی۔ قدرۃً دنگ اور حیران، غصہ سے بھرے ہوئے منھ پھیر کر دیکھنے لگے کہ بھری محفل میں ایسی حرکت ناشائستہ کر کون سکتا ہے ——— دیکھتے کیا ہیں کہ یہ حضرت پیشوائے ملک و قوم، صدر کانگریس، صدر خلافت مولانا محمد علی ہیں!

---

[1] اسی مسجد کا ہلکا سا ذکر جلد اول باب ۴ نمبر ۱۱ میں آچکا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو آگے کا باب ۴۳، قریب وسط۔

محمد علی کے زمانہ میں یہ صاحب بھی علی گڈھ میں تھے، گو ان سے جونیر۔ وہی بے تکلفی، یگانگت محمد علی کی طرف سے آج تک قائم تھی۔ حالانکہ اب سالہا سال سے ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا، بلکہ اس وقت تو محمد علی بہرحال سرکار برطانیہ کے مجرم ہی تھے، اور وہ ڈپٹی صاحب حاکم شہر!

تصنع و تکلف محمد علی جانتے ہی نہ تھے جب کسی سے ان سے راہ و رسم زندگی کے کسی دور میں بھی ہو گیا بس وہ اپنی طرف سے اسے آخر دم تک نباہنے کو تیار۔ اور اس میں نہ وہ اپنے مرتبہ کو دیکھیں نہ اس کے مرتبہ کو۔ ہاں بجز اس صورت کے کہ وہ کوئی دینی، ملی، قومی جرم کر کے انھیں ناخوش کر دے۔ بس پھر تو وہ اس کی شکل تک سے بیزار ہو جاتے، اور اس سے بات تک کرنے کے روادار نہ رہتے۔

محمد علی کے لیے کوئی سال اب صدموں اور سخت صدموں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ناموس رسول پر بعض گندہ ذہنوں کی طرف سے حملہ ہوتے رہتے تھے، ان کا اثر قلب پر ان سے بڑھ کر لینے والا اور کون تھا۔ پھر اپنی ہی قوم کی طرف سے شدید مخالفت اور مسلسل بغاوت۔ اس پر مستزاد روز افزوں ہند و مسلم مناقشات اور اندرون ملک قومی انتشار۔ گاندھی جی اور علی برادران کی کوششیں برابر ناکام ہوتی جارہی تھیں۔ ایک رخنہ کو بند کرتے تھے، تو چار رخنے دوسرے پیدا ہو جاتے تھے۔ اور سال کے خاتمہ پر دہلی کے مشہور و معروف طبیب اعظم اور خادم خلق حکیم محمد اجمل خان کی یک بیک موت نے تو محمد علی کا دل ہی بالکل بجھا دیا۔ حکیم صاحب نے عمر کل ۶۰، ۶۲ سال کی پائی، اور موت اتفاق سے خاص محمد علی کے وطن رامپور ہی میں ہوئی۔ گو وہ وطن ایسا تھا کہ اس سے بہ حکم ہز ہائینس نواب حامد علی خاں، والی رامپور اب علی برادران مدت سے جلا وطن تھے، اور سخت سے سخت خانگی ضرورت کے وقت بھی اس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔

یہ سب سیاسی اور ذاتی فکریں اور پریشانیاں تو تھیں ہی، گھلا دینے والا ایک بڑا غم یہ تھا کہ

ان کا نقیب و ترجمان ہمدرد مالی اعتبار سے برابر گرتا جا رہا تھا، اور اسی نسبت سے محمد علی کی مالی حالت بھی روز بروز زبوں سے زبوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ دہلی ہر دفعہ جا کر یہی تاسف انگیز منظر دیکھنا پڑتا تھا کہ خرچ سب وہی، وہی حوصلہ مندیاں، وہی مہمان داریاں، اور آمدنی جو کل تھی، آج اتنی بھی نہیں۔ عادت موٹر پر سوار ہونے کی تھی۔ وہ اب کہاں نصیب۔ نماز جمعہ کے لیے التزام جامع مسجد کی کیے ہوئے تھے، وہاں کے لیے تانگہ ہی سے کام لیتے تھے[1]، اور کبھی جب تانگہ کا بھی کرایہ جیب میں نہ ہوا، تو پیدل ہی چل کھڑے ہوتے۔ ایک روز شام کو ڈاکٹر انصاری کے ہاں جانا تھا، پیدل ہی گئے، پیدل ہی آئے۔ راستہ میں کہیں میری زبان سے نکل گیا کہ "کیا عرض کروں، میں تو دہلی بار بار آنے کے لیے تیار رہتا ہوں، آپ کو کبھی دوبارہ حکم دینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اگر ریلوے کمپنی کہیں اپنی معتقد ہوتی، تو یہ مسئلہ بھی حل تھا۔" معاً ان کا ذہن دوسری طرف منتقل ہوگیا، بولے کہ "دفتر ہمدرد بڑی خوشی سے مصارف آمد و رفت پیش کر دیا کریگا"۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، فوراً بات بدلی۔ یہاں لکھنے سے مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ محمد علی مفلسی میں بھی ہمت وہی رکھتے تھے۔ خود اچھا کھانا یقیناً چاہتے تھے لیکن اس سے بھی مقدم دوسروں کو کھلانا رکھتے۔

[1] اور ستم یہ کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر فقیروں اور فقیرنیوں کا غول جمع رہتا، انھیں دینے کے لیے جیب میں دو چار روپیہ کی ریزگاری ضرور رکھتے۔

باب (۶۹)

۱۹۲۸ء (۱)

(غیروں کی محفل میں۔ تنگدستی)

۲۷ء کا آخر تھا کہ لکھنؤ میں سکھوں کے ہاں کوئی بڑی تقریب ہوئی جس میں شرکت کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے سکھ لیڈر لکھنؤ آئے۔ ایک دن اعلان ہوا کہ شام کو چراغ جلے، گنگا پرشاد میموریل ہال میں پبلک جلسہ میں سردار منگل سنگھ اور بابا کھڑک سنگھ تقریر کریں گے۔ منگل سنگھ اس وقت کانگریس میں بہت پیش پیش تھے، غالباً ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی۔ بابا کھڑک سنگھ کا اثر و اقتدار کانگریسی حلقہ کے علاوہ بھی بہت تھا۔ اور اس وقت چوٹی کے سکھ لیڈر شاید یہی کہے جا سکتے تھے۔ اتفاق سے مولانا بھی اسی دن لکھنؤ آ گئے۔ اور وہ کانگریس کے تازہ سابق صدر تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ جلسہ میں مدعو نہ کیے جاتے۔ جلسہ ایک مسلمان (اس وقت کے نیک نام اور بعد کے "بدنام") مقامی لیڈر چودھری خلیق الزماں کی صدارت میں شروع ہوا ——— ۴۶ء و ۴۷ء کے دور سے قبل خالص سکھوں کے جلسہ بھی مسلمان کی صدارت میں ہو سکتے تھے، اور چودھری صاحب اس وقت ہندو مسلمان دونوں کے لیڈر تھے ——— اور ڈائس پر مولانا بھی دونوں سکھ لیڈروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ پہلے سردار منگل سنگھ بولے۔ اور وقت کی سیاست کی ترجمانی کرتے رہے۔ اور پھر بابا کھڑک سنگھ کھڑے ہوئے۔ چہرہ پر درویشانہ اشراقیت کی جھلک۔ تقریر شروع کی تو سیاست

سے کہیں زیادہ مذہب اور روحانیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی، کہیں شیخ سعدی کے اشعار، اور کہیں دوسرے مسلمان صوفیوں کے حوالہ۔ ان کی تقریر جاری تھی کہ صدر جلسہ کو کہیں اور جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ میری طرف اشارہ کیا، اور ڈائس پر بلایا۔ میں سمجھا کہ کوئی ضروری بات کہنا ہوگی۔ پہنچا، تو جھٹ اپنی کرسی خالی کر کے مجھے بٹھا دیا، اور کان میں چپکے سے یہ کہتے ہوئے چل کھڑے ہوئے کہ "میری جگہ تم ہی اب صدارت کر لو، مجھے جانا ہے"۔ انکار و گفتگو کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اب یہ خاکسار تھا اور کرسیٔ صدارت۔ کھڑک سنگھ کا درویشانہ وعظ کچھ دیر بعد ختم ہوا۔ اور مولانا کی باری آئی۔

محمد علی کی تقریر مذہب اور سیاست کا "آمیزہ" تو ہمیشہ ہی ہوتی تھی، اور پھر آج تو جلسہ کہنا چاہیے کہ غیر مسلموں ہی کا تھا۔ آج سے بڑھ کر تبلیغ کا موقع اور کب ملتا۔ پوری تقریر اب کہاں، یاد ایک ذرا سا ٹکڑا حافظہ میں رہ گیا۔ خرمن کا اندازہ ان ہی چند دانوں سے کیجیے:

"میرا مذہب عدل کا مذہب ہے۔ میں تو اپنے مذہب کے لحاظ سے کسی پر ظلم زیادتی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ مسلمان کے ساتھ مسلمان کے خلوص کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو ناانصافی سے روکیں، عدل و خوش خلقی کی تلقین و تبلیغ کرتے رہیں "my country, right or wrong" (حق ہو یا ناحق، بہرحال ہمیں تو اپنے وطن کا ساتھ دینا ہے) یہ اور جس کسی کا بھی اصول ہو، مسلمان کا یہ مسلک نہیں ہو سکتا۔ ہمارے رسولؐ نے ایک بار فرمایا

انصر اخاک ظالما او مظلوما
اپنے بھائی کی مدد کر، وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو،

صحابہؓ نے عرض کیا، کہ حضرت مظلوم بھائی کی مدد تو سمجھ میں آگئی، وہ تو بیشک ہمارا فرض ہے لیکن ظالم مسلمان کی مدد سمجھ میں نہ آئی۔ وہ اگر ظالم ہے تو کیا اس کے ظلم پر ہم اعانت کریں؟ ارشاد ہوا کہ ظلم پر اعانت ہرگز نہیں۔ ظالم بھائی کی مدد یہی ہے کہ اسے ظلم سے روکو، باز رکھو۔ یہی اس کی

سچی دوستی اور یہی اس کی حقیقی خیر خواہی ہے۔ تو حضرات میرا کام تو اللہ کی سرزمین کو عدل سے بھر دینا ہے
میرا مذہب ساری دنیا کے لیے رحمت ہے۔ مسلمان تو دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا ہی اس لیے
گیا ہے کہ وہ عدل کی حکومت پھیلائے۔"

یہ تقریر کانگریس کے سابق صدر کی تھی! ——— ۸، ۱۰ سال قبل عین نظر بندی کے
زمانہ میں، ریل پر دوران سفر میں محمد علی نے اپنے اس نیاز مند سے جوش و خروش کے لہجہ میں کہا تھا کہ
اب دھن ہے تو اس کی کہ نظر بندی سے چھوٹوں، تو یورپ پہنچوں اور وہاں گلی گلی اسلام کی
تبلیغ کرتا پھروں[1] ——— دیوانہ اپنی وہی صدا اب لگاتا پھر رہا تھا!

۲۸ء کی پہلی سہ ماہی تھی کہ سرکار برطانیہ نے ہندوستان کی آئینی آزادیوں کی تحقیق
اور ہندوستانیوں میں خود مختاری کی جانچ کے لیے ایک کمیشن سر جان سائمن کی صدارت میں
بڑی دھوم دھام سے ہندوستان بھیجا۔ یہاں مخالفت بھی اس کی اسی زور شور سے ہوئی۔ اور شہر
شہر "سائمن گو بیک" (سائمن واپس جاؤ) کے کرخت نعرے سیاہ جھنڈیوں کے جلوس کے ساتھ
لگنے لگے۔ لیکن مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت، برادران وطن کی تنگ نظری سے تنگ
آکر، اس کمیشن کے ساتھ اتحاد کو تیار ہو گئی۔ لکھنؤ میں ایک پبلک جلسہ ایک سہ پہر کو امین الدولہ
پارک میں کمیشن کی مخالفت و مقاطعہ کے لیے منعقد ہوا۔ اتفاق سے محمد علی بھی لکھنؤ میں موجود تھے،
اور مولانا ابو الکلام اور حسرت موہانی بھی۔ جلسہ میں ان تینوں کا موجود ہونا لازمی۔ خبر یہ گرم تھی کہ
مسلمانوں کا ایک بڑا جتھا، شہر کے ایک ذی اثر عوامی لیڈر (مولوی حکیم وزیر حسن مرحوم[2]) کی قیادت

---

[1] ملاحظہ ہو جلد اول، باب ۱۱ - نمبر ۱ (۱) [2] ایک زبردست و پر جوش عوامی لیڈر تھے۔ پاکستان
بنتے ہی کراچی منتقل ہو گئے۔ اور چند ہی ماہ بعد وہیں انتقال فرمایا۔

میں آئے گا، اور جلسہ میں آکر بولنے والوں کا ناطقہ بند کرے گا۔ اور مشہور یہ تھا کہ حسرت موہانی بھی اسی گروہ کے پشت پناہ ہیں۔ فضا ہو بھی ایسی چکی تھی کہ ہندوؤں کے مسلسل متعصبانہ طرزِ عمل کے باعث مسلم عوام کے دل ان سے ہٹ چکے تھے۔ اور اب وہ کسی جد و جہد میں بھی ان سے اشتراک نہیں چاہتے تھے۔ خیر وہ لوگ آئے۔ اور اب منظر قابل دید تھا اس جتھے کے منہ لگنا اپنی عزت و وقار بلکہ اپنے جسم و جان سب کو خطرہ میں ڈالنے کے مرادف تھا۔ اس لیے اب کسی بڑی سی بڑی شہرت رکھنے والے مسلم لیڈر میں تقریر کرنے کی ہمت کہاں تھی۔ یہ ہمت حضرت محمد علی نے کی۔ کھڑے ہوئے، اور کچھ دیر بولنے کے بعد سوال حسرت موہانی سے کیا۔

"حسرت صاحب، آپ کمیشن کے ساتھ موافقت کے حق میں ہیں یا مخالفت کے"؟

"جی میں نہ موافق ہوں نہ مخالف"۔

"اچھا، تو یہ کہیے، کہ آپ نہ "کوآپریشن" کرنا چاہتے ہیں نہ "نان کوآپریشن"۔ بلکہ صرف آپریشن چاہتے ہیں"۔

جلسہ اس پر خوب ہنسا، اور خوب کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کے بعد مولانا، مخالفین کے لیڈر حکیم صاحب سے مخاطب ہوئے، اور ذیل کے فقرے سب نے سنے :۔

"حکیم صاحب۔ آپ میری تقریر سن چکے، اب بھی آپ ان لوگوں کے رویہ کو پسند کرتے ہیں جو آپ کے ساتھ آئے ہیں! اگر نہیں، تو ابھی اور یہیں ان لوگوں کے سامنے امر بالمعروف کیجیے"۔

حکیم صاحب بیچارہ کو اب تقریر کرتے ہی بنی۔ کمیشن کی موافقت میں نہیں، مخالفت میں!

مخالفین کی کثرت و شوکت سے محمد علی مرعوب و متاثر ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ کہا کرتے تھے کہ "تبلیغ کا حق تو ابوجہل کے سامنے تقریر کرنے سے ادا ہوتا ہے، ابوبکر صدیقؓ کو کوئی کیا تبلیغ کرے گا"۔

محمد علی کی مالی اور خانگی پریشانیاں اب حد کمال کو پہنچ رہی تھیں۔ قرضہ سے لدے ہوئے تھے۔ ہمدرد سے زیر باری اور بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مخلصوں اور نیازمندوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ مارچ و اپریل میں ہیم نیازنامے میں نے ان ہی مسائل سے متعلق لکھے۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ دل کو ڈھارس دیے رہیے۔ اپنی طرف سے تقوی الٰہی پر قائم رہیے۔ کشائش رزق کی، بالکل غیر متوقع سمتوں سے، بشارت بلکہ وعدہ تک موجود ہے۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ شوقینی کے ساتھ تو نہیں، البتہ بالکل سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی کھدر scale کے مطابق، یعنی ساری زندگی کو کھدری لباس کے پیمانہ پر لا کر یہ بتائیے کہ گزر بسر کتنے ماہوار میں ہو سکے گی، تاکہ ہم نیازمند کچھ اس کی فکر کر کے دیکھیں۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ ہمدرد اگر بند ہی کر دینے کا تہیہ آپ فرما چکے ہیں، تو پھر اور کیا کرتے رہنے کا ارادہ ہے؟ مختلف انگریزی ولایتی پرچوں میں اگر مہینہ میں آپ چند ہی مضامین لکھ دیا کریں، تو بہ آسانی معقول معاوضہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آخر سینٹ نہال سنگھ[1] وغیرہ کا یہی ذریعۂ معاش ہے۔ ایک خط میں یہ بھی عرض کر دیا کہ خود آپ کی مالی حالت تو ظاہر ہی ہے، شوکت صاحب کا خدا معلوم کیا حال ہے، عجب نہیں جو آپ سے تو بہتر ہی ہو۔ وقس علیٰ ہٰذا

شروع اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ اور ڈاکٹر سید محمود[2] (سابق سکریٹری مرکزی خلافت کمیٹی جو جواب بھی علی برادران کے خاص مخلصوں میں تھے) بھی کسی تقریب سے لکھنؤ آئے ہوئے۔ محل سرائے فرنگی محل میں ہم دونوں قطب میاں صاحب کے ہاں یکجا ہوئے۔ ادھر ہم تینوں کی زبان پر یک وقت یہی مسئلہ محمد علی کی معاشیات کا آیا۔ تینوں یکساں مخلص اور اس وقت تک محمد علی کی محبت و عقیدت میں غرق ——— قطب میاں کے لیے یاد کر لیجیے کہ علی برادران کے شیخ و مرشد مولانا عبد الباری

---

[1] اپنے زمانہ کے ایک مشہور انگریزی مضمون نگار کا نام، ہندوستانی عیسائی تھے [2] موجودہ وزیر صوبہ بہار (جنوری ۱۹۵۲ء)

فرنگی محلیؒ کے بھتیجے اور داماد اور جانشین تھے، مولاناؒ کے صاحبزادہ جمال میاں صاحب (جو آگے چلکر ایم، ال، اے، اور مالک و ایڈیٹر ہمدم ہوئے) اس وقت تک بہت چھوٹے تھے، اور اس لیے اسوقت مولاناؒ کے جانشین اور خلیفہ قطب میاں صاحب ہی بلاشرکت غیرے تھے ——— دیر کی رد و قدح کے بعد آخر یہ طے پایا کہ محمد علی کے خوش حال مداحوں اور معتقدوں میں سے ۱۰، ۱۲ ایسے لوگ انتخاب کر لیے جائیں، جو ہر حال میں نذرانہ پیش کرتے رہنا اپنا فریضۂ اخلاص سمجھیں، اور سیاسیات کے اتار چڑھاؤ سے غیر متاثر رہ کر اپنا تعلق محمد علی کی ذات سے وابستہ رکھیں، اور نذرانہ فی کس کم از کم ۲۵ عـــہ ماہوار تجویز ہوا۔ گویا اس طرح کاغذ پر ۲۵۰ مـاـ ۳۰۰ عـــہ ماہوار کی آمدنی کا انتظام کر لیا گیا۔ اور تلاش واقعیت کی دنیا میں ان دس بارہ ناموں کی شروع ہوئی۔ قطب میاں اور ڈاکٹر محمود یہ دونوں تو خود تھے ہی، باقی ۱۳ نام اور خیال میں رکھ لیے گئے۔ عبد المجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی نواب محمد اسمٰعیل خاں، شاہ مصطفیٰ احمد رودلوی، سیٹھ عبد اللہ ہارون، وغیرہم۔ کہ ان میں سے کٹ چھنٹ کر ۱۰، ۱۲ نام تو بہر حال یقینی نکل آئیں گے۔ ڈاکٹر محمود صاحب کو اخلاص خصوصی شوکت علی کی ذات سے تھا، انھوں نے زور دیا کہ ان کی معاش کا بھی انتظام ضروری ہے۔ رقم کی میزان اس لیے دوگنی کرنی پڑی۔ خطوط زیادہ تر اس خاکسار ہی نے لکھے۔ کراچی کے حاجی سیٹھ عبد اللہ ہارون کا جواب بڑی مستعدی سے اور ہمت افزا آیا۔ حسن اتفاق سے ایک اس طرح کے خط کا مسودہ اتنے دنوں کے بعد ہمیں ان سطروں کی تحریر کے وقت اپنے کاغذات میں محفوظ نکل آیا۔ باب کے آخر میں بطور ضمیمہ کے ملاحظہ فرمایئے۔ خط کے مکتوب الیہ کا نام اب پوری طرح ذہن میں نہیں۔ عجب نہیں جو قاسم حسن بدایونی مرحوم ہوں۔ جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور علی برادران ہی کے محبت کے جرم میں سرکاری ملازمت سے علحدہ کر دیے گئے تھے۔ حیدر آباد چلے گئے تھے اور وہاں کسی عہدہ پر مامور تھے۔ سیٹھ صاحب مرحوم کا جواب بھی محفوظ رہ گیا۔ ضمیمہ میں وہ بھی ملاحظہ ہو۔

ضمیمہ باب (۷۰)

(۱)

دفتر صدر اودھ خلافت کمیٹی ۱۵ / اپریل ۲۸ء

دریاباد - بارہ بنکی

مخدوم و مکرم السلام علیکم ورحمت اللہ۔

آپ غالباً مجھ سے واقف ہی نہ ہونگے۔ لیکن آپ سے مجھے مولانا محمد علی نے ناواقف نہیں رکھا ہے۔ آپ کے ان کے جو گہرے مخلصانہ تعلقات ہیں، ان ہی نے اس نیاز نامہ کی تحریر کی مجھے جرأت دلائی ہے۔

مولانا کی مالی حالت جس قدر زبون وابتر ہو رہی ہے۔ اس کا حال آپ کو شاید مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہو۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے؟ اگر حیدرآباد، یا بھوپال، یا کم از کم محمود آباد ہی سے کسی معقول وظیفہ کی توقع ہوتی، تو پھر کوئی دقت ہی نہ تھی لیکن مسلمان قوم کی قسمت ایسی کہاں۔ اب اگر کچھ کرنا ہے تو ہم ہی غریبوں اور تہی دستوں کو کرنا ہے۔ اور اس میں بھی ہر شخص کو نہیں، بلکہ پورا اعتماد اور کامل خلوص رکھنے والے معدودے چند ہی افراد کو شریک کرنا ہے۔

مالوی جی کو سنا ہے کہ ان کی قوم ۵ ہزار ماہوار پیش کر کے ہر طرف سے بے فکر کیے ہوئے ہے۔ اتنی بڑی رقم تو ہمارے لیے خواب وخیال ہے۔ ہم اگر ۵، ۶ سو ماہوار کا بھی انتظام کرلے جائیں تو بڑی بات ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ۶۰۰ سو ماہوار کا انتظام ہم چند نیازمند آپس میں کرلیں، اور ایک سال

کی رقم ڈاکٹر انصاری صاحب یا دہلی کے کسی اور معتبر شخص کے پاس جمع کرا دیں۔

کراچی کے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب نے سو ماہوار کا عطیہ منظور کر لیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود (بیرسٹر چھپرا) اور قطب میاں صاحب (فرنگی محل) اپنی اپنی حسب حیثیت پوری شرکت کریں گے۔ دونوں صاحب بخوشی وعدہ فرما چکے ہیں۔ میرٹھ کے نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کو آج ہی خط لکھ رہا ہوں۔ عبدالمجید خواجہ اور تصدق احمد خان شروانی سے اسی ہفتہ انشاء اللہ الہ آباد میں مل کر زبانی کہنا ہے۔[1] میری ذاتی رائے تو صرف مولانا محمد علی صاحب کے لیے اس انتظام کی تھی۔ لیکن ڈاکٹر محمود صاحب کا اصرار ہے کہ "بڑے بھائی" کو بھی ضرور شامل رکھا جائے، اور اس لیے رقم دونی رکھنی پڑی۔

ضرورت و اہمیت پر آپ کو کچھ لکھنا میرے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔ آپ بطور خود جو کچھ بھی شرکت فرما سکتے ہوں، اس کے علاوہ حیدر آباد کے کسی اور صاحب کو بھی اگر شریک کر سکتے ہوں تو براہ کرم ضرور اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ آپ کے جواب کا انتظار ڈاک کی واپسی سے رہے گا۔ خدا کرے یہ نیاز نامہ آپ کو ٹھیک پہنچ جائے۔ اس لیے کہ آپ کے صحیح پتہ کا بھی مجھے علم نہیں۔ والسلام

عبدالماجد

(۲)

جواب مکتوب از حاجی عبداللہ ہارون صاحب

نیپر روڈ۔ کراچی

۱۲ اپریل ۲۸ء

بہ ملاحظہ اقدس مولانا عبدالماجد صاحب

دریاباد

محترمی، السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۷ اپریل موصول ہو کر کاشف حالات ہوا۔

---

[1] یہ دونوں صاحب اس وقت الہ آباد کے نامور بیرسٹر تھے۔

میں نے مبلغ ایک ہزار روپیہ جو مولانا محمد علی صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اس کا اعلان اخبار میں بھی کر دیا۔ میں نے ہمدرد کا وہ پرچہ ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ آپ کے خط سے یہ معلوم ہوا۔ بہر حال مجھے اس قسم کا اعلان بہت ناپسند ہے۔ میرے جو تعلقات علی برادران سے ہیں، وہ اس طرح کے نہیں کہ اخبارات میں اس حقیر رقم کا اعلان کیا جاتا۔

آپ نے جو تجویز پیش فرمائی ہے وہ بہت مناسب ہے۔ علی برادران کے دوست واحباب کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ ہر ایک کچھ تھوڑی سی رقم بھی ان کے ذاتی اخراجات کے لیے مستقل طور پر مقرر کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ان کو نہایت آسانی سے ذاتی اخراجات کی طرف سے بے فکری رہ سکتی ہے۔

علی برادران نے جس ایثار اور قربانیوں کے ساتھ مسلمانوں اور اسلام کی خدمت کی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ وہ اگرچہ اپنے مقاصد اور امیدوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تاہم ان کی حق گوئی، اور اسلام پرستی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور مستقبل میں ان کی مساعی کو ضرور سراہا جائے گا۔

میں دو سال تک مبلغ ایک سو روپیہ ماہوار دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ رہا خزانچی[1] ہونا تو بہتر ہو کہ آپ دہلی میں کسی کو مقرر فرما دیں۔ میں دور دراز جگہ پر رہتا ہوں، اور اس کے علاوہ مجھ پر اس قسم کی اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔

ہمدرد کے متعلق میں نے دہلی میں مولانا سے باتیں کی تھیں۔ موجودہ فضا میں ہمدرد کا چلنا دشوار ہے[2]۔ ہندوؤں کے طرز عمل نے مسلمانوں کو اس طرف سے بہت بدگمان کر دیا ہے۔

---

[1] ابتدائی تجویز سیٹھ صاحب کے خزانچی بنائے جانے کی تھی [2] مولانا ابتک ہندوؤں کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے تھے، اور ہمدرد برابر ہندو مسلم اتحاد کی پالیسی کی علمبرداری کر رہا تھا مسلمانوں کی عام پبلک اس مسلک سے اکتا چکی تھی۔

اور وہ موجودہ حالت میں ہمدرد کی پوری قدر وقیمت نہیں کر سکتے۔ میرے خیال مولانا یا تو ہمدرد کو بند کر دیں[1]

اور اپنے خیالات دوسرے اخبارات میں شائع کرتے رہین۔ یا ہمدرد کو ہفتہ وار کر دیں، اور اس مین

اپنے مضامین لکھا کریں۔ اس طرح سے ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی رہے گی۔ اگر فضا بدلی اور

حالات موافق نظر آئے، تو اس کو پھر ترقی دی جا سکتی ہے،

مولانا کی صحت پر ہمدرد کے خسارہ کی وجہ سے برا اثر پڑ رہا ہے اور ایک آدمی اتنے افکار

برداشت نہیں کر سکتا۔

مولانا جیسے قوی کام کرنے والے آدمی کو جسے دن رات کانفرنسون اور جلسون سے فرصت

نہ ملتی ہو، روزانہ اخبار کا بوجھ اپنے سر پر لینا ہی نہیں چاہیے تھا، اور نہ وہ تجارتی اصولوں پر اخبار

کو چلا سکتے ہین۔ اپنے خیالات کی اشاعت ضروری سمجھتے ہیں[1]، تو ہفتہ وار اخبار سے یہ غرض پوری

ہو سکتی ہے۔

مولانا کے ذاتی اخراجات کا اہتمام نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس کام

کو شروع کیا ہے، خدا اسے پورا کرے۔ والسلام

نیازمند

حاجی عبداللہ ہارون

[1] یہ فقرہ اندازاً اور قرینہ سے لکھ دیا گیا، اصل خط کا کاغذ بہت بوسیدہ ہو گیا ہے، اور یہاں کے کئی لفظ اڑ گئے ہیں،

باب (۶۰)

سنہ ۱۹۲۸ء (۲)

"(الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا)"

ضمیمہ تو درمیان مین حائل ہو گیا تھا، اب اصل سرگذشت پھر ملاحظہ ہو، اور پہلے میرے عریضون کا جواب مولانا کے قلم سے :

۲۴ر اپریل سنہ ۱۹۲۸ء　　　　ہمدرد، کوچہ چیلان، دہلی

برادرم محترم و مکرم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ ۔ مدتوں سے آپ کے محبت نامے سینے کی جیب مین دل کے قریب ہی ڈالے ہوئے پھرتا ہون، تاکہ ذرا وقت ملے اور جواب تحریر کرون، مگر اب تک موقع نہ مل سکا جس طرح رام پور گیا۔ جس طرح خلاف توقع واپس آیا اور جس طرح دو والیانِ ریاست[1] کے درمیان کم از کم عارضی طور پر ناچاقی کا سبب بنا۔ اس کی داستان طولانی ہے۔ اگر گھر مین طبیعت درست ہو گئی[2] اور آپ ایک ہی دو دن کے لیے آسکیں تو تشریف لائیں اور اس داستان کو سنیں اور ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب کی تفسیر و تعبیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ جن باتون کا جواب آپ مانگتے ہیں وہ بھی آپ کے تشریف لانے پر ہی

[1] یعنی نواب صاحب رام پور اور مہاراجۂ الور [2] مکتوب الیہ کے گھر میں اس وقت زیادہ علیل تھیں اور لکھنؤ مین زیر علاج ۔

دیا جا سکتا ہے، میں نے برادرم ظفر الملک صاحب سے عرض کر دیا تھا کہ میرے ذاتی مصارف اس سے زیادہ نہ ہوں گے جو جیل خانہ میں تھے۔ جس طرح وہاں گذر تا تھا یہاں بھی گذر کر دونگا۔

اور میری بیوی بیچاری مجھ سے کم کھاتی ہے، اس لیے اس کے واسطے بھی یہی اسکیل کافی ہوگی۔ لیکن میں اس اسکیل پر اسی وقت رہنا شروع کر دوں گا جب ہمدرد کو بند کر دوں گا۔ میری صحت میرے بال بچوں کی صحت بالکل خراب ہے۔ میں اب مالی تفکرات سے بالکل بچنا چاہتا ہوں تاکہ کچھ عرصہ تک آرام کر سکوں۔ گوشہ نشینی کو حرام سمجھتا ہوں، مگر اب قدمے اور قلمے مدد کرنے کے لیے سامان فراہم نہیں جس قدر ہو سکے گا، سخنے ہی مدد کروں گا درمے مدد کرنے کے قابل پہلے بھی نہ تھا، جس قدر تھا کرتا تھا جبقدر اب بھی رہونگا کروں گا۔ میں اس فکر میں ہوں کہ کیا کام کر کے ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار تین گھنٹے محنت کر کے معاوضہ کے طور پر کما سکوں۔ "ہمدرد" کی اڈیٹری اب نہ کروں گا۔ میں مضمون لکھ کر ہی اگر روٹی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبارات کم نہیں ہیں مگر مجھے اڈیٹری کرنا نہیں ہے۔ تبلیغ مد نظر تھی۔ مگر لوگ بظاہر سننا نہیں چاہتے۔ چند دنوں کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جب انھیں تجربہ سے معلوم ہوگا کہ جس طرح ہمارے علی گڈھ چھوڑ دینے سے ان کو فائدہ نہیں پہنچا، اسی طرح ہمدرد کے بند ہو جانے سے بھی کوئی خاص فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ تب وہ شاید پھر ہماری طرف متوجہ ہوں۔ میں ملت اسلامیہ کا بیحد مشکور رہوں۔ اب تک کامریڈ و ہمدرد پریس کے ڈینجر نے کا روپیہ سوائے ایک دو کے کسی نے نہیں مانگا۔ حالانکہ میں انکے نزدیک ایک چوتھے درجہ کے ڈپٹی کلکٹر کی تنخواہ کا بھی مستحق ہوں۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شوکت صاحب کی مالی حالت بھی وہی ہے، لیکن انکو ہمدرد کی طرح خلافت اپنے صرف سے شائع نہیں کرنا پڑتا۔ دوسرے ان کی بیوی نہیں

ے جنھوں نے محمد علی کی اس روح کو نہ جانا، انھوں نے محمد علی کو کچھ بھی نہ پہچانا۔

ایک لڑکی کے پورے مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں (گو شادی اس کی بھی ہو گئی ہے) اور ایک لڑکے کے[1] زاہد[2] خود تنخواہ پاتا ہے۔ دوسری لڑکی کی شادی عثمان[3] سے ہوگئی ہے۔ البتہ کچھ رقم ماہوار اسے بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ خود کھدر اسکیل پر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بیمہ غالباً دس ہزار روپیہ کا ہوا تھا، وہ رقم غالباً ابھی ملی ہے۔ رام پور میں ان کی ایک بنگلیہ ہے جس کے باغ کی کوئی چار سو روپے سالانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے، میرا کوئی گھر نہیں نہ کسی باغ کی آمدنی ہے میری حالت اگر ہمدرد سے اب کچھ نہ ملے تو ان سے کسی قدر خراب تر ہے ورنہ یقیناً اس میں بھی وہ بڑے بھائی" ہی تھے۔ میں قرض لے رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ وہ اس "فاقہ مستی" سے بچے ہوئے تھے۔

آپ کے لڑکے کی ولادت سے جس قدر جی خوش ہوا تھا، اسی قدر اس امانت کے چھن جانے سے صدمہ ہوا[4] اور آپ سے کہیں زیادہ بہن سے ہمدردی ہے[5]۔ میری بیوی بچے سب اس غم میں شریک ہیں، بہن تک اس پیغام کو پہنچا دیجئے۔ میرے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ مگر کوئی لڑکی بھی مری نہیں الا ماشاء اللہ۔ صرف آمنہ نے داغ جدائی دیا[6]۔ البتہ زہرا[7] کا دوسرا لڑکا جو نہایت ہی خوش اور ہنس مکھ تھا، ۸ ماہ کی عمر میں رخصت ہوگیا[8]۔ اس کا اسی طرح صدمہ ہوا جس طرح خود اپنے لڑکے کے اس عمر میں گذر جانے کا ہوتا ہے۔ پھر بھی سمجھتا ہوں کہ خداوند کریم نے مجھ پر بہت رحم فرمایا۔

حمیدہ[9] کا نکاح شروع جنوری میں ہو رہا تھا، مگر کچھ تو حکیم صاحب[10] رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات

---

۱ عابد علی خان مولانا شوکت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ۔ انجینئری کی تعلیم پائی۔ اب شاید کسی کارخانہ میں ہیں ۲ زاہد علی خاں مولانا شوکت علی کے بڑے صاحبزادہ اور مولانا محمد علی کے داماد بمبئی میں روزنامہ خلافت اور خلافت پریس کو اب تک وہی چلا رہے ہیں (۱۹۵۲ء) ۳ علی برادران کے بھانجے عثمان علی خاں ۴ شروع رمضان ۱۳۴۸ھ (اپریل ۱۹۳۰ء) میں اس بچہ کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی تھی اور آخر رمضان میں وہیں جاتا رہا تھا ۵ یعنی بچہ کی ماں، مولانا بجائے بھابھی کے آپ ہی کے من ہی کا رشتہ لیتے ہیں۔ لڑکا مسلسل کئی لڑکیوں کے بعد ہوا تھا، اس لیے اس کے مرنے کا صدمہ بھی ماں کو بہت زائد ہوا تھا ۶ ۱۹۲۴ء کے حالات میں یہ ذکر آچکا ہے ۷ مولانا کی سب سے بڑی صاحبزادی ۸ عارفہ نام، اس کا ذکر بھی کئی باب قبل گذر چکا ہے ۹ حمیدہ بی، مولانا کی تیسری صاحبزادی
۱۰ یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم (متوفی دسمبر ۱۹۲۷ء)

کچھ ماجد[1] کی پریشانیوں نے دیر لگائی۔ اب دو تین دن میں ہو ہی رہا تھا کہ ایسے شخص کی طرف سے ایسا ہوا کہ تو مہربانی کرو۔ میں خود شریک ہونا چاہتا ہوں۔ بار بار کہا کہ اس کی ماں سخت پریشان ہو گی اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ سامان کیا ہے خود اس کی ماں نے اپنی ۲۰ روپے ماہوار کی آمدنی سے کیا ہے۔ جو ۱۲ برس سے جمع ہو رہی تھی۔ اب تک صرف حج میں کام آئی تھی یا اب کام آئی ہے اور وہ ڈرتی ہیں کہ کہیں خانگی مصارف میں ان کی یہ قلیل پونجی بھی نہ اٹھ جائے لیکن برابر اصرار ہے۔ شوکت صاحب کے آنے پر اس کا فیصلہ ہو گا اور اس سے ایک اہم تر فیصلہ بھی جس کے لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی تشریف لائیں۔[2] عجب کشش و پنج میں گرفتار ہوں۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ دعا گو اور آپ سے کہیں زیادہ محتاجِ دعا

محمد علی

قطب میاں صاحب اور ظفر الملک صاحب کو بھی خط سنا دیجیے گا۔ قطب میاں کے عنایت نامے کا جواب جلد دوں گا

---

[1] یعنی ماجد علی خاں رامپوری مولانا کے ہونے والے داماد [2] مولانا ذیابیطس میں صرف علیل تھے۔ اتفاق کی بات کہ مہاراجہ الور دہلی میں ایک ایٹ ہوم میں مولانا سے مل کر ان پر خاص طور پر مہربان ہو گئے تھے۔ اور اپنے صرف پر علاج کے لیے مولانا کو یورپ بھیجنے پر اصرار کر رہے تھے۔ مولانا اس امداد کو قبول کرنے میں بہت پس و پیش کر رہے تھے۔ آخر میں فیصلہ ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی کے مشورہ پر اٹھ رہا تھا۔

باب (۱۸)

سنہ ۱۹۲۸ء (۳)

(”رزق تو بر تو زتو عاشق ترست“۔ صاحبزادی کی شادی)

مہاراجہ الور اس وقت ایک عجیب و غریب انسان تھے، بڑے قابل، فاضل، اپنے ہندو علوم کے علاوہ اردو، فارسی میں بھی برق، اور انگریزی میں بڑے خوش تقریر۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے بڑی دلچسپی اور محبت رکھنے والے۔ ساتھ ہی ان کے ذاتی چال چلن سے متعلق بھی حیرت انگیز روایتیں مشہور تھیں۔ خیر ان قصوں کی صحت و عدم صحت سے پبلک کو کیا غرض، اور اس ڈائری کو تو کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دسمبر سنہ ۲۵ء میں علی گڈھ کالج کی جوبلی کے موقع پر آئے، تو ایک بڑی گراں قدر رقم خاص عربی تعلیم کے لیے دے گئے۔ مارچ سنہ ۲۸ء کا ذکر ہے کہ دہلی میں کوئی پرائیوٹ ہوم تھا، جس میں اتفاق سے مہاراجہ کی نظر مولانا پر پڑ گئی۔ ملتے ہی مہربان ہو گئے۔ اور بڑے اصرار سے اپنے ہاں بلایا۔ اتفاق دیکھئے کہ ان سے اور نواب صاحب رام پور سے بھائی چارہ اور بقول شخصے دانت کاٹی روٹی تھی۔ مہاراجہ نے یہ جو سنا کہ مولانا کو رام پور جانے کی اجازت نہیں، تو سر ہو گئے کہ ”میرے ساتھ چلیے۔ دیکھوں آپ کو کون رام پور جانے اور رہنے نہیں دیتا ہے۔ نواب سے تو میں بات کہتے وہ حکم منسوخ کرا دوں گا، میرے لنگوٹیے یار ہیں“۔ مہاراجہ نے کچھ ایسی زبردستی کی کہ مولانا کو ان کے ساتھ جاتے ہی بن پڑی۔ وہاں پہنچ، مہاراجہ نے اپنی طرف سے

The J & K University Library
Acc. No. 19105

اپنا وعدہ پورا کیا۔ نواب سے بہت کچھ کہہ سن ڈالا لیکن تقدیر کا نوشتہ کون مٹا سکتا ہے۔ کچھ ایسے الجھاوے پڑ گئے کہ نواب نے ان کی بات بالکل رد کر دی، اور دونوں رئیسوں کے درمیان خود ہی رنجش و ملال کی نوبت آ گئی۔ مہاراجہ واپس ہوئے تو اس کد میں اب انہیں مولانا کے ساتھ اور خصوصیت بڑھ گئی۔ مولانا کو انھوں نے باصرار الور بلایا۔ اور وہاں ان سے بڑی پر لطف ملاقاتیں رہیں۔ مہاراجہ اپنا تخلص وحشی کرتے تھے، اپنی ایک کتاب مولانا کی نذر کی، اور اس پر اپنے قلم سے یہ دلچسپ فقرہ لکھا۔ To my Maulana from his Wahshi

(وحشی کا نذرانہ اپنے مولانا کی خدمت میں)۔ یہ حضرت بھی جواب میں کب چوکنے والے تھے۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو اور کچھ تو نکلا نہیں، جامعہ ملیہ کی انگریزی اسکیم اپنی ہی مرتب کی ہوئی موجود تھی، چٹ اسی کو نکال کر پیش کر دیا۔ اس چٹ پٹے فقرہ کے ساتھ :۔

From a bogus Maulana to a real Maharaja

(ایک بنے ہوئے مولانا کا نذرانہ، ایک اصلی مہراجہ کی خدمت میں)

مولانا کی صحت خراب مدت سے چلی آ رہی تھی، اب خراب تر ہو گئی تھی۔ اصل مرض ذیابطیس کا تھا، شکر پیشاب سے بکثرت خارج ہو رہی تھی۔ اور اب البیومن وغیرہ بھی خارج ہونے لگے تھے۔ راتوں کی نیند گویا اڑ گئی تھی۔ ہر وقت تلووں کی سوزش بیتاب رکھتی تھی۔ پرہیز کے معاملہ میں مولانا طبعاً ہی کچھ محتاط واقع نہ ہوئے تھے، پھر کثرت کار اور ہجوم افکار، جو ذیابطیس میں تو زہر ہی ہیں۔ ۲۸ء میں اصل عمر ۵۰ سے زائد نہ تھی لیکن چہرہ و بشرہ سے ۱۰، ۱۲ سال زائد کے معلوم ہونے لگے تھے۔ حالت خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ مہاراجہ الور کی نظر اس پہلو پر خاص طور پر گئی۔ وہ خود بھی ڈاکٹری کے بعض شعبوں سے واقف تھے، اور ذیابطیس کے مریضوں کا علاج تدریجی

اور مسلسل فاقوں کے ذریعہ سے کرنے کا فن یورپ سے سیکھ کر آئے تھے۔ وہ اب مولانا کے سر ہو گئے "کہ جس طرح بھی ممکن ہو، یہاں کے کام کاج چھوڑ یورپ روانہ ہو جائیے۔ میں اپنے استادوں کے نام تعارف نامے لکھ دوں گا، وہ اور زیادہ توجہ سے آپ کا علاج کریں گے۔ آپ کی زندگی ملک کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی حفاظت میں مدد دینا آپ کی ذات کی امداد کرنا نہیں، عین ملک کی خدمت میں حصہ لینا ہے۔ آمد و رفت، قیام، علاج کے سارے مصارف میرے ذمہ۔ آپ وعدہ کیجئے کہ جلد سے جلد آپ روانہ ہو جائیں گے" ——— مولانا کے لیے وعدہ کر لینا آسان نہ تھا۔ کشمکش میں پڑے۔ ایک طرف مہاراجہ کا اخلاص بالکل صریح اور نمایاں تھا، اور علاج کی واقعی شدید اور فوری ضرورت۔ لیکن دوسری طرف ایک رئیس و والی ملک سے ہزارہا کی امداد قبول کرنے کا طبیعت پر بار۔ آخر میں یہ وعدہ کیا کہ شوکت صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کر لوں، جب کوئی قطعی جواب دے سکوں گا۔ اس پر بڑی مشکل سے چند روز کی مہلت ملی۔ مولانا دہلی آئے۔ دونوں صاحبوں سے مشورہ کیا، اور دونوں نے اپنی منظوری دیدی۔ یہ سارے واقعات وسط اپریل میں پیش آئے۔

ادھر مولانا کی تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کے عقد کا وقت بھی ٹلتا چلا جا رہا تھا۔ دامادی کے لیے رام پور ہی کے ایک عزیز ماجد علی خاں طے ہو گئے تھے، جو الکٹرک انجینیرنگ کے کام سے واقف تھے، اور اپنا بجلی کا کاروبار شاید رام پور اور کلکتہ میں رکھتے تھے۔ مولانا کے سفر یورپ پر روانہ ہونے سے قبل عقد سے فراغت ہو جانا ضروری تھی۔

ہمدرد کا مسئلہ بجائے خود اہم و مقدم تھا۔ مولانا تو اسے بند کر دینے کی ٹھان چکے تھے۔ اور ارادہ یہی تھا کہ جانے سے قبل اس کا کاروبار بالکل سمیٹ دیں۔ اس نیازمند کو یہ کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ اپنے رفیق قدیم مولوی ظفر الملک علوی (مہتمم نیچ) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے

کہا کہ "ہمدرد کی مالی و انتظامی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ ہر مہینہ دو ایک بار دہلی جاکر دیکھ بھال کرلیا کروں گا، خرچ میں اچھی خاصی کفایت کی گنجایش ہے، اور معقول انتظام کے بعد پرچہ پر خسارہ اُٹھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایڈیٹوریل کی ذمہ داری تم لے لو، اور انتظامی صیغہ میرے اوپر چھوڑ دو"۔ بڑی تقویت ان کی اس گفتگو سے حاصل ہوگئی، اور دل میں ٹھن گئی کہ جو کچھ بھی ہو، انشاءاللہ ہمدرد کو بند نہیں ہونے دیا جائے گا۔ خط کے ذریعہ سے اجمالاً تو مولانا کو یہ اطلاعیں دے ہی دی تھیں، لیکن اصل ضرورت زبانی گفتگو کی تھی، اور پھر صاحبزادی کے عقد میں شرکت کے لیے تو دہلی یوں بھی جانا تھا۔

اپریل کی ۳۰ یا مئی کی پہلی تھی کہ ذیل کا مکرمت نامہ صادر ہوا:

"۲۹ اپریل ۲۸ء۔ دہلی۔

برادر محترم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

حمیدہ کی شادی ۶ مئی کو رکھی گئی ہے۔ مگر ابھی آخری اور قطعی طور پر تاریخ اس وقت مقرر ہوگی جب معظم صاحب[1] کے پاس سے آج کے ارجنٹ تار کا جواب آجائے گا کہ انھیں اس تاریخ کے لیے رخصت مل جائے گی۔

ظفر الملک صاحب کا محبت نامہ شوکت صاحب کے واسطہ سے جو میری اہلیہ کے نام آیا تھا ابھی دیکھنے میں آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ہمدرد بند کر دینے کے سوا چارہ کار نظر نہیں آتا، بہرحال میں تو چند ماہ کے لیے تمام کام بند کرکے اپنا علاج کرانے انگلستان جاؤں گا۔ غیب سے مدد مل گئی تو

[1] معظم علی خاں، مرحوم (ککن) بیرسٹر ایٹ لا۔ لڑکی کے حقیقی ماموں۔ اس وقت ریاست اندور میں ہائی کورٹ کے جج یا چیف جج تھے۔

اور مشورہ کرنے کے بعد امداد قبول کر لی گئی ہے۔ سوائے علاج کے اور کوئی غرض اس سفر کی نہیں ہے۔ اور فاقہ کرا کے علاج کیا جائے گا۔ کوئی اور کام کروں گا بھی نہیں۔

براہ کرم مشورہ کے لیے فوراً تشریف لے آیئے اور حمیدہ کے نکاح میں بھی شریک ہو جایئے۔ سوائے قطب میاں صاحب اور احباب فرنگی محل کے اور آپ کے اور ظفرالملک صاحب کے کسی کو نہیں بلا رہا ہوں۔

بہن کی طبیعت کیسی ہے[1]۔ میری بہن اور بچیاں سب صحت کامل کے لیے دعاگو ہیں۔ اور خیریت معلوم ہونے کے لیے سخت منتظر ہیں۔ براہ کرم فوراً چلے آیئے۔ تاکہ آخری فیصلہ دو تین دن میں کر دیا جائے اور اخبار کو بند کر دیا جائے۔

میں انشاء اللہ ۱۵ مئی میں ہندوستان سے روانہ ہو جاؤں گا۔ کیا لکھوں دل کی کیا کیفیت ہے۔

آپ کا بھائی محمد علی"

جانے پر تیار تھا ہی کہ ۷ مئی (چہار شنبہ) کو تار بھی اس مضمون کا پہنچا کہ "دہلی جمعہ کی صبح (۹) تک ضرور پہنچ جایئے۔ اخبار کی بابت آخری فیصلہ بہت ضروری ہے۔"

اب کی ظفرالملک صاحب کے ساتھ جم کر دو چار دن رہنا ہوا۔ محمد علی کے ہاں کی ذاتی تقریب میں پہلی بار شرکت کا اتفاق ہوا۔ محمد علی، میاں بیوی دونوں بڑے دل والے۔ بڑے حوصلہ والے تھے، خوب جی کھول کر خرچ کرنا، پورے ارمان اور حوصلہ نکالنا چاہتے تھے۔ اور کھانا کھلانے کے تو بادشاہ تھے لیکن حالات اس کی اجازت کہاں دے رہے تھے۔ بہرحال تقریب ایک

---

[1] میری بیوی مراد ہیں۔ تازہ زچگی کے بعد زیادہ علیل ہو گئی تھیں۔ محمد علی فرط اخلاص سے ان سے بہن ہی کا رشتہ لیتے تھے۔

بڑی حد تک سادہ ہی انجام پائی گو سادگی کی ابھی اور گنجایش اچھی خاصی باقی تھی۔ باہر کے مہمانوں میں کچھ زیادہ لوگ نہ تھے۔ فرنگی محلی پارٹی (فرنگی محل محمد علی کے شیخ و مرشد ہی کا گھر نہ تھا، اس سارے گھرانے سے ان کے بالکل عزیزانہ تعلقات بھی قائم تھے) کے علاوہ، محمد علی کے خاص خاص عزیز تھے، اور باہر کے دوستوں میں شاید صرف نواب محمد اسمٰعیل خاں، جو اس وقت تو صرف میرٹھ کے رئیس اور بیرسٹر تھے (مسلم لیگی لیڈر، اور علی گڑھ کے وائس چانسلر وغیرہ بعد کو ہوئے)۔ اور محمد علی کے بہت قدیم اور بے تکلف ملنے والوں میں تھے۔ رئیسانہ زندگی کے عادی تھے، محمد علی کے ہاں انھیں رہنے سہنے کی تکلیف ہوئی لیکن ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے۔

مولانا کے سب سے بڑے بھائی (مولانا شوکت علی سے بھی بڑے) ذو الفقار علی خاں صاحب بی' اے گوہر قادیانی (احمدی) ہو گئے تھے۔ اور قادیان ہی میں خلیفۂ قادیان کے ہاں کسی اونچی خدمت پر تھے۔ ان سے بھی ملاقات اب کی ہوئی۔ محمد علی کے عاشقوں میں تھے شوکت صاحب سے ذرا ان بن رہتی تھی، باتوں باتوں میں جھڑپ ہو جاتی تھی۔ بعض قادیانیوں کے مجھے بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں، بات بات پر کٹھ حجتی پر آمادہ، اور اشتعال انگیز بحثیں چھیڑ چھیڑ کر الجھا لینے والے۔ یہ ذو الفقار علی خاں صاحب اس کے بالکل برعکس نکلے، اور (ایک دوسرے قادیانی اکبر یار جنگ حیدرآبادی ہی کی طرح) خوش مزاج، بذلہ سنج، منکسر و متواضع اور بڑے پختہ دیندار، غیرت اسلام کے پتلے —— مولانا مودودی، جو اس وقت تک صرف مولوی ابوالاعلیٰ تھے اور الجمعیۃ کے ایڈیٹر، ان سے بھی پہلی علیک سلیک اسی موقع پر ہوئی۔ وضع قطع انگریزی خوانوں سے ملتی ہوئی۔ چہرہ صفاچٹ، لیکن اسلامی عنوانات پر اس وقت بھی خوب لکھتے تھے، اور دین کی حمایت و نصرت پر ہر وقت قلم آمادہ۔

دعوتیں اور کھانے بہت اعلیٰ پیمانہ پر تو نہیں، لیکن کچھ ایسے ہلکے پھلکے بھی نہ تھے۔ جہیز یاد نہیں

کے ہزار کا بندھا۔ نکاح غالباً قطب میاں صاحب نے پڑھایا، یا شاید مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ خوب یاد نہیں۔ ایک دن بغیر اجازت و اطلاع جامعہ ملیہ ظفر الملک صاحب کے ساتھ چلا گیا، اور وہاں اتنی دیر ہو گئی کہ کھانا بھی وہیں کھالینا پڑا۔ یہاں جب دسترخوان بچھنے کا وقت آیا، تو مولانا کو سخت فکر پیدا ہوئی، اور انتظار میں بڑی دیر تک کھانا ملتوی رکھا۔ بیشک یہ ہم لوگوں کی بالکل بیجا حرکت تھی، مولانا کو بلا وجہ فکر و تشویش میں ڈالنے کا خیال آج تک جب آجاتا ہے دل ندامت سے لبریز ہو جاتا ہے ——— میزبانی کر کر کے، دوسروں کو کھلا پلا کر، اتنا خوش ہونے والا میزبان کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

باب (٦٢)

سنہ ۱۹۲۸ء (۴)

(بیمار کا سفرِ یورپ)

مولانا کے معاشی مسئلہ کے حل کی جو اسکیم ہم نیازمندوں نے مل کر بنائی تھی، اس پر تفصیلی گفتگو کا اب موقع ملا۔ اس درمیان میں نواب محمد اسمٰعیل خاں نے خط کے ذریعہ سے ٹوکا بھی تھا کہ "آپ لوگ یہ خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ پہلے خود مولانا کی رضامندی تو حاصل کیجئے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں کہ ان کی خودداری اس صورت کو گوارا کرے گی"۔ اس پر دل نے الٹے نواب صاحب کی رائے کی تضحیک کی تھی، اور کہا تھا کہ "یہ نواب صاحب بھی خوب چیز ہیں۔ اختیار اور پسند کا اب سوال ہی کب ہے۔ اب صورت اضطرار کی سی پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا اسے بھی نہ گوارا کرینگے تو آخر کریں گے کیا۔ دوسری صورت کوئی ہے بھی تو نہیں۔ اور یہاں تو مخلصوں اور نیازمندوں کی طرف سے بطیب خاطر نذرانہ پیش ہو رہا ہے۔ اس میں تامل، و تردد کی بات ہی کیا ہو سکتی ہے"۔

——— بہرحال مولانا سے اب اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، اور پہلے ہی منٹ پر یہ نظر آگیا کہ رائے نواب صاحب ہی کی ٹھیک تھی۔ اور ہم تینوں نیازمندوں بلکہ مولانا شوکت علی تک کے اندازے تمامتر غلط! بولے۔ اور ہمت، صبر، استقلال کی پوری قوت کے ساتھ بولے کہ "ہرگز نہیں۔ ایسا کوئی بھی انتظام نہیں قبول کر سکتا ہوں، جب تک اپنی قوت بازو سے

کما سکتا ہوں، کماؤں گا۔ قوم میری خدمات اگر نہیں چاہتی تو ہٹا جاتا ہوں۔ پبلک زندگی سے ریٹائر ہوکر بس کوئی ٹیوشن کرکے، کسی رئیس زادہ کو دو تین گھنٹہ پڑھا کر ڈیڑھ سو ماہوار میں اپنی گزر بسر کرلوں گا۔ مضمون فروشی کرکے روٹی کمانا دوسروں کو مبارک رہے۔ میں ان کی تقلید نہیں کرسکتا اخبار نویسی میرا پیشہ نہیں، میں تو اسے صرف ذریعۂ تبلیغ سمجھ کر کرتا رہا۔ آپ لوگ قطعی اور ہرگز اس قسم کے انتظام کے پھیر میں نہ پڑیں۔"

اللہ اللہ! قرضداری اور زیرباری کے اس ہجوم میں بھی یہ ظرف اور یہ ضبط۔ بس محمد علی ہی کا کام تھا! ہم لوگ تو اس کا خیال بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ڈاکٹر محمود کے تعلقات ہندو لیڈروں سے بھی بڑے گہرے تھے۔ انھوں نے ایک بڑے نامور اور مقبول ہندو لیڈر کے لیے تفصیل سے بتایا تھا کہ انھیں فلاں ہندو ریاست سے اتنا ملتا ہے، اور فلاں سے اتنا۔ اور نہ وہ خود اور نہ ان کی قوم اسے ذرا بھی خودداری کے منافی سمجھتی ہے۔ اور تو اور، خود مولانا شوکت علی تک اس اسکیم کو اپنے اور محمد علی دونوں کے لیے منظور کرچکے تھے! ——— شوکت علی بھی اپنی جگہ ایک بڑے آدمی تھے، لیکن محمد علی کے ظرف کو کہاں پہنچتے تھے، محمد علی تو چیز ہی کچھ اور تھے۔ ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

بڑی رد و قدح ہمدرد کے جاری رکھنے اور بند کرنے پر رہی۔ مولانا بند کردینے پر بالکل تلے ہوئے تھے، اور دلائل کا وزن ان ہی کے ساتھ تھا۔ ادھر سے یہ نیاز مند اور مولوی ظفر الملک جاری رکھنے پر اڑے ہوئے تھے، اور اس پارٹی کی کمک پر شوکت علی صاحب مع اپنے بھاری بھرکم تن و توش کے تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مولانا خود تو اس کی ادارت سے ہٹ جائیں اور انتظامی

مالی ذمہ واریوں سے بھی سبکدوش ہو جائیں لیکن روزنامہ بدستور جاری رہے، ایڈیٹوریل پالیسی کی نگرانی اس خاکسار کے سپرد، اور انتظامی پہلو مولوی ظفر الملک کے ذمہ۔ اور اس جدید اسکیم کا نفاذ ۲۰ مئی سے ہو جائے۔ تاکہ مولانا اپنی روانگی سے دو چار روز قبل پرچہ کا نیا رنگ ڈھنگ بھی دیکھ لیں۔ ان کا جہاز بمبئی سے ۲ جون کو چھوٹنے والا تھا، اور وہ ایک ہفتہ قبل دہلی سے براہ اجمیر روانہ ہو جانے کو تھے ــــــــــــ ۲۰ مئی کے آنے میں دیر کیا لگتی۔ اس پرچہ میں "الوداع" مولانا نے اپنے نام اور اپنے قلم سے لکھی، بڑی پر اثر تھی، ابتدائی حصہ درج ذیل ہے:-

"حقیقۃً ایک اخبار اسی وقت چل سکتا ہے جب کہ عوام کو اس کی ضرورت محسوس ہو اور وہ کافی تعداد میں اسے خریدیں۔ آج عوام کو ہمدرد کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لیے میں اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر غالب کے اس شعر کو دہراتا ہوں ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

عوام کی آج پھر یقیناً وہی عالت ہے کہ

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اس لیے بہتر ہے کہ انھیں دو ایک سال کے لیے ان کے حال پر چھوڑا جائے اور خداوند کریم سے دعا کی جائے کہ وہ انھیں راہبر کی پہچان عطا فرمائے، اور بیشتر اس کے کہ ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک بھاگتے بھاگتے وہ بالکل خستہ اور چور ہو جائیں انھیں منزل مقصود کا پتہ لگ جائے، اور اس کی طرف بڑھنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ میں پہلے ہی "درد" ان کی کیا مدد کر سکتا تھا، اپنی استطاعت کے مطابق کچھ چندہ کسی فنڈ میں دے دیا اور بس۔" تلے"

اور "قدمے" البتہ میں نے مجنونوں کی طرح ان کی امداد کی، اور قرض میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔
اور صحت کو بھی خیرباد کہہ چکا۔ ذیابیطس کے مرض کے باعث پہلے شکر ہی آیا کرتی تھی، مگر امسال
چربی (البیومن) بھی آرہی ہے۔ اور ایسیٹون (زہر) بھی آرہا ہے۔ اور اعصابی سوزش نے رات کی
نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا ہے۔ اب ہمدرد کو بھی بند کرتا ہوں، اور باہر کی طلب پر کہیں جا بھی
نہ سکوں گا۔ تلخے اور قدمے جو ملک و قوم کی خدمت کرتا تھا، مجبور ہوں کہ اسے بند کر دوں۔ البتہ
جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش کے لیے ہر روز دو تین گھنٹہ یا ہر ہفتہ دو تین
روز کسی کی خدمت کر کے جو کچھ بطور اکل حلال کے مل سکے گا، اس کے کمانے کی کوشش کروں گا۔
اور باقی وقت میں خود پڑھوں گا اور اپنی بیویوں کو بھی کچھ پڑھاؤں گا۔ اور مسجد جامع میں یا کسی تفریح
کی جگہ پر اس بھائی کی خدمت کے لیے حاضر رہوں گا جو مفاد عام کے کسی کام کے متعلق میری رائے
دریافت کرنا پسند فرمائیں گے۔ کانگریس میں، خلافت میں، جمعیۃ علماء وغیرہ میں اس طرح برابر شریک
ہونے کی کوشش کروں گا جس طرح ایک مفلس و نادار ہندوستانی اور مسلمان شریک ہو سکتا ہے۔
یہ گوشہ نشینی نہیں ہے بلکہ مکہ سے ہجرت ہے۔ خدا کرے جلد فتح مکہ نصیب ہو۔ جو بھائی مجھے اور میرے
اہل و عیال کو اکل حلال کی کوئی صورت بتا سکیں، ان کا نہایت ممنون ہوں گا۔ لیکن اپنی ذاتی
ضروریات کے لیے کسی سے کوئی مدد نہیں قبول کر سکتا۔ سال گزشتہ بھی جب اس قسم کی مدد کے لیے
چند بھائیوں نے آمادگی ظاہر فرمائی تھی میں نے دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے مستفید
ہونے سے بہ مجبوری انکار کر دیا تھا۔ اور اسی پر آج بھی قائم ہوں۔"

اللہ اللہ! یہ مسلمانان ہند کا لیڈر اور وقت کا سب سے بڑا لیڈر، یوں پبلک زندگی سے ہٹنے
پر مجبور ہو رہا ہے! آئندہ نسلیں یقیناً اس واقعہ پر حیرت کریں گی۔ اور اس کے اسباب ان کی سمجھ میں
اسی طرح نہ آئیں گے جس طرح آج ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تیرہ سو سال قبل سیدنا حسینؓ کو

باایں عظمت وجلالت قدر میدان کربلا میں تنہا اور بے یار و مددگار کیسے چھوڑ دیا گیا تھا! ——— ذمہ داری سے خود مولانا کی ذات بھی بری نہیں کی جا سکتی لیکن بڑا دخل اس ملت کے بے حسی اور بد ذوقی ہی کو تھا۔ اور تفصیلی بحث کی اس "ڈائری" کے ہلکے پھلکے نقوش و تاثرات میں گنجایش نہیں۔

مئی کی ۱۲ ہے، اور ۱۰، ۱۲ دن کے لیے وطن جا کر میں پھر دہلی آگیا ہوں۔ اور آج کا ہمدرد میری نگرانی میں نکلا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک روزنامہ بالکل اپنے چارج میں پا رہا ہوں۔ محض ایڈیٹری اور شے ہے، اور مولانا کی جانشینی کرنا کچھ اور۔ سوال محض سلیقۂ تحریر و حسن انشاء کا نہ تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر صحیح بصیرت اور صحیح ملی رہنمائی کا تھا۔ اور مولانا کے یہی وہ جوہر تھے جن میں اس خاکسار کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس لیے طبعی طور پر جہاں فخر و مسرت محسوس ہو رہی ہے وہاں دل دھڑکتا بھی جاتا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ مولانا ابھی یہیں موجود ہیں، آج کا پرچہ میرے سامنے ان کی نظر سے گزرے گا۔ دیکھیے اس میں کیا کیا خامیاں نکلتی ہیں اور کیسی کیسی ڈانٹ سننا پڑتی ہے۔

رات کا وقت ہے، اور مولانا مردانہ مکان کے صحن میں مسہری پر آرام کے لیے آگئے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ ہاتھ میں تازہ ہمدرد لیے ہوئے ہیں۔ (ہمدرد صبح کو نہیں، شام کو نکلتا تھا) اب یہ بستر پر لیٹ کر میرے سامنے ہی پرچہ پڑھیں گے۔ اسی وقت ان کا ہمدرد پڑھنے کا معمول تھا۔ میرا پلنگ بھی قریب ہی ہے۔ کاش اس وقت میں موجود نہ ہوتا! فوری خفگی سے تو بچ جاتا۔ مولانا نے میرا ایڈیٹوریل ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ عنوان ہے "شیر کی گرج"۔ اور یہ ڈیلی میل (لندن) کے ایک افتتاحیہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ (شیر سے مراد شیر برطانیہ تھی)۔ خدا خیر کرے۔ چپکے چپکے دعائیں مانگ رہا ہوں ——— خیر اللہ نے خیریت رکھی اور میں ڈانٹ پھٹکار سے بچ گیا۔

زندگی میں سب سے زیادہ عقیدت اور عقلی محبت ان دو آدمیوں سے ہوئی۔ ایک حضرت

علامۂ تھانوی اور دوسرے مولانا محمد علی۔ اور یہ بات گو عجب معلوم ہو لیکن ہے واقعہ کہ ڈر بھی سب سے زیادہ ان ہی دونوں کا غالب رہا۔ سچ یا صدق کبھی ان صاحبوں کے نام (اور محمد علی کے توبار بار کے تقاضے کے باوجود) جاری نہیں کیا۔ اور نہ کبھی اپنی کوئی اور تحریر ان صاحبوں کی خدمت میں از خود پیش کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ وہ خود سے پڑھ لیں، یا کوئی خاص ضرورت ہی ان کے سامنے پیش کر دینے کی ہوئی۔ تو اور بات ہے ورنہ خود سے ان کے سامنے لانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ——— محبت کی دنیا کے بھی عجائب کاروبار ہیں!

لرز رہا ہوں میں جس سے اسی پہ ناز بھی ہے!

یہ ۵، ۶ دن کی مدت کہنا چاہیے کہ مولانا کی ہمہ وقتی رفاقت میں گزری۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے "تابع مہمل" کی حیثیت سے ساتھ ساتھ رہا۔ بحری سیاحت کی مشہور عالم کمپنی "ٹامس کُک" کا دہلی والا آفس پہلی بار دیکھا۔ اور وہاں جا کر آنکھیں کھل گئیں۔ چیف کمشنر وغیرہ کے دفتروں میں بھی پاسپورٹ کے سلسلہ میں دو ایک بار جانا ہوا۔ اور نماز جمعہ کے لیے تو جامع مسجد کی حاضری مولانا کے مستقل پروگرام میں داخل تھی ——— مہمان بھرے ہوئے ہیں، سب کو جامع مسجد تک لے جانے کے لیے کئی کئی تانگے آ رہے ہیں۔ پھر وہاں پہنچ کر مولانا کا ایک ایک مسلمان سے ملنا، سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے محتاجوں اور گداگروں کو ریزگاری اور پیسوں سے نوازنا، یہ سب ان کے معمولات کا جزو تھا۔

۲۵ مئی کا دن گزار کر شب کی ٹرین سے مولانا ممبئی روانہ ہوئے۔ سیدھے نہیں، بلکہ بی، بی، سی، آئی ریلوے سے اجمیر، آبو، احمد آباد ہوتے ہوئے۔ حضرات صوفیہ سے عموماً اور خواجۂ اجمیری سے خاص تعلق قلب رکھتے تھے۔ البتہ اس عقیدت کو درگاہوں کی مروجہ بدعات اور خرافات سے

کوئی تعلق نہ تھا۔ رشک کے ساتھ خواجہ اجمیری کے جذبۂ تبلیغ اسلام کا ذکر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان مزارات پر جا کر میں مراقبہ ان بزرگوں کی خدمات دینی اور جوشِ ایمانی ہی کا کرتا رہتا ہوں۔ اجمیر میں حسبِ معمول ساتھ آیا۔ دہرہ میں ساتھ چھٹنے کے نواب نصیر حسن خان خیال کا ہو گیا۔ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوتے وقت مہرجان کو حسبِ ذیل تار روانہ کیا:

"اللہ آپ کی اور ظفر الملک کو اپنے فضل میں رکھے۔ یہ دعا جہاز پر سوار ہوتے وقت کر رہا ہوں۔"

اور پھر مہرجان کو جہاز (مقدونیہ نامے) سے ذیل کا مفصل مکتوب روانہ فرمایا ——

خط لکھتے کم تھے، مگر جب لکھنے کا موقع پاتے، تو بس لکھتے ہی چلے جاتے۔

باب (۷۳)

۱۹۲۸ء (۵)

(مکتوب مسافر یورپ)

۱؍جون ۲۸ء۔ جہاز "مقدونیہ"

پیارے ماجد میاں و ظفر الملک صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ ۲۵؍ کو آپ سب لوگوں سے رخصت ہو کر ۲۶؍ مئی کی صبح کو اجمیر شریف پہنچا۔ تاکہ جسمانی علاج سے پیشتر کچھ روحانی علاج بھی کر سکوں۔ نہ معلوم ظفر الملک صاحب کی "وہابیت"[1] زیارت قبور کو کہاں تک روحانی علاج سمجھے اور کہاں تک خود اسے مرض تصور کرے۔ حقیقتاً جو کچھ ان مزارات کے گرد و پیش دیکھنے میں آتا ہے وہ مجھ جیسے "بدعتی" کو اس قدر صدمہ پہنچاتا ہے کہ غرض نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان عام بدعات میں جو وہاں کی جاتی ہیں اور نہایت بدتمیزی سے کی جاتی ہیں۔ میں جب کبھی اجمیر شریف آتا ہوں اور میری نظر اس مزار شریف پر پڑتی ہے تو میرا خیال اس زمانہ کی طرف جاتا ہے جب سارے ہندوستان میں مشکل ہی سے کوئی مسلمان نظر آتا ہوگا۔ مشکل ہی سے کسی جگہ کوئی شخص ایک اللہ وحدہٗ خدا کو سجدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہوگا۔ اور اذان کی آواز تو یقیناً کہیں بھی نہ آتی ہوگی اور پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ ایک ایسے زمانہ میں ایک سنجر کا رہنے والا سرکار مدینہ کے حکم سے

---

[1] حاجی ظفر الملک علوی کاکوروی (ایڈیٹر ماہنامہ "الناظر") تھے تو حنفی ہی لیکن اپنے تشدد و تقشف کے لیے بدنام تھے۔

غریب نوازی کو اپنا شعار بنا کر سلطان الہند بننے کے لیے ایک ایسے ملک میں آتا ہے، اور کسی گوشہ کو اپنے لیے تلاش نہیں کرتا، بلکہ راجپوتانہ کے وسط میں ہندوستان کے سب سے بڑے راجہ کی راجدھانی میں داخل ہوتا ہے اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اپنی پاک و صاف زندگی کے ذریعے اسلام کا اعلان کرتا ہے اور جس وقت ساری جنگی اور مادی قوتیں اسلام کے خلاف ہوتی ہیں اعلائے کلمۃ الحق کرتا ہے اور ہزاروں لاکھوں کو مشرف باسلام کرتا ہے۔ آج کل جب کہ ہزاروں لاکھوں نام کے مسلمان ہر وقت غیر مسلم اکثریت کا رونا رویا کرتے ہیں۔ اس مزار پر جاکر اگر ہم اسی سبق کا آموختہ پھیریں کہ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ تو مجھے یقین ہے کہ ہم پر بھی آج سکینہ نازل ہونے لگے اور ہماری مدد کے لیے جنود لم تروھا اتریں۔

جاتے ہی درگاہ شریف پر حاضر ہوا۔ پھر مولانا معین الدین صاحب کے بھائی حکیم نظام الدین صاحب کے ہاں جاکر فروکش ہوا۔ اپنے آکسفورڈ کے رفیق صاحبزادہ عبد الواحد خاں سے جاکر ملا۔ اور شب کو پھر درگاہ شریف جانے کے بعد رخصت ہوا

میرے جن نے اگر مفرمانے[1] مجھے علاج کے لیے اس بار ولایت بھیجا ہے۔ ان سے دوسرے دن آبو جاکر ملا۔ ۲۸ کو ان سے بھی رخصت ہوا اور اس بار بھی انھوں نے شکریہ کے الفاظ کو زبان پر آنے سے روک دیا۔ اس لیے اس صحبت کو دعا پر ختم کیا اور بادیدۂ تر روانہ ہوا۔ ۲۸ کی شب کو احمدآباد پہنچا۔ انسویا بہن اپنے بھائی امبالال سارا بھائی اور ان کے بال بچوں کے ہمراہ ولایت گئی ہوئی ہیں۔ اور شنکر لال بینکر[2] علیل تھے لیکن انھوں نے انسویا بہن کی موٹر روانہ کر دی تھی

---

[1] یعنی وہی مہاراجہ الور [2] یہ سب اس زمانہ کی مشہور کانگرسی شخصیت تھیں۔ اور جمنالال بجاج تو مدتوں کانگرس کے خزانچی رہے۔ آگے چل کر لفظ بائے گا۔ اس سے مراد گاندھی جی کی اہلیہ ہیں۔

اور آشرم سے ایک مدراسی نوجوان مجھے لینے آگئے تھے۔ اسی وقت سابرمتی گیا اور غسل کرکے سونے
لیٹا مگر مگن لال بھائی کی جوان موت اور ان کی پیاری بچی رادھا کے رنج وغم نے نیند کو بھگا دیا۔
تاہم صبح کو خاصی نیند آگئی۔ نماز فجر کے بعد پہلے رادھا اور اس کی والدہ کے پاس گیا۔ پھر باپو اور
نہانا جی سے ملا۔ اپنے ولایت جانے کا سارا قصہ سنایا اور ان کو اپنا ہم خیال پایا۔ دوپہر کو جمنالال جی
بزاز کی فرودگاہ پر آرام کیا اور شام کو کھانا کھاکر شنکرلال بنکر کے ساتھ ان کی اور انسوئیا بہن کی
قیام گاہ پر گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر اسٹیشن کو روانہ ہوا۔ تاکہ گجرات میل ہی میں روانہ ہو جاؤں اور نماز
عید الاضحیٰ سے پہلے ہی بمبئی پہنچ جاؤں۔ بمبئی میں عیدین کی نمازیں سورج نکلتے ہی ہو جایا کرتی ہیں
اس لیے ریل ہی میں غسل کرکے اور کپڑے بدل کر اور سامان اسٹیشن ہی پر چھوڑ کر شوکت صاحب
اور مولانا عرفان وغیرہ کے ساتھ ہی دفتر خلافت کے پاس والی چھوٹی مسجد کا رخ کیا۔ جہاں نماز
اچھی طرح مل گئی۔ مگر اس قدر مختصر جماعت میں یقیناً وہ غرض پوری نہیں ہوئی جو مساجد جامع میں
بھی بمشکل پوری ہوتی ہے اور جس کو پورا کرنے کے لیے شہر کے باہر عیدگاہ بنائی جاتی ہے۔ اس عید
کی نمازمیں اصفہانی صاحب نے المکبر الصوت لگانے سے احتراز کیا اور میرے نزدیک سخت
غلطی کی اور کٹھ ملاؤں سے ڈر گئے۔ میں ان کا استفتا ہی پڑھ کر بھانپ گیا تھا کہ ان بزرگ پر
ملاؤں کا خوف غالب ہے۔ جو جماعت گراموفون کو باجا کہتی ہے اور اس میں قرآن کریم کی قرات
سننے کو لہو ولعب سمجھتی ہے، اس سے لاؤڈ اسپیکر کے لیے فتویٰ طلب کرنا ہی حماقت ہے۔ عید کا
دن اور دوسرا دن حاجی اسمٰعیل صاحب خلافت کے سچے اور پکے دوست کے ہاں دعوتوں
میں گذرا۔ یا مسز نائیڈو کے ہاں کی دعوت میں۔ یکم جون کو کچھ کھدر اور اون کی جرابیں کراک صاحب
کے کارخانے میں جاکر بنوائیں۔ ٹکٹ ۳۱ مئی ہی کو لے لیا تھا۔ ۲ کو سب سامان بٹورا۔ اور
باندھا اور کمپنی کے سپرد کیا۔ اور پھر کچھ آم لے کر اور کچھ ہار پھول بٹور کر بندرگاہ پر گیا۔ کمپنی کی

نوازش سے چھ ٹکٹ جہاز پر جاکر رخصت کرنے کے لیے دوستوں کے واسطے مفت مل گئے تھے۔ حالانکہ فی ٹکٹ تین روپیہ قیمت دینا پڑتی ہے۔ بندر پر ڈاکٹر کو نبض دکھائی۔ انھوں نے پوچھا اچھے ہو۔ میں نے کہا اچھا ہوتا تو ولایت ہی کیوں جاتا، باردولی نہ گیا ہوتا۔[1] مگر ان کا اطمینان کر دیا کہ میرا مرض متعدی نہیں ہے اور اب تو میری سیاست بھی متعدی نہیں ہے۔ نہ بظاہر میرا مذہب بھی متعدی۔ ایک پولیس کے انگریز افسر صاحب نے طارق[2] تک سے ٹکٹ مانگا۔ اور شوکت صاحب غصہ کے مارے اسی وقت اپنے ٹکٹ کو پھینک کر واپس جا رہے تھے، مگر ڈاکٹر نے طارق صاحب کو بھی اسی ٹکٹ میں شامل ہونے اور جہاز پر جانے کی اجازت دیدی۔ روانگی کا وقت سنا ہے کہ ایک بجے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے سب رخصت کرنے والے رخصت کر دیے گئے۔ مگر ڈاک ڈیڑھ بجے تک بارکی جاتی رہی اور ڈیڑھ بجے ہم ہندوستان کے ساحل سے رخصت ہوئے۔

کیا کہوں کن افکار اور کن خیالات کا اس وقت دل اور دماغ میں ہجوم تھا۔ پہلا سفر ۱۸۹۸ء کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک اکسفرڈ جانے کا انتظام ہوا تھا۔ پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔ دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا۔ جب کہ سول سروس میں ناکام ہو چکا تھا۔ شوکت صاحب ابھی ناکامی کی خبر "پائنیر" میں پڑھ کر رو پڑے تھے۔ مگر ایک بڑھیا[3] نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا اور پوچھا تھا کہ کیا محمد علی کی امتحان میں ناکامی ہی پر اسقدر

---

[1] باردولی گجرات کا وہ مقام ہے، جہاں اس وقت ستیاگرہ اور ترک موالات کی عملی تحریک زور شور سے جاری تھی۔ اور سارے ہندوستان کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں [2] زاہد علی خان کا بچہ، مولانا کا نواسہ اور مولانا شوکت علی کا پوتا [3] مولانا کی والدہ ماجدہ مراد ہیں، جو ۱۹۰۲ء میں "بڑھیا" کہی جانے کے قابل ہرگز نہیں تھیں۔

مایوس ہوتے ہو۔ اگر اس نے چوری کی ہوتی یا مرتد ہو گیا ہوتا تب تمھاری کیا حالت ہوتی۔ محمد علی کو
لکھو کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اس کی منگیتر بھی ساڑھے تین برس سے بیٹھی ہے۔ اب اسے
بلالو اور اس کی شادی کر دو۔ میں بلایا گیا تھا۔ شادی بھی ہوئی تھی۔ رام پور میں محکمۂ تعلیم کا افسر بھی
مقرر ہو چکا تھا اور اب صرف آکسفرڈ بی اے کا امتحان دینے جا رہا تھا۔ رام پور میں جو واقعات
گزر چکے تھے، وہ بے حد پریشان کن۔ اور بالآخر میرے استعفیٰ کا پیش خیمہ تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا،
کہ کیا حشر ہوگا۔ جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ تیسرا سفر سید وزیر حسن صاحب کی معیت میں
سنہ ۱۹۱۲ء میں چھپ چھپا کر ہوا تھا[۱] کہ کہیں میرے کرم فرما سٹن صاحب[۲] جن سے دو ہفتے پیشتر
ہم سدھار رہے تھے، سنتے ہی میری گرفتاری کا وارنٹ نہ نکال دیں۔ "ایم علی" اور "ڈبلیو حسن"
کے نام سے دہلی سے ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ سورج نکلنے کے پیشتر شوکت صاحب کے ساتھ
دہلی کے اسٹیشن سے عید الفطر کے دوسرے ہی دن اس طرح روانہ ہوا تھا کہ گویا شوکت صاحب
کو صرف پہنچانے آیا ہوں۔ گھر میں نہ بچیوں کو خبر تھی نہ نوکروں کو اور سامان بھی یہ کہہ کر بندھوایا
تھا کہ شملے جا رہا ہوں، وہاں سردی پڑتی ہے گرم کپڑے زیادہ رکھنا۔ کان پور کی مسجد شہید
ہو چکی تھی۔ سو سے زیادہ مسلمان جن میں بچے بھی تھے اور بڈھے بھی اس وقت قید تھے۔ ایڈریانوپل
کے فاتح ترکوں سے السکوئتھ صاحب اور سر ایڈورڈ گرے سختی کے ساتھ مطالبہ فرما رہے تھے
"کامریڈ" کے ایڈیٹر نے پریس ایکٹ کے خلاف ایک بے نظیر فیصلہ سر لارنس جنکنس کلکتہ ہائی کورٹ
کے چیف جسٹس اور دوسرے سینیر ججوں کا حاصل کر لیا تھا۔ گو "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" والا
پمفلٹ جس میں بلقانی حلیفوں کے مظالم کی داستان غم نصاریٰ ہی کو سنائی گئی تھی، پھر بھی واپس

[۱] کان پور کے انہدام مسجد کے سلسلہ میں۔ سید وزیر حسن اسوقت آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے

[۲] یعنی سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ۔

نہ مل سکا تھا۔ انگلستان کی لبرل حکومت کے پاس جاکر منت سماجت کرنا تھی۔ اس کا بھی جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔

چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت کی قوت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے اور ترکوں کو اس غلامی سے محفوظ و مصئون رکھا جائے جس میں ہم خود ڈیڑھ پونے دو برس سے گرفتار تھے۔ اور اس قبضہ کو قسطنطنیہ پر سے اٹھوا دیا جائے جو تقریباً ۴۰ برس سے مصر پر چلا آرہا تھا۔ گذشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا مگر۔ ع "رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں"۔ کے خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا، آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔

اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے، مگر الحمدللہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی۔ سرڈینیس برے فارن سکریٹری صاحب کو پاسپورٹ کے لیے شملہ ٹیلیفون کیا تو ان کے سوال کا جواب میں صاف کہہ دیا کہ اب نہ مجھے برطانیہ کی کسی سیاسی جماعت پر اعتماد ہے نہ یورپ کی کسی حکومت پر کہ کسی سیاسی کام کی غرض سے یورپ کو جاؤں اور آج مسٹر واٹسن پولیٹیکل سکریٹری صاحب سے جہاز پر ملاقات ہوئی تو انکی غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ میں ٹیلر کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان جارہا ہوں بلکہ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے ایک متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بہ صرف کثیر اس لیے سفر کررہا ہے کہ وہاں جاکر فاقہ کرکے اپنا علاج کرائے۔

ہندوستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں۔ مگر سوائے

مسز بسینٹ کے اخبار نیو انڈیا[1] کے اڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آڑا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف یں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں۔ ۲ر جون کا دن اچھا گذرا مگر ۳، ۴ اور ۵ کو ہوا تیز رہی اور تیز تر ہوتی گئی۔ یہ موسمی ہوا ہے جس کا نام بگاڑ کر "مون سون" کر لیا گیا ہے اور جو ہندوستان کے لیے بارش لا رہی ہے۔ دہلی کی گرمی کا خیال کر کے دعا نکلتی ہے کہ یہ جلد بمبئی پہنچے اور سب طرف یہ جل تھل کردے۔ لیکن جہاز والوں کا خیال کرتا ہوں اور بالخصوص عورتوں کا تو جی یہ چاہتا ہے کہ دعا کروں کہ بند ہو جائے اور سمندر کی یہ طغیانی باقی نہ رہے۔ تاہم خلاف توقع میں بالکل اچھا رہا۔ اور ایک وقت کا کھانا بھی نہ چھوڑنا پڑا۔ حالانکہ آدھے سے زیادہ مسافر اور تین چوتھائی سے زیادہ عورتیں کھانے کے کمرہ سے غیر حاضر رہنے لگی تھیں۔ البتہ آج صبح کے بعد سے تموج میں بہت کمی ہو گئی اور آج شب کے ساڑھے گیارہ بجے سے جب یہ خط شروع کیا گیا ہے جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ حالانکہ کل شب کو ان میں سے اکثر خاموش پڑے تھے اور ناچ ہو رہا تھا تو سمندر کی موجوں کا ہو رہا تھا۔
علاوہ مہاراجہ صاحب الور کے وزیر تعلیم کے جو میرے ہم سفر ہیں اور چند ہندوستانیوں کے میری کسی سے گفتگو نہیں ہوئی، اور اس فرصت کو غنیمت جان کر میں نے یا تو اپنی نیند کا قرضہ جو مدتوں سے چڑھا ہوا تھا وصول کیا یا کچھ فرانسیسی زبان سیکھنے کی کوشش کی۔ مرحوم علی گڈھ کالج کے مرحوم سابق طالب علم محمد داؤد صاحب کی نظموں کو ان کے چھوٹے بھائی محمود احمد عباسی پھر شائع کر رہے ہیں۔ اور مجھ سے تقریظ لکھنے کا وعدہ لے چکے ہیں۔ ان کا خط جہاز پر بھی ملا۔ اس لیے خطوں سے بھی پہلے اسے لکھنا شروع کیا اور الحمد للہ آج ختم کر دیا۔ شوکت صاحب سے بھی پہلے آپ کے نام یہ خط شروع ہو گیا۔ اور اب اگر آپ اجازت دیں تو اسے ختم کر دوں۔

[1] اپنے زمانہ کا مشہور انگریزی روزنامہ۔ مدراس سے مسز اینی بسنٹ کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

ڈیک پر میرے نزدیک ہی تین انگریزوں کے بچے دو لڑکیاں اور لڑکا کھیلا کرتے ہیں۔ ان سے یا ان کے والدین ہی سے کبھی کبھی دو چار باتیں ہو جایا کرتی تھیں یا بہار کے دو انگریزی زمینداروں سے جو نیل تیار کراتے ہیں۔ لیکن میرے قریب ہی ایک خوش رو وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر بھی لیٹے رہتے تھے اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بچی سے میری دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سن کر اور کچھ دلچسپ پا کر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے مگر پر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی۔ جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد و تحسین بھی دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بزرگ میرے دادا کے ۵۸-۱۸۵۷ء کے دوست تھے۔ اب تک کی ساری داستان میں نے آپ کو سنا دی۔ اب نہ کہیے کہ میں نے خاموشی سے کام لیا ہے کل سے انشاء اللہ حدیث شریف بھی شروع ہو جائے گی۔ اور چونکہ حجاج کے جہازوں کی واپسی کا وقت ہے، راستہ میں آنکھیں ان کو بھی ڈھونڈینگی۔ ہائے ؎

زہے سعادت آں بندۂ کہ کرد نزول
گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول

مگر خدا بھلا کرے سلطان ابن سعود کا۔ اب وہاں کا راستہ بھی ہم بدبختوں کے لیے بند ہے۔ جہاز ہی پر یہ خبر پڑھی کہ ہم سے بھی زیادہ بدبخت شامی جنھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت میں سب سے بڑا حصہ لیا تھا اور اس کے صلہ میں فرانس کی غلامی اور ۲۰ گھنٹہ کی مسلسل گولہ باری حاصل کی تھی، انھوں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ ان کی نجات کے لیے ایک بادشاہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فیصل ابن سلطان ابن سعود پر ان کی نظر انتخاب پڑی ہے۔ سچ ہے ملوکیت کی بدعت

کی ابتدا شام ہی سے ہوئی تھی۔ اب یزید کی ملکیت کی جگہ نجدیوں کی ملکیت کی طلب ہے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تعجب ہے کہ اعصابی سوزش جہاز پر آتے ہی بند ہو گئی۔ مگر کل دوپہر کو اور آج صبح کو تھوڑی دیر تک محسوس ہوئی لیکن یقیناً یہ آموں کا پھل ہے سو بندرگاہ سعید تک وہ بھی ختم ہو جائینگے اور لندن جاتے ہی فاقہ ہی فاقہ ہے۔

قطب میاں صاحب کو اور الطاف بھائی کو۔ سعید کو اور تمام فرنگی محل کو سلام شوق۔ بالخصوص جمال میاں اور محمد میاں اور نور میاں کو۔ مولانا سلامت اللہ صاحب کی خیریت تحریر فرمائیے[1]۔ دہلی میں جعفری کو پیار اور سب کو سلام شوق۔ بالخصوص مولانا کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں آداب۔ مولانا احمد سعید صاحب کو سلام شوق اور ان کی صحت کے متعلق اطلاع دیجئے۔ ڈاکٹر سعید احمد رضا صاحب اور اسرائیلی صاحب، راشد الخیری صاحب کو بھی سلام شوق۔ اب غالباً ناچ بھی ختم ہو گیا اور میرا سر بھی گھومنے لگا اس لیے اب رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کی عالی ہمتی کا قدردان۔ ہمدرد کا دعاگو

آپ کا بھائی محمد علی

---

[1] یہ سب فرنگی محلیوں اور ان کے لواحق کے نام ہیں۔ مولوی سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی مولانا کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔

باب (۴۷)

۱۹۲۸ء (۶)

(سراپا ۔ مشاہداتِ فرنگستان)

محمد علی کے دیکھنے والے اس ڈائری کے ناظرین میں آج (نومبر ۱۹۴۹ء میں) بھی کچھ بہت زیادہ موجود نہ ہوں گے۔ اور پھر دیکھئے، کب اس مسودہ کی تکمیل ہو پاتی ہے، اور کتنی مدت اس کی صفائی میں لگتی ہے۔ اور پھر کتاب کب پریس سے باہر آتی ہے۔ اتنی منزلوں کے طے ہوتے ہوتے تو (جس میں ۴، ۵ سال کی مدت تو یقیناً لگ جائے گی) محمد علی کے دیکھنے والوں کی تعداد اور بھی کم رہ جائے گی ——— جوانی میں بڑے خوش رو، وجیہ، تندرست و توانا، کلّے ٹھلّے کے تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی سے تو بہرحال کم، لیکن پھر بھی اچھے خاصے تنومند، چہرہ ہشاش بشاش۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ آنکھیں بڑی چمکدار۔ بڑے خوش وضع و خوش لباس۔ پوشاک زیادہ تر انگریزی سوٹ۔ لیکن کبھی کبھی ٹھیٹھ ہندوستانی اور مشرقی بھی۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں کسی قدر چڑھی ہوئی۔ جنگ بلقان (۱۲ء) اور پھر انجمن خدام کعبہ (۱۳ء) کے زمانہ سے وضع و لباس سب میں تبدیلی شروع ہوئی۔ سن اس وقت ۳۴، ۳۵ کا ہوگا۔ مونچھیں کتری گئیں۔ ڈاڑھی رکھائی گئی، اور پھر بڑھائی گئی۔ لباس رفتہ رفتہ سادہ اور خالص مسلمانوں کا سا ہوگیا۔ جاڑوں میں سیاہ رنگ کی بالدار، اور گرمیوں میں سفید کھدر کی، اونچی

کشتی نما ٹوپی (جس کا نام ہی محمد علی کیپ مشہور ہو گیا) گاندھی کیپ کی دو گنی. کھدر کا سادہ جیب دار کرتا اور پاجامہ۔ اوپر سے ڈھیلی ڈھالی رنگین عبا[1]۔ بلا کے جامہ زیب تھے۔ جو بھی کپڑا پہن لیا، بس وہی پھب گیا۔ آخر میں عینک کی بھی مستقل حاجت ہو گئی تھی۔ بال بہت جلد سفید ہونے لگے، سر کے بال بڑے اور پٹوں کی شکل میں تھے۔ ذیابطیس اور فکروں سے گھل گھل کر دبلے ہو جانے کے باوجود بھی چہرہ کی وجاہت آخر دم تک قائم۔ تقویٰ و عبادت الٰہی سے چہرہ پر جو خاص قسم کی نورانیت آجاتی ہے، وہ اس کے علاوہ۔ آواز بلند جس محفل میں ہوتے، سب پر چھا جاتے۔ حد درجہ بذلہ سنج حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ۔ ہنسنے ہنسانے میں برق۔ ساتھ ہی رونے رلانے میں بھی فرد۔ ہنسی اور آنسو دونوں معلوم تھا کہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوئے ہیں —— محبت کی آنکھ اندھی ہی کیوں نہ کہی جائے، بہر حال اپنا حال تو یہ تھا کہ صورت بھی محبوبیت میں سیرت سے کچھ کم نہ تھی ؎

ترکِ من ہاں مہ غلامِ روئے تو
جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو

اور محمد علی کا کمال اگر دل میں رچا ہوا تھا تو محمد علی کا جمال بھی آنکھوں میں بسا ہوا۔ آہ! وہ گزرا ہوا زمانہ کس طرح پھیر لایا جائے، اور کس طرح آج محمد علی کو زندہ سلامت، چلتا پھرتا، ہنستا بولتا سب کو دکھا دیا جائے! آہ! وہ زمانہ جب اپنا قال نہیں حال تھا ع

[1] یہی وہ لباس تھا جس پر پنڈت مدن موہن مالوی نے دانستہ یا نادانستہ پھبتی بیگم صاحبہ بھوپال کے لباس کی کہی تھی —— ہوا یہ تھا کہ ایک دن غالباً ۱۹۲۳ء میں محمد علی بطور اخبار کے ایڈیٹر یا رپوٹر کے اسمبلی ہال گئے ہوئے تھے۔ پریس گیلری سے ابھی نکلے ہی تھے کہ پشت کی طرف سے مالوی جی آ نکلے۔ محمد علی نے جب منہ پھیرا تو مالوی جی حیرت کے ساتھ بولے "ارے آپ! میں سمجھا ہر ہائینس بیگم صاحب بھوپال برقع پہن کر اسمبلی ہال تشریف لائی ہیں!" محمد علی برجستہ بولے "جی ہاں، اس زنانی محفل میں مردوں کا کیا کام ہو سکتا تھا!"

ابنساط عید دیدن روئے تو

اور کہاں سے لے آئے جائیں وہ دن، جب یہ شاعری نہیں حقیقت بیانی تھی، ع

اے ہلالِ ماخمِ ابروے تو

یاد ہے ؟ کہ محمد علی ابھی یورپ میں زیر علاج ہیں۔ اور جلد ان سے ملاقات اور گفتگو کی کوئی صورت نہیں۔ خط جب آئے گا، آئے گا۔ جبھی تو اتنا موقع مل گیا کہ درمیان میں ذکر ان کے وضع و لباس وغیرہ کا چھڑ گیا۔ خط کے انتظار میں ہم لوگ ہفتوں صرف کرتے تھے، تو کیا ڈائری کے ناظرین چند منٹ کا بھی انتظار برداشت کرنے سے رہے ؟

دہلی تو اب ہمدرد کے نگران کی حیثیت سے اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ایک روز دہلی میں ہمدرد آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ولایتی ڈاک آئی۔ ڈیلی اکسپرس تھا یا کوئی اور لندنی روزنامہ، اس میں خبر پہ نظر پڑی کہ آج پارلیمنٹ کی گیلری میں ایک عبا پوش شخص نماز پڑھتے ہوئے دیکھا گیا — برطانیہ کے لیے خبر بالکل نئی تھی، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ جب سے پارلیمنٹ کی عمارت قائم ہے، کیوں کبھی کسی کو اس کے حدود کے اندر نماز پڑھنے کا خیال بھی آیا ہوگا! —

جعفری جو ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر تھے، (ہمدرد کے بند ہو جانے پر ان ہی نے روزنامہ ملت نکالا تھا) قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ خبر سنتے ہی بول اٹھے کہ "یہ سوا مولانا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا"۔ اور بالکل سچ کہا۔ ادھر سوا محمد علی کے اور خیال بھی کسی کا جا سکتا تھا ؟ وہی یہ کہکر گئے تھے کہ "جی میں آتا ہے کہ وہاں کے چپہ چپہ پر نماز پڑھوں، پارک کو، ریلوے پلیٹ فارم کو، ہر چیز کو مصلی بنا دوں۔ اور جس چیز سے وہاں والے بدکتے ہیں، اسی سے انھیں خوب مانوس کر دوں۔" شعر جس نے بھی کہا ہو اس شاعری کو واقعہ بنانا محمد علی ہی کا کام تھا ؎

اذان حرم میں کلیسا میں دیر میں ناقوس
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لیجیے، محمد علی کا دوسرا خط بھی موصول ہو گیا۔ اور اب شروع ستمبر ہے۔ اس کے پڑھنے کے لیے وقت نکالیے۔ خط کیوں ہے؟ یہ کہیے کہ ایک پمفلٹ کی ضخامت رکھتا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ مختصر خط لکھنے کے لیے زیادہ فرصت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ مجھے کہاں نصیب۔ بس جو کچھ بھی لکھتا ہوں بالکل قلم برداشتہ لکھتا ہوں، اس میں طوالت سے چارہ نہیں۔ بہر حال اب وہ مکتوب حاضر ہے۔

---

۹ اگست ۱۹۳۰ء۔ لندن۔

پیارے ماجد میاں، ظفر الملک صاحب اور جعفری۔

گذشتہ ہفتہ میں جو ہمدرد کے پرچے آئے، ان میں میرے کسی خط کا کوئی ذکر نہ تھا جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید وہ خط جو یورپ پہنچ کر میں نے لکھا تھا اور ۲۱ جون کو ڈوور کے اسٹیشن پر ڈالا تھا۔ وہ ۱۱، ۱۲ جولائی تک آپ حضرات کی نظر سے نہیں گذرا اور اگر ماجد علی صاحب[1] کے خط میں صاف تصریح نہ ہوتی کہ انھوں نے حیات صاحب[2] کو اس تاکید کے ساتھ روانہ کر دیا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ لینے کے بعد فوراً جعفری[3] کو بھیجدیں تو میرے دل میں ضرور یہ خوف پیدا ہو جاتا کہ بیگم صاحبہ نے حیات صاحب کو وہ خط تو بھیج دیا مگر یہ لکھنا بھول گئیں کہ پڑھنے کے بعد وہ خط جعفری صاحب کو بھیج دیا جائے تاکہ بہت سے مندرجہ حالات سے قارئین "ہمدرد" بھی واقف

---

[1] ماجد علی خاں رامپوری۔ مولانا کی تیسری صاحبزادی کے شوہر [2] حسن محمد حیات صاحب پنجابی۔ مولانا کے مخلص اور سابق پرائیویٹ سکریٹری۔ ان کا ذکر کئی بار آچکا ہے [3] محمد جعفری صاحب مچھلی شہری جامعی جو اس وقت ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر تھے۔

ہو جائیں۔ جب تفصیل کے ساتھ کسی چیز کے متعلق لکھنا پڑتا ہے تو پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس کو ہر خط میں دہرایا جائے۔ اس لیے میں نے یہ انتظام کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی کو ہر ہفتے مفصل خط لکھ دیا جائے۔ اور وہ اسے آپ حضرات تک پہنچا دیا کریں۔

۱۲ر جون کا خط اس قدر طویل تھا اور اس مصروفیت کی حالت میں لکھا گیا تھا کہ اس کے بعد کسی اور کو دو سطریں لکھنا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ بیچاری بیگم صاحبہ تک کو اس ڈاک سے علیحدہ خط نہ روانہ کیا جا سکا۔ لیکن چونکہ ان کی اور بچیوں کی پریشانی کا سب سے زیادہ خیال تھا۔ اس لیے میں نے حیات صاحب کا خط بجائے مکتوب الیہ کو بھیجنے کے بیگم صاحبہ کے پتہ سے بھیجدیا۔ چونکہ اس ہفتہ کی ڈاک کے ہمدرد میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید حیات صاحب اسے دہلی بھیجنا ہی بھول گئے۔ اور چونکہ بظاہر اس خط کا علم آپ کو نہیں اس لیے آپ غالباً انکو بھی نہیں لکھیں گے۔ کہ آپ کی یاد دہانی پر وہ اس خط کو آپ کے پاس بھیج دیں۔ اس لیے مجبوراً میں خود آپ کو لکھ رہا ہوں کہ ان سے وہ خط ضرور منگا لیں۔ وہ یکم ستمبر کو غالباً بمبئی سے نواب صاحب بھوپال کے ہمرکاب روانہ ہوں گے۔ اس لیے اس خط کے ملتے ہی ان کو لکھ دیجیے کہ وہ اپنے خط میں آپ حضرات کو بھی شریک کر لیں۔ مجھے خوف ہے کہ میں نے لندن سے جو ڈاک پہلی بار ارسال کی اس میں کوئی خط آپ حضرات کے نام نہیں ارسال کیا۔ لیکن بیگم صاحبہ اور بچیوں کو اور راجد علی صاحب کو خطوط لکھ دیے تھے۔ اور نیز شوکت صاحب کو اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ، چونکہ بیگم صاحبہ ہی کو لکھا گیا تھا۔ اس لیے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے خط کا ایک حصہ شوکت صاحب اور جعفری صاحب کو بھجوا دیں مگر وہ اس شرکت کو گوارا نہیں کرتیں اور ان کے پچھلے خط میں لکھا ہوا آیا ہے کہ آپ میرے خط میں کسی کو شریک نہ کیجیے۔ خواہ کتنا ہی مختصر ہو۔ وہ میرے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ مجھے کاتب بننے کی فرصت نہیں۔ معلوم نہیں اس کے بعد انھوں نے اس

خط کی نقل جعفری کو بھیجی یا نہیں۔ بہرحال ہمدرد میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اگر وہ بھیجی بھی گئی ہے تو غالباً جمعرات تک آپ حضرات کو مل گئی ہوگی۔ خیر اب یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مفصل خط بالعموم آپ ہی کے نام جایا کرے گا اور جو دوسرے خطوط لکھے جایا کریں گے، ان میں سب کا حوالہ دے دیا جایا کرے گا اور انھیں صرف اس قدر لکھ دیا جائے گا کہ بعد ادائے آداب کے عرض پرداز ہوں کہ یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت درگاہ خداوندی سے نیک مطلوب ہے۔ بڑوں کو سلام اور چھوٹوں کو دعا۔ تمت تمام شد۔

پہلے اپنی صحت کے متعلق عرض کر دوں کہ اس بار چھ دن کے ناقہ سے جس میں نارنگی اور انگور کا عرق پینے کی اجازت تھی، میری طبیعت بہت اچھی ہو گئی۔ اور یہی نہیں کہ شکر نہیں آئی بلکہ باوجود چربی کے تقریباً اسی مقدار میں پائے جانے کے جو گذشتہ ہفتہ میں تھی، میرے پاؤں کے تلووں میں اعصابی سوزش بالکل نہیں ہوئی۔ البتہ گذشتہ ہفتہ کے دن چند نوجوان طلبہ کے ساتھ ریجنٹس پارک میں چڑیا گھر (Zoolagical gardans) دیکھنے کے لیے جانا ہوا اور چونکہ اس دن صبح کو بہت ہی کم پھل کھائے تھے، اس لیے ان طلبہ کے ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ افسوس ہے کہ یہاں شہد نہ مل سکا اور شکر کا استعمال کرنا پڑا۔ اس دن میں نے خوب ہی بد پرہیزی کر ڈالی، اور مکھن اور روٹی اور جیم کا بھی استعمال کیا اور کیک کے بھی دو ایک ٹکڑے کھائے، یہ میری بد پرہیزی تھی۔ ورنہ نہ کبھی شکر کا استعمال کیا اور نہ کبھی جیم کا اور نہ کبھی کیک کا۔ یہاں تک کہ روٹی بھی تقریباً ڈیڑھ مہینے سے نہیں کھائی۔ گو میرے دوست احباب کو شاید اس کا یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بد پرہیزی کرنا پڑی تو میں نے عمداً پیٹ بھر کر بد پرہیزی کی تاکہ دیکھوں اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ چند ہی گھنٹوں کے بعد سزا بھی پائی۔ پورے ایک ہفتہ کے بعد تلووں میں اعصابی سوزش پھر شروع ہوئی۔ اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر کل تک رہا۔ البتہ

ایک وقت کا فاقہ کرنے کے بعد الحمد للہ وہ کیفیت بالکل دور ہو گئی اور اس شیریں تجربہ نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا کہ میرے معالج غذا کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس ہفتے سوائے اس بدپرہیزی کے میں نے ان کے کہنے پر اسی قدر اور بھی عمل کیا کہ گوشت مطلق نہیں کھایا بلکہ سوائے تھوڑی سی ابلی ہوئی مٹر کے اور کوئی پکی ہوئی ترکاری نہیں کھائی اور صرف پھلوں پر گذر کیا۔ مگر پھلوں میں علاوہ نارنگیوں کے اور ناشپاتیوں کے اور خوبانیوں وغیرہ کے کچھ گریاں بھی کھائی گئیں (بادام اخروٹ وغیرہ) اور لطف یہ ہے کہ کھجوریں بھی روزانہ ۲۰۔۲۵ کھائی گئیں۔ اس لیے اس پرہیز میں شکایت کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ ارادہ ہے کہ کل پھر قارورہ کیمیاوی تجربہ کے لیے بھیجوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ فاقہ نہ کرنے کے بعد بھی شکر مفقود رہتی ہے یا نہیں۔ ورزش کے معاملہ میں البتہ بہت کچھ فروگذاشت ہوئی ہے۔ لیکن آج سے ارادہ کر لیا ہے کہ دن میں کم سے کم دو تین بار ورزش ضرور کر لیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ صحیح غذا سے زیادہ صحیح ہوا کی ضرورت ہے اور جب تک اندر کی ہوا پوری طرح باہر نہ نکالی جائے گی جسم کا اندرونی حصہ صاف نہ ہوگا۔ اور تمام ورزشیں اسی غرض سے کرائی جاتی ہیں کہ میں صحیح طریقہ سے سانس لے سکوں۔ چربی پوری طرح سانس لینے میں مانع نہ ہوتی رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میری سانس لمبی ہو گی تو غذا بھی زیادہ ہضم کی جا سکے گی۔ اور تھوڑی بہت بدپرہیزی سے بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ بہر حال یقیناً اس ڈیڑھ مہینے کے علاج میں اتنا فاقہ ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور میں شوکت صاحب کو لکھنے والا ہوں کہ وہ بھی اب پھلوں پر گذارہ کیا کریں اور جس طرح سے میں زمین پر لوٹ لوٹ کر اور دوسری ورزشوں میں لمبی لمبی سانس لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے کمر چار انچ کم ہو گئی ہے اور سانس ایک سو ستر سے ترقی کر کے دو سو تک پہنچ گئی ہے، ان کا

وزن تو یقیناً ۲۰-۲۵ سیر گھٹ جائے گا، بلکہ اس سے بھی زائد اور تھوڑے ہی عرصہ میں مصرعہ "کمر تپلی صراحی دار گردن" کے مصداق ہو جائیں گے۔ بیگم صاحبہ بیچاری مدت سے دبلا ہونا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے بھی یہی علاج مفید ہو گا۔ اور چونکہ وہ نقرس کے مرض میں مبتلا بھی ہیں اس لیے یہ طریق علاج اس مرض کے لیے بھی مفید ثابت ہو گا۔ میں بار بار زور دے رہا ہوں کہ لڑکیوں کو لے کر وہ بھی یہیں چلی آئیں۔ اور ابھی اس مضمون کا انھیں تار بھی دے چکا ہوں۔ حمیدہ بی کی بیماری نے بے حد پریشان کر دیا ہے۔ اگر وہ یہاں آ گئیں تو حمیدہ بی کا بھی اسی طریقہ پر یہاں علاج شروع کرا دیا جائے گا۔ لیکن دیکھیے وہ آتی بھی ہیں یا نہیں؟ جہاں اسقدر اپنی صحت یابی کے متعلق لکھ چکا ہوں وہاں چند سطریں ایک بزرگ قوم کی وفات کے متعلق لکھنا بھی نامناسب نہ ہو گا۔ جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ دو دن اور فاقہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ میں امام سے وعدہ کر چکا تھا کہ ناٹینگیل گیٹ کے دار الصلوٰۃ میں نماز کے بعد مصلیوں سے اسلام کے متعلق ایک مختصر سے مکالمے کی بھی ابتدا کروں اور خوف تھا کہ اگر اس دن افطار نہیں کیا گیا تو شاید کمزوری زیادہ محسوس ہو لیکن جو حالت جمعرات کو تھی۔ اگر اس کا پہلے ذرا بھی گمان ہوتا تو میں ہرگز جمعہ کو نہ افطار کرتا۔ اور دو چار دن اور فاقہ کرتا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا، اسی وقت سید امیر علی[1] صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ لندن سے کچھ دور سسکس کاونٹی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں اس زمانہ میں آرام فرما رہے تھے۔ اور مسز امیر علی صاحبہ کے

[1] رائٹ آنریبل سید امیر علی پہلے جج ہائی کورٹ کلکتہ اور بعد کو پریوی کونسل۔ مصنف "اسپرٹ آف اسلام" وغیرہ جن کی ایک عمر انگریزی میں خدمت اسلام کرنے میں صرف ہوئی۔ انگریزی اہل زبان کی سی لکھتے تھے۔ اور بجز مذہب کے اور ہر حیثیت سے انگریز ہو بھی گئے تھے۔

قول کے مطابق وہ آخر تک کام کرتے رہے۔ گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے۔ تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعئ اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے، اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جس دن امیر علی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے۔ اس لیے گزشتہ پیر کے دن بینکوں کی چھٹی تھی۔ چنانچہ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک نہ ہو سکا۔ تجہیز و تکفین کے پیشے کی یہاں ایک کمپنی ہے۔ چنانچہ اس نے مرحوم کی میت کو رو ڈ ج سے ویسٹ منسٹر تک پہنچایا ہوگا۔ اور منگل کے دن تعطیل ختم ہونے پر تابوت بنانے کا انتظام کیا۔ اس کمپنی کی ایک اسپشل ٹرین واٹرلو اسٹیشن سے منگل کے دن بارہ بجے کے قریب بروک ووڈ (Brook Wood) کو جو ووکنگ (Wooking) اور ایلڈر شاٹ (Alder shot) کے درمیان واقع ہے، روانہ ہوئی اور اس میں جنازہ اور اس کو کاندھا دینے والے روانہ ہوئے۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ میں چند طالب علموں کے ساتھ موٹر میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے اس کا پہلے علم نہ تھا کہ لوگ اسپشل میں قبرستان جانے والے ہیں۔ اتوار کی شب کو سر محمد رفیق صاحب[1] سے ملا۔ تب اس کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اس سے پہلے ہی موٹر کا انتظام کر چکا تھا۔ احتیاطاً ہم لوگ اسپشل سے بھی پہلے موٹر میں لندن سے روانہ ہوئے۔ لیکن بد قسمتی سے ادھ بیچ میں موٹر رک گئی۔ اور اس کے صاف کرنے میں موٹر کے مالک کو کچھ غلط فہمی ہوئی جس کے باعث گھنٹہ بھر راستہ میں رکنا پڑا۔ بالآخر گذرتی ہوئی ایک موٹر کے چلانے والے سے درخواست کی گئی کہ

[1] محمد رفیق صاحب دہلوی، بیرسٹر ایٹ لا۔ مدتوں اودھ میں جج رہے، اور پھر الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے، اس وقت انڈیا کونسل کے ممبر کی حیثیت سے لندن میں رہ رہے تھے۔

آٹو موبائل ایسوسی ایشن کے سپاہی کو آگے چل کر بھجوادیں۔ یہ مالکانِ موٹر کی ایک جمعیت ہے
جس کا چندہ دو پونڈ سالانہ ہے اور اس کی طرف سے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر عمدہ وردی پہنے
ہوئے سپاہی بٹھلا دیے گئے ہیں، جو موٹر والوں کو راستہ بھی بتاتے ہیں اور اگر کوئی حادثہ واقع
ہو جاتا ہے تو موٹر والوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ ان کے پاس موٹر بائسکلیں بھی ہیں، جن میں سائڈکار
کی جگہ ایک چلتی پھرتی موٹر والوں کی ڈسپنسری ہے۔ اس سپاہی کے آتے ہی سب کچھ ٹھیک
ہو گیا، اور بیس منٹ میں ہم بروک ووڈ (Brook Wood) کے
قبرستان جا پہنچے۔ ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا چکے تھے۔ البتہ ان کے صاحبزادے
وارث امیر علی صاحب معہ اپنی والدہ ماجدہ کے اس وقت تک وہاں موجود تھے۔ چنانچہ قبر
پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور تعزیت کی۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں
ہیں اور اس شہر خموشاں کا نام بھی (Necropolis) ہے۔ ریل کی پٹری اس کے
اندر تک آتی ہے۔ نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا ہے جس کے چاروں طرف پختہ
احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں، روشیں چلنے پھرنے والوں کے لیے بنادی گئی ہیں۔
بلکہ گھر آنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہم کو لنچ نہ ملنے کے باعث جو چاء کے وقت ووکنگ جا کر
انڈے وغیرہ تلوانا پڑے تھے، اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس شہر خموشاں کے اندر ایک اچھی خاصی
رسٹوران بھی موجود تھی، جہاں لنچ کھایا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں
کے لیے ہی ہے۔ اور ایک حصہ پارسیوں کی قبروں کے لیے اور اسی طرح ایک حصہ ہندوؤں
کی قبروں کے لیے ہے۔ مگر سید امیر علی صاحب نے حین حیات ہی ایک قطعہ اپنے اور اپنے
خاندان والوں کے لیے اس طرف خرید لیا تھا۔ جہاں متمول عیسائی دفن ہوتے ہیں۔ یوں تو
تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کر لیا ہے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر

غلط تھا۔ لیکن الحمد للہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ دفن کرتے وقت قطب نما تلاش کی گئی، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ قبر کی سمت میں صرف تھوڑی سی کجی تھی، زیادہ نہ تھی اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے۔ جن میں ایک لارڈ ہیڈلے[1] اور پنجاب کے سابق لفٹنٹ گورنر سر لوئی ڈین تھے۔ لارڈ ہیڈلے کے پاس ہی ایک اور بزرگ بھی تھے، جن کا اسم گرامی انگلستان کے اخبارات اور رسالوں میں یا تو جنگ افغانستان کے بعد یکایک نظر آنا شروع ہوا تھا، یا اب پھر دو سال سے مکہ معظمہ کی موتمر عالم اسلام کے بعد سے زیادہ تر اسی سلسلے میں پھر نظر آنے لگا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ یہ "سردار" اقبال علی شاہ صاحب تھے۔ چونکہ اس سے ایک ہی روز پیشتر مجھ سے ان بزرگ سے ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی جس کے متعلق ابھی کچھ عرض کروں گا۔ اور مجھ سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے اس بار علیک سلیک کی بھی نوبت نہ آئی۔ سر لوئی ڈین صاحب[2] نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہکر میرا حال دریافت فرمایا اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمد للہ کہہ کر اور ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا۔ مجھے امیر علی صاحب کی قبر کا اور مسلمانوں کی قبروں کا اتنے فاصلہ پر ہونا اور متمول انگریزوں کی قبروں سے اس قدر متصل ہونا کچھ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے، ان سب کو میں نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون ضیفہ احمد فارسی کی ہے۔ جس وقت یہ بیچاری دفن ہوئی تھیں اس وقت شاید کسی کے پاس قطب نما بھی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ قبر کی سمت صحیح نہیں ہے

[1] برطانیہ کا وہ امیر جو اس وقت تک باضابطہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اسلامی نام "فاروق" تھا۔

[2] سابق گورنر پنجاب۔ اردو و فارسی سے بھی واقف تھے۔

اس کے پاس ہی بمبئی کے مشہور و معروف اور نہایت قابل مسلمان ڈاکٹر حبیب جان محمد صاحب کی قبر ہے، جن کا یکایک ذیابیطس کے عارضہ میں نیشنل لبرل کلب میں انتقال ہو گیا تھا۔ اسی قبرستان میں حیدر آباد کے خطیب امجد حسین کھوکھر ضلع جہلم کے شیخ عبد الحمید اور راندھیر کے داؤد ابراہیم مونا لاکی بھی قبریں ہیں۔ جن میں سے موخر الذکر کا موٹر کے تصادم سے اسی سال انتقال ہوا ہے۔ اور ان کے ایک رفیق جو اسی تصادم میں زخمی ہوئے تھے، اس بار ہمارے شریک سفر تھے۔ ان ہی قبروں میں ایک قبر مصطفٰے صبحی منزدی کی ہے، جو مصری تھے۔ اس کے نزدیک قبر آغا خاں صاحب کے چچازاد بھائی اور حاجی بی بی صاحبہ کے بھائی آغا شمس الدین شاہ کی بھی ہے۔ اس قبر پر غالباً آغا خاں کی طرف سے یہ عبارت کندہ کی گئی ہے

برادرِ عزیزم

ز رفتنِ تو من از عمر بے نصیب شدم

سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

آغا خاں صاحب کو کون غریب کہے گا لیکن ان کی "غریب الوطنی" اب ایک ضرب المثل ہے۔ نہ معلوم اس شعر میں کس وطن کی غربت کی طرف اشارہ ہے۔ ان بڑی بڑی پختہ قبروں کے علاوہ کتنی ہی کچی قبریں بھی ہیں۔ اور چند پر بظاہر حکومت کی طرف سے دورانِ جنگ میں لوحِ مزار بھی لگا دی ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل فوجی یہاں دفن ہیں۔ ....

میں ان سب کے لیے فاتحہ پڑھ کے آیا ہوں، اور ان کے نام اس لیے لکھ لایا ہوں کہ اگر "ہمدرد" کے ذریعہ سے ان کے دور افتادہ پسماندوں کو جن میں سے شاید ہی کوئی ادھر آ سکے اطلاع مل جائے کہ ایک مسلمان ان کی قبروں پہ فاتحہ پڑھ آیا ہے، تو غالباً انھیں خوشی ہوگی۔[1]

---

[1] اتنی محنت و زحمت جس نے محض قلوب مسلمین کی تطییب کے لیے برداشت کیا، اس کے اجر کا کیا ٹھکانا! ——— عدم گنجائش سے سارے نام جو تھے یہاں حذف کر دیے گئے۔

ان مسلمانوں کی قبروں میں ایک عجیب قبر بھی نظر پڑی۔ وہ ایک ہندو سپاہی کی تھی جس پر اناللہ وانا الیہ راجعون کی جگہ .... کھدا ہوا تھا۔ نہ معلوم یہ اوم بھگوتی نام تو نہیں اور اوم کی جگہ غلطی سے فقط .... کھد گیا۔

مجھے اس وقت اس کی اطلاع نہ تھی کہ یہاں ہنود کا بھی کوئی قبرستان ہے۔ اور قیاس بھی اس کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ ہنود کے مردے تو جلا دیے جاتے ہیں۔ اس لیے صرف ایک ہندو کی قبر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس کا نام موتی رام ۱۱۲۔ انفنٹری .... کھدا ہوا تھا جب ہم وہاں سے چل دیے تو معلوم ہوا کہ ایک حصہ ہنود کی قبروں کے لیے بھی ہے۔ اور وہاں ہنود کی قبریں بھی موجود ہیں۔

مسلمانوں سے کچھ ہی فاصلہ پہ پارسیوں کی متعدد قبریں ہیں۔ اور یہ حصہ بہت ہی زیادہ شاندار ہے۔ سب سے زیادہ عظیم الشان قبر نوروز واڈیا صاحب کی ہے۔ جس کے متعلق ابھی عرض کروں گا۔ اس کے علاوہ ایک مسقف حجرہ کے اندر سر رتن ٹاٹا کی قبر ہے اور دوسرے میں ان کے والد ماجد جمشید جی نوشیروان جی ٹاٹا کی قبر ہے۔ اس کے سامنے جمشید جی کی ہمشیرہ مسز دارابجی سکلا نوالہ کی قبر ہے جس پر ان کا مجسمہ (صرف سر اور گردن وغیرہ) پتھر کا کھدا ہوا الٹا دیا گیا ہے۔ دارابجی صاحب کی بھی وہیں قبر ہے۔ غالباً یہ شاپور جی کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کی قبریں ہیں، مسز داراب جی کے چہرہ پر اور بالخصوص آنکھ کے پاس کسی پرند کی بیٹ پڑی ہوئی تھی۔ جسے میں نے وہاں سے علیحدہ کر کے صاف کر دیا۔ اور شاپور جی کے لیے دعا مانگی کہ یہ بہادر اور سچا ہمدرد نوع انسان اور محب وطن انسانوں اور ہندوستانیوں کی کامیابی کے ساتھ خدمت کرتا رہا۔

مگر دیکھنے کے قابل واڈیا صاحب کی عالیشان قبر ہے۔ اس شہر خموشاں میں آنسو گرانا تعجب کی بات نہیں، مگر ہنسی آنا ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن ہم میں سے ایک بھی اپنی ہنسی کو ضبط

نہ کر سکا جب کہ ہم نے ایک جانب اس کتبہ کو پڑھا:

I am Nowrozji Noshirwanji Wadia of The ancient Aryan race of Persia. A citizen of The loyal town of Bombay, who lies here peacefully under The far off sky of wide famed Britain.

(اس کا ترجمہ آپ ہی فرمائیں) نہ معلوم وہ بمبئی جس میں نریمان اور بھروچہ جیسے پارسی آج بھی ہیں جس میں دادا بھائی نوروزجی اور فیروز شاہ مہتا اور جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا اور رتن ٹاٹا جیسے پارسی گذر چکے ہیں۔ وہ واڈیا صاحب کے اظہار وفاداری اور اس پر اس قدر اصرار کے متعلق کیا کہے گا۔ کیا بمبئی میں صرف جنس وفاداری ہی ملتی ہے۔ حق پرستی، حب وطن اور حریت کی جنسوں کا وہاں کال ہے؟ برطانیہ کی شہرت یقیناً دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے آسمان کو کیوں "دور" کہا گیا ہے۔ ہر جگہ کا آسمان وہاں کی زمین سے یکساں فاصلہ پر ہوگا، یہ برطانیہ کا آسمان اس قدر دور کیوں ظاہر کیا گیا؟ اس کے کتبہ کو جس نے پڑھا وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ مگر آنجہانی واڈیا صاحب کا اس میں قصور نہیں ہے۔ "مردہ بدست زندہ" بظاہر ان کے کسی "وفادار" پسماندہ نے ان توقعات کی بنا پر جو انھیں "دور دور مشہور برطانیہ" سے ہیں، برطانیہ کے آسمان اور "وفادار" بمبئی کی زمین کی اس طرح مٹی پلید کی ہوگی۔ لیکن یہ عبارت بظاہر کسی پارسی کی بھی تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ باقی تین جانب جو اور ہیں ان کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو زند واد سے کہیں زیادہ بائبل پر عبور ہے۔ "سرمز" کا نام تو صرف ایک جگہ آیا ہے۔ لیکن

کی بار بار Rodumous اور Serious father of his children
تکرار کی گئی ہے۔ اور اسی طرح Lord God کی۔ اور ذیل کی عبارت کو پڑھیے تو صاف
معلوم ہو جائے گا کہ کسی عیسائی کی تصنیف کردہ ہے:

Those who opened the gate of the morning
Othen some of the righteous
with hearig in thy wings and lift up the
light of thy countenance on us that in thy
light we may see the light of life everlasting

ہم یہاں سے چلے تو لڑکوں کو بھوک لگی تھی۔ اس لیے وو کنگ میں داخل ہوتے ہی کا برج
ہوٹل ملا۔ وہاں موٹر رکی۔ اور ہوٹل میں داخل ہو کر خانساماں یا "خانم ساماں" کی تلاش کی۔ ایک
میم صاحبہ جو غالباً مالکہ تھیں، نکل آئیں اور پہلے تو چائے پینے کا وعدہ فرمایا لیکن جب میں آگے
بڑھا، اور میں نے پوچھا کہ ع کیسے کچھ اور بھی ہمت ہو گی یہ لڑکے بھوکے ہیں۔ لنچ ابتک نہیں کھایا
ہے۔ تو انھوں نے گھبرا کر چائے دینے سے بھی انکار کر فرمادیا۔ ہم سب کا قیاس ہے کہ انھیں "شیخ"
سے خوف آیا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں شیخ اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری کانٹے اور چمچے دبا کر
نہ لے جائے یا کہیں مالکہ ہی کا مالک نہ بن بیٹھے، میں نے دو تین دن ہوئے اپنے مکان سے قریب
ہی سینما میں وہ فلم دیکھا جس کا "The Shaikh's Son" عنوان ہے اور جس میں
رڈولف ولنٹینو آنجہانی مرحوم کے ایک نوجوان "شیخ زادہ" کا پارٹ کرتا تھا۔ ان فلموں کو
دیکھ کر کچھ تعجب نہیں۔ اگر ان ممالک والے اس اندیشے سے متردد ہوں کہ اگر شیخ زادہ دن
دراز دستیاں یہ ہیں، تو نہ معلوم خود "شیوخ" کی دراز دستیاں کیسی ہوں گی۔ جی میں آیا کہ ہوٹل

کی مالکہ صاحب کو مجبور کیا جائے کہ قانون کی رو سے وہ ہمارا مطالبہ مسترد نہ فرمائیں لیکن ان کی بےرائیگی پر رحم آیا اور قصبے میں آگے جا کر رسٹوران میں چائے پی گئی۔ سلاد کھایا گیا اور انڈوں کے آملیٹ (جسکو خانساماں "مالیٹ" کہتے ہیں) لڑکوں کو کھلائے گئے۔ کچھ میں نے بھی لیا۔

اب ذرا "سروار" اقبال علی شاہ صاحب کا حال سنیئے۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ان "خورد وار"[۱] نے علی برادران کے خلاف کیا کیا زہر اگلا ہے۔ یہ افغانوں کے اس مشہور خاندان کے ایک سپوت ہیں، جو غالباً حکومت افغانستان کے خلاف کچھ کارروائی کرکے ہندوستان کو بھاگ آیا تھا۔ اور یہاں سردھنہ ضلع میرٹھ میں آکر پناہ گزین ہوا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد سے مجھے نیاز حاصل ہے۔ اور بعض تو علی گڈھ میں ہمارے ساتھ پڑھے بھی ہیں۔ "سروار" اقبال علی شاہ صاحب بھی علی گڈھ کے پرانے طالب علم ہیں۔ اور جب میں ۱۳ءمیں یہاں سید وزیر حسن صاحب کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت آپ ایڈنبرا میں تعلیم پاتے تھے۔ امتحان تو شاید یہاں ایک بھی پاس نہ کیا، مگر ایک میم صاحبہ سے شادی ضرور کرلی۔ سنا ہے کہ ایک عرصہ تک تو انکے والد ماجد نے جو تحصیلدار تھے کچھ روپیہ بھیجا۔ لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کے علی گڈھ کے ایک رفیق کے پاس ان کا ایک طول طویل خط آیا ہے جس میں انھوں نے اپنی اقتصادی مشکلات کی داستان کو دہرایا ہے، اور پھر بتایا ہے کہ کس طرح غازی امان اللہ خان کے اعلان جنگ کے بعد ان مشکلات کا حل اس طرح نکل آیا کہ انھوں نے یہاں کے اخبارات کو برطانیہ کی تائید میں مضامین بھیجے۔ جو پہلے تو مسترد ہوتے رہے، لیکن بعد کو انڈیا آفس کے ایما سے (اور مجھے یقین ہے کہ "اصلاح" کے بعد) شائع ہونے لگے۔ جب میں ۱۹۲۰ءمیں پھر یہاں آیا تو یہ بھی مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ مگر میں نے التفات نہیں کیا، البتہ حیات صاحب کی مروت نے

---

[۱] "بزرگوار" کے مقابل کا لفظ۔ مولانا کو ایسے "متقابلات" کے گڑھنے میں ملکہ تھا۔

انھیں مجبور کیا کہ ملاقات سے انکار نہ کردیں۔ اس لیے دو ایک بار آپ ہمارے مکان پر تشریف لائے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ مجھ سے دہلی میں ملے اور کامریڈ کے اسٹاف میں نوکری کی خواہش کی، اور نمونۃً ایک مضمون بھی لکھ دیا۔ میں اگر ان پر اعتماد کر بھی سکتا تب بھی اس مضمون نے ان کی قابلیت کی ایسی قلعی کھول دی کہ ان کو نوکری دینا میرے لیے ناممکن ہو گیا اور زیادہ سے زیادہ یہ کیا تھا کہ ان کے سخت اصرار پر ان کے مضمون کی عبارت کو بار بار اصلاح دیکر اسے "کامریڈ" میں چھاپ دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے خود "The New Spectator" نام کا ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنا شروع کیا جس کو یہ میرے نام بھی بھیجتے رہے، پہلا پرچہ بھیجتے وقت جو خط میرے نام ارسال فرمایا تھا۔ اس میں میرے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا بہت کچھ اظہار فرمایا گیا ہے لیکن اس پرچے کے پہلے ہی صفحہ پر آپ کا پہلا ہی نوٹ شوکت صاحب کی مذمت میں تھا۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس پرچے کی اشاعت کی غرض کیا تھی۔ نواب صاحب بھوپال کے خلاف ہر پرچے میں زہر اگلا جاتا تھا۔ اور ان کے بھتیجے کو ریاست کا حقدار بتایا جاتا تھا۔ چند ماہ بعد آپ نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کا یہ پرچہ میں اپنے پریس میں شائع کیا کروں۔ جس سے میں نے فوراً ہی انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ پرچہ شائع ہونا بند ہو گیا۔ اگر کسی شخص کو یہ حسن ظن ہو کر جو مضامین آپ کے نام نامی سے یہاں کے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ آپ ہی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ دفتر "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے "The New Spectator" کی فائل منگا کر اپنی ضعیف الاعتقادی کی اصلاح کر سکتا ہے۔ خیالات پریشان اور رکیک، عبارت بے ربط اور ناقص، یہ آپ کی حقیقی قابلیت کے ثبوت میں موجود ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی کسی کو مزید ثبوت درکار ہو تو وہ مئی یا جون ۱۹۲۰ء کی پاؤنیر کی فائل اٹھا کر دیکھ لے۔ جس میں ایک پرچہ کے پڑھنے والے کو پہلے ہی صفحہ پر ایک

ایڈیٹوریل نوٹ ملے گا۔ جس میں میرے ایک خط کا جو میں نے یہاں سے شوکت صاحب کے نام لکھا تھا، مذاق اڑایا گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پرچہ میری نظر سے گذرا تھا۔ لیکن اسی نوٹ کے بعد ایک اور نوٹ بھی ہے جس میں "سردار" اقبال علی شاہ وسط ایشیا کے . The expert (ماہر) کے ایک مضمون کے متعلق جو یہاں ایک مصور پرچہ میں مع چند تصاویر کے شائع ہو چکا تھا، درج ہے کہ اس میں جو تصویر دی گئی ہے وہ یقیناً سردار صاحب نے اپنے سفر کے ایام میں ہرگز نہیں کھینچی تھی، نہ اس مقام کی تصویر ہے جس کا سردار صاحب نے ذکر فرمایا ہے۔ بلکہ اس سے بہت دور ایک اور مقام کی تصویر ہے۔ اور ایک انگریز فوجی افسر کی کھینچی ہوئی ہے، جو اس کی ایک تصنیف کردہ کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔ اور اس کے فلاں صفحہ پر موجود ہے۔ اور ہمارے وسط ایشیا کے محقق ایک سارق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ کے اخبار بند ہونے کے بعد آپ کی میم صاحبہ ہندوستان سے ولایت چل دیں اور اس "جنوری" کے "دسمبر" کی طرح ؎

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے جنوری تو ہے اب ماہ دسمبر میں ہوں

آپ نے تعاقب کی ٹھانی۔ سنا گیا ہے کہ والد صاحب سے روپیہ کا پھر مطالبہ کیا گیا، اور جب انہوں نے عذر کیا کہ میرے پاس روپیہ کہاں تو ان کو دھمکی دی گئی کہ اگر روپیہ نہیں دیا گیا تو ایک دیوانی کے مقدمے میں فریق ثانی کی طرف ان کے خلاف گواہی دے دی جائے گی۔ اس پر ان کے دوستوں نے کہا بھائی کہیں سے قرض وام لے کر دے دو، ورنہ مقدمہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ کچھ روپیہ اس طرح ملا۔ اس کے بعد بمبئی تشریف لائے۔ تو حبیب الرحمن خاں صاحب (نواب صدر یار جنگ بہادر) جو یقیناً ان کے والد ماجد کو ان کی علی گڑھ کی تحصیلداری کے زمانہ سے جانتے تھے، عازم حج نظر آئے۔ پھر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت عجیب بات ہے میں بھی احرام سفر باندھ کر آیا ہوں مگر جدہ کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا بھائی ایک ٹکٹ تو میرے پاس ہے۔ چنانچہ اس ٹکٹ کو

لے کر آپ نے مکہ معظمہ کا قصد فرمایا اور ان ہی کے طفیلیوں میں آپ جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود ملک الحجاز والنجد و ملحقاتہا کے "مہمان" بنے اور ان سے مکہ معظمہ میں ملاقات کی۔ اور ایک دن جو غالباً پہلا ہی دن تھا ان کے ہمراکاب آپ موتمر عالم اسلام میں بطور وزیر کے شریک ہوئے یہ باتیں میں نے مکہ معظمہ ہی میں سنی تھیں۔ مگر چونکہ میں نے خود تحقیقات نہیں کی ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کہاں تک صحیح ہیں۔ مکہ معظمہ پہنچ کر آپ ہم سے بھی ملنے آئے۔ وہاں پہلے ہی سے متعدد جواسیس دور دور مشہور برطانیہ کے موجود تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم سب بول اٹھے۔ آہا آپ بھی تشریف لائے آپ ہی کی کسر تھی۔ کم از کم مکہ معظمہ میں تو نہ انگریزی ٹوپی "ہیبر" تھے اور نہ لباس انگریزی "دربر" غالباً ٹوپی تو ترکی تھی۔ اور ریشم کا لانبا کوٹ تھا اور ٹانگوں میں شلوار لیکن اس بدبخت کی کم نصیبی کو کیا کہا جائے گا جو اس طرح مفت سفر کر کے بھی حج سے دو دن پہلے جدہ کو چل دے۔ اور وہاں سے عازم یورپ ہو جائے۔

جو "ٹائمز" کے مضامین ماجد میاں نے مجھے ارسال فرمائے تھے ان میں سے ایک مضمون میں ایک عبارت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موتمر عالم اسلام کے جلسے اس ترکی قلعے میں منعقد ہوئے تھے جو پہاڑ پر واقع ہے۔ حالانکہ سارے جلسے جیاد کے میدان والی کشلہ یا ترکی فوجی بارک میں ہوئے تھے جو اس پہاڑ اور قلعہ کے نیچے واقع ہے۔ اس عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مضمون کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص ہے جس نے اس قلعے کی تصویر ہی دیکھی ہے اور غلطی سے ترکی کشلہ کو ترکی قلعہ سمجھ گیا ہے اور خود موتمر میں ہرگز موجود نہ تھا۔ حالانکہ "سردانہ" صاحب ایک دن ضرور وزیر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے یعنی نام تو آپ کا تھا مگر کام کسی انگریز کا تھا۔ آپ کا کام صرف اس قدر تھا کہ شوکت علی محمد علی کے خلاف چند جھوٹی باتیں دل سے گڑھ کر دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ ہندوستان کے ہاتھ فروخت فرما دیں۔ اس موتمر کے بعد آپ کے نام سے ۲۰-۲۵

مضامین شائع کر دیے ہوں گے۔ اور اس کے بعد آپ کا ایک لکچر ساؤتھ فیلڈ کی اس قادیانی مسجد میں زیر صدارت سر مائیکل اوڈوائر سابق لفٹنٹ گورنر پنجاب دلوایا گیا تھا جس کے افتتاح کا وعدہ کر کے شہزادہ فیصل ابن عبد العزیز آل سعود نے بالآخر انکار کر دیا تھا اور جس کے لیے قادیان سے میرے پاس ایک تار آیا تھا کہ میں سلطان ابن سعود کو پھر آمادہ کروں کہ وہ اپنے صاحبزادہ کو اس مسجد کے افتتاح کی اجازت دے دیں۔ مضامین اور لکچر دونوں علی برادران کی مذمت سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس مکان کی مالکہ صاحبہ نے سب سے اوپر کی منزل سے سب سے نیچے کی منزل میں یہ کہلا کر طلب فرمایا کہ ایک صاحب آپ سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے ہیں اور ان صاحب نے فرمایا کہ میرا نام اقبال علی شاہ ہے۔ ٹیلیفون پر جو مکالمہ ہوا اب اسے سنیے:

سردار اقبال علی شاہ - مولانا السلام علیکم۔ معاف فرمایئے گا میں نے آپ کو تکلیف دی۔

محمد علی - وعلیکم السلام۔

س۔ ا۔ ع۔ ش۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ آپ کو اوپر سے نیچے آنا پڑے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ ٹیلیفون آپ ہی کے کمرے میں ہے۔

م۔ ع۔ ارشاد فرمایئے۔

س۔ ا۔ ع۔ ش۔ فرمایئے آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔

م۔ ع۔ جی نہیں۔

س۔ ا۔ ع۔ ش۔ امید ہے آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م۔ ع۔ جی نہیں۔

س۔ ا۔ ع۔ ش۔ آپ کا قلب تو نہایت وسیع ہے۔

م - ع - مگر میرا دماغ بالکل تنگ نہیں ہے۔

س - ا - ع - ش - کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔

م - ع - جی نہیں۔

س - ا ع ش - میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ امید ہے کہ آپنے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م - ع - اور میں بھی پہلے عرض کر چکا ہوں، جی نہیں۔

اس کے بعد میں نے ان ذات شریف کو ان کے تمام مضامین یاد دلائے اور ان کا لکچر یاد دلایا اور کہا کہ میں تنگ دل نہیں ہوں لیکن اس قدر ضعیف الدماغ بھی نہیں ہوں کہ ایسے پاجیوں سے دھوکا کھا جاؤں۔ مجھے تعجب ہے کہ برطانیہ کے ایسے گرگوں کو جو اس کی طرف سے ایسے گندے کام اور جاسوسی کرتے پھرتے ہیں۔ کیسے ہمت ہوئی کہ مجھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کریں اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں۔ میں نے کہا کہ اب اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیے اور میں نے ٹیلیفون کو فوراً منقطع کر دیا۔

اب اس خط کو بھی اسی خاتمہ بالخیر پر ختم کرنا چاہتا ہوں، ورنہ بیچاری بیگم صاحبہ کے نام دو سطریں نہ لکھ سکوں گا۔ مہاراجہ پٹیالہ کا لکچر اور ٹیکسی والے کی میرے ساتھ گستاخی اور اس کا ثمرہ اور اس ثمرے کا جو ثمرہ بنگالی طالب علم اور مجھے چکھنا پڑا وہ داستان اس ہفتہ بھی ملتوی رہی۔ انشاء اللہ کل پرسوں اسے لکھ رکھونگا تاکہ اگلے ہفتہ ضرور آپ تک جا سکے۔

"ہمدرد" کی اشاعت کے متعلق کوئی صاحب کچھ تحریر نہیں فرماتے۔ پرچہ ماشاء اللہ خوب نکل رہا ہے۔ خرچ ظفر الملک صاحب کی ہمت سے گھٹ گیا ہے اور اس پر بھی دس صفحے نکل رہے ہیں۔ اور بارہ کا ارادہ ہے۔ خدا اجر خیر عطا فرمائے مگر یہ تو بتائیے کہ قدر دانی میں کس قدر اضافہ ہوا۔ اب آپ صاحبوں اور "ہمدرد" اور اسلام اور ہندوستان کے لئے دعا

پر اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔

آپ کا بھائی محمد علی

گذشتہ جمعرات یعنی ۲۸ اگست کو میں دار العوام گیا تھا جمعہ کو دار العوام کا آخری اجلاس تھا۔ اور سکلات والا[1] کے بہم اعتراضوں اور سوالوں پر لیبر پٹی نے محض نام کے واسطے بجٹ کے سلسلہ میں ہندوستان کا مسئلہ بھی چھیڑا۔ صرف دو گھنٹے ایک شب ہندوستان کے ۳۲ کروڑ انسانوں کے لیے بھی وقف کئے گئے۔ مگر وہ بھی آخری اجلاس میں اور کنزرویٹو فرقہ والوں نے عمداً گینڈا کو انگریزی مزدوز بھیجنے کے سلسلہ میں فضول تقریریں کر کے اور وزیر محکمہ کے جواب کے بعد بھی تقریر کے سلسلہ کو جاری رکھ کر اور خلاف انتظام طے شدہ یہاں کے سابق سپاہیوں کی سول سروس میں نوکری کے مسئلہ کو بھی اٹھا کر اتنی دیر لگا دی کہ ہندوستان کا ذکر خیر بجائے ۹ بجے شب کے ساڑھے دس بجے شروع ہوا اور ساڑھے بارہ بجے ختم ہو گیا۔ رات کے بارہ بجے تک کی کارروائی اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" کی فائل کے ساتھ بھیجدی ہے اور باقی کارروائی یوسف حسین خان[2] (برادر ذاکر صاحب جو آجکل میرے ہمراہ اسی مکان میں مقیم ہیں) خرید کر کے غالباً آج ہی آپ کو روانہ کر دیں گے۔ سکلات والے کی تقریر بے مثل تھی۔ اور ارل ونٹرٹن نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اس کا مطلق جواب نہ دیں۔ کل مباحثہ کا حال انشاءاللہ اگلے ہفتہ ارسال کروں گا۔

محمد علی۔

---

[1] بمبئی کے ایک پارسی، جو مدت سے انگلستان میں قیام پذیر تھے، اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی منتخب ہو گئے تھے۔ سوشلسٹ خیال کے تھے۔
[2] یہ بعد کو فرانس کی کسی یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے کر آئے۔ اور اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ و سیاسیات کے استاد ہیں۔ (سنہ ۱۹۵۲ء)

باب (۷۵)

۱۹۲۸ء

سمہ (۷)

(دیارِ فرنگ سے)

خط میں حشو و زوائد آج یقیناً بہت سے معلوم ہوں گے لیکن اب اسے کیا کیجئے کہ زمانہ کا امتداد اور ہر لمحہ اور ہر آن ۔ ہر "تازگی" کو "باسی پن" میں، ہر شادابی کو پژمردگی میں تبدیل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ زمانہ کی گردش اور وقت کے چکر کو کون روک سکا ہے؟ اس وقت عین یہی چیزیں نہایت دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں ۔ اور ان خطوں کی ایک ایک سطر دلکشی اور جاذبیت رکھتی تھی ——— یہ خط موصول ہو ہی چکا تھا کہ اسی کے دو چار روز بعد یہ دوسرا مکتوب بھی وصول ہوا۔ دلکشی و گہرائی میں اپنے پیش رو کے نقش قدم پر۔ پڑھنے والے بھی اس سے لطف و نفع حاصل کریں گے، اب یہ تو اللہ جانے۔ ڈائری نویس سے تو بہر حال یہ ممکن نہین کہ اسے بے درج کیے گزر جائے ۔ حاضر ہے، اور حسب معمول ضروری توضیحی حاشیوں کے ساتھ حاضر ہے ۔ گو خود ان ضروری توضیحات کا معیار بھی گردشِ لیل و نہار کے ساتھ ساتھ بدل گیا ہے ۔

راہی ملک جرمنی

۱۶ اگست ۱۹۲۸ء۔

پیارے ماجد میاں۔ ظفر الملک صاحب اور جعفری۔ السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

میں ۱۳ اگست کی شب کو لندن سے نکلا ہوں اور دو دن پیرس قیام کر کے تین "بچا پیچ" کے ساتھ جرمنی جا رہا ہوں جن میں سے دو وہ صاحبین ہیں جن کے ساتھ میں لندن کے مکان میں رہا کرتا تھا، اور ایک عبد الرحمٰن صاحب صدیقی[1] کے بھانجے محمد امین فقیہ صاحب صاحبزادے جو ہمارے فرانس کے حدود میں ترجمان اور سارے عالم میں ہمارے خرچ کے خزانچی ہیں۔ خالد صاحب جو جولائی سے اپنے والد کے ایک دوست کے ترجمان اور رفیق سفر بنکر لندن سے نکلے تھے اور ان "چچا جان" کو مارسیلز تک پہنچا آئے تھے۔ اس کے بعد جب شوکت عمر صاحب "بٹرسی پالیٹکنک" سے جہاں وہ سات آٹھ ماہ سے پڑھ رہے تھے کامیاب ہو کر لندن یونیورسٹی کے سکنڈ ایر میں داخل ہو گئے اور ان کے ساتھی اشرف صاحب کو لندن کاٹنے لگا، اور ہمیں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی یوسف کے ساتھ چھوڑ جو پیرس کی ساربون یونیورسٹی سے ڈاکٹر و زیر ہند اور برٹش میوزیم میں مطالعہ کرنے آئے ہیں۔ پہلی اگست کو پیرس چلے آئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلی ستمبر تک لندن رہ کر کرنل آسٹن سے علاج کراتا رہوں اور اس کے بعد فرانس آ جاؤں اور بالآخر ایک ہفتہ اٹلی رہ کر عازم ہندوستان ہو جاؤں، البتہ راستہ میں ایک ہفتہ شہر مصر میں بھی قیام کروں اور اگر کچھ پیسے بچ سکیں تو فلسطین بھی ہوتا ہوا ؤں لیکن اگست کا مہینہ لندن والوں کے لیے چھٹی کا مہینہ ہوتا ہے۔ اور غریب اور امیر، مرد

---

[1] علی گڈھ کے مشہور اولڈ بوائے۔ ایک زمانہ میں مولانا کے رفیق خصوصی تھے۔ ان دنوں کلکتہ میں ہیں۔ صدر کلکتہ کارپوریشن، ایم۔ ایل۔ اے۔ اڈیٹر "مارننگ نیوز" وغیرہ۔ اس وقت غالباً کراچی میں ہیں (۱۹۵۲ء)

اور عورت اور بچے دو تین دن سے لے کر دو ماہ تک کے لیے لنڈن سے باہر سمندر کے کنارے یا کسی اور تفریح گاہ کو چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ کرنل آسٹن صاحب بھی ۱۱ر اگست سے ۱۰ دن کے لیے انگلستان کے مشہور اور قدیم جنگل "نیو فارسٹ" میں چلے گئے ہیں۔ یہاں ووکنگ کے امام صاحب نے اصرار فرمایا کہ عید میلاد کے جلسہ تک جو ۸ر ستمبر کو ہونے والا ہے لنڈن میں قیام کروں اور اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کے بعد انگلستان سے رخصت ہوں۔ جب میں قاہرہ گیا تھا تو ڈاکٹر احمد فواد نے سخت اصرار کیا تھا کہ یورپ چھوڑنے سے پیشتر جرمنی کے مشہور فرینکفرٹ کے ذیابیطس کے ماہر ڈاکٹر پروفیسر فان نارڈن کو بھی اپنا حال سناتا آؤں اور گو میں کہہ چکا تھا کہ میں علاج صرف کرنل آسٹن کا کروں گا لیکن ان کے اصرار پر اس کا وعدہ کر چکا تھا کہ ان سے اپنا طبی معائنہ ضرور کرالوں گا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کرنل آسٹن کے علاج کے بعد اب حالت کیسی ہے۔ اس لیے گذشتہ ہفتہ میں ایک دن جا کر اپنے پاسپورٹ بیلجیم، جرمنی اور ہالینڈ کے لیے بھی توسیع کرالیا عجیب حسن اتفاق ہے کہ دوسرے ہی دن جرمنی سے چودھریا صاحب مسز نائیڈو کے بھائی کی دعوت بھی آئی۔ میں ان کا دعوت نامہ اور اس پر میں نے جو جواب لکھا تھا دونوں ملفوف کیے دیتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دعوت کس قسم کی تھی اور میں نے اس کا کیا جواب دیا۔ مجھے اس وقت ترجمہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ آپ حضرات خود ترجمہ کر سکتے ہیں ورنہ میں نے اس کا خلاصہ اس خط میں دیدیا ہوتا۔ میں ۱۱ر ہی کو روانہ ہو گیا ہوتا مگر بیگم صاحبہ کو جو تار گذشتہ بدھ کو دیا تھا اس کے جواب کا بیرنگ انتظار تھا۔ گو گذشتہ ہفتہ کے تار کا جواب نہ آنے سے تقریباً مایوسی ہو چکی تھی اور میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ میجر سعید محمد خان[5] کے ساتھ جو بھوپال سے ۱۹ر اگست کے جہاز میں روانہ

[5] علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے خورجہ کے رہنے والے۔

ہو رہے ہیں، معہ لڑکیوں کے نہیں آرہی ہیں۔ ۱۳ اگست کو ان کا جواب بھی آگیا کہ روپیہ کا کوئی بند و بست نہیں ہو سکا اور میں نے حمیدہ بی کو خدا پر چھوڑ خود جرمنی جانے کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں چٹو پدھیا صاحب کا تار بھی برلن سے آگیا کہ سب انتظامات کردیے گئے، چنانچہ وقت بچانے کے لیے اسی شب کی گاڑی میں یوسف صاحب سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ ساؤتھمپٹن اور اور ٹے ہو کر آتا ہے۔ اور چینل (رود بار انگلستان) کے عبور کرنے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں۔ یہ عام طور پر لوگ اس سے گھبراتے ہیں لیکن وقت کی بچت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ رات کو ڈوور کے لیے ہو کر اور فاک اسٹون بولون ہو کر سفر کیا جا سکتا ہے۔ راستہ میں بڑی خیر ہو گئی۔ ساؤتھمپٹن کے اسٹیشن پر کوئی قلی نہ ملا، اس لیے اپنے ہینڈ بیگ وغیرہ اور سوٹ اٹھا کر میں بھی اور مسافروں کے پیچھے ہو لیا اور ان ہی کے ساتھ ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔ اگر جاتے ہی سونے کے لیے کیبن نہ مانگا جاتا تو بجائے فرانس کے مین جزائر چینل پہنچ گیا ہوتا۔ جب میں نے کشتی پر سوار ہو جانے کے بعد اپنا ٹکٹ کمرہ لینے کے لیے دکھایا تو پتہ چلا کہ

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی　　کین رہ کہ تو میروی بترکستان است

فوراً اتر کر اس طرف گیا جہاں ایک دوسری کشتی فرانس جانے کے لیے کھڑی تھی۔ غریب فرانسیسی مزدور کو تو ۵ فرانک مزدوری کے مل جاتے ہیں۔ اسے غنیمت سمجھتے ہیں، لیکن یہاں کے قلیوں کے لیے دو شلنگ بھی مشکل سے کافی ہوتے ہیں۔ اور استغنا کا یہ عالم ہے کہ مسافروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ رہے ٹکسی والے تو اس جماعت میں تو ایسے خبیث بھرے ہوئے ہیں کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ ساری دنیا سے زیادہ بھاری سستا اور سڑیل ٹیکسیاں لندن کی ہیں۔ لیکن کرایہ پیرس کی عمدہ ترین ٹیکسیوں سے بھی تگنا چوگنا ہے اور انعام بطور انعام کے

قبول نہیں کیا جاتا بلکہ حق سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر خوردہ لینا پڑتا ہے تو بڑے اصرار کے بعد ملتا ہے، ورنہ ایک شلنگ کا ڈیڑھ شلنگ کرایہ ہوا اور ڈھائی شلنگ دیا جائے تو ٹوپی چھو کر جیب میں رکھ لیتے ہیں اور نہایت اطمینان سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ ان ٹیکسی والوں کے متعلق انشاء اللہ آیندہ کسی خط میں تفصیل سے لکھوں گا اور وہ سارا قصہ دہراؤں گا جو مجھے پیش آیا اور جس کی بدولت لندن کے ایک پرجوش بنگالی طالبعلم کو ٹیکسی والے کو دو پاؤنڈ بطور خرچہ دینے کے پڑے تھے اور مجھے ان کی حمایت کرنے والے سالسٹر اور بیرسٹروں کو ان کے گھنٹہ بھر کی محنت کے لیے پانچ پاؤنڈ سات شلنگ چھ پنس دینا پڑے تھے۔ ۱۴ر کو پیرس پہنچ کر اسی وقت راہی فرانکفرٹ ہوگیا ہوتا مگر جنوبدھیا صاحب کا جس کے متعلق انکا تار آیا تھا کہ اس میں ہدایات سفر ارسال کیے گئے ہیں۔ مجھے اس دن ٹامس کک کے یہاں سے نہ مل سکا۔ اس کے علاوہ "بجاپا جی" کو سین ژرمین کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ واپسی میں یکایک داہنے پاؤں میں درد شروع ہوا اور اس کے باعث شب کو حرارت ہوگئی۔ وہ کل بھی رہا اور آج بھی باقی ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ سب ذیابطیس اور نیورائٹس کی علامت، چنانچہ آج شب کو فرانکفرٹ پہنچ کر کل صبح کو پیر بھی دکھاؤں گا۔ میری صحت کی عام حالت اچھی ہے۔ پچھلے فاقہ کے بعد ایک ہفتہ تک میں نے گوشت نہیں کھایا۔ بلکہ محض پھلوں اور بغیر پکی ہوئی ترکاریوں پر یعنی کھیرا و ککڑی و ولایتی بیگن اور کاہو پر گذر کیا۔ قارورہ کا امتحان کرایا تو شکر نصف فیصدی تھی اور چربی ۱/۲ ۲ فیصدی تھی۔ فاقہ کرنے کے بعد شکر بالکل نہ تھی اور چربی ۳/۴ ۲ فیصدی تھی، وزن مخصوصہ ۱۴ر ۱۶ سے بڑھ کر ۱۶ر ۹ ہوگیا۔ وزن تو نہیں بڑھا صرف چھ چھٹانک کی زیادتی ہوئی تھی، مگر توقع کے خلاف کمر ۱۲ انچ بڑھ گئی تھی، اور پاؤں کے تلوؤں میں اعصابی سوزش پھر کسی قدر شروع ہوگئی تھی۔ اس لیے میں نے پھر ڈاکٹر گالیپا کے دستور کے مطابق سفر میں فاقہ

شروع کر دیا اور آج فاقہ کا چوتھا دن ہے۔ البتہ جس شب کو بخار آیا تھا اور سردی محسوس ہونے کے باعث ترکاری کا شوربا "بچاپچ" تیار کرا لائے تھے۔ وہ پی لیا تھا مگر صبح ہی کو فروٹ سالٹ کا ایک مسہل اور لے لیا۔ رات اور پرسوں رات بھی بائیں پاؤں میں اعصابی سوزش ہوئی تھی۔ اس سے کچھ امید بھی بندھتی ہے کہ مرض کا فاقوں سے مقابلہ ہو رہا ہے اور ہزیمت اٹھانے سے پہلے مرض زور دکھا رہا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ کل آپ کو خط لکھتا مگر اس درد کے باعث نہ لکھ سکا اور بجائے اس کے خالد کو ساتھ لے کر ملیس نامے میوزک ہال دیکھنے چلا گیا۔ برادران من اب تو مدت سے کسی محفل رقص و سرود میں شریک نہیں ہوتا ہوں اور باوجود نفس امارہ کے بست سے مطالبات کے انھیں پورا کرنے سے باز رہتا ہوں۔ ان ہی کیفیات قلبی کو ایک شعر میں اس طرح ادا کیا تھا ؎

یکبارگی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے
اے دل نگاہ یار بھی کیا سحر کر گئی

ہندوستانی کا گانا سننے کو البتہ دل تڑپا کرتا ہے اور شوکت صاحب نے تو ایک دو بار نفس کو بہت ہی لالچ دلایا۔ اس لیے کہ گوہر جان[1] کی طرف سے وہ دعوت لائے تھے کہ کبھی کبھی تو گھر آ کر دو کچھ سن لیا کیجئے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ سوائے اقبال کے اشعار کے اور حسرت کی غزلوں کے آپ کو کچھ اور نہ سناؤں گی۔ لیکن میں نے ضبط و صبر سے کام لیا اور کہلا بھیجا کہ اب تو معذور ہوں۔ البتہ جب کبھی کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب[2] کا گانا ضرور سن لیا کرتا ہوں اور

[1] کلکتہ کی بہت مشہور مغنیہ۔ مولانا یہ ذکر اپنے قیام کلکتہ کے زمانہ کا کر رہے ہیں یعنی سنہ ۱۹۱۱ء کا۔ نہ کہ اگست سنہ ۱۹۲۹ء کا جو اس خط کی تحریر کا زمانہ ہے
[2] کلکتہ کے مشہور قوال

"جنت نگاہ" نہ سہی "فردوس گوش" تو ضرور نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ مہاراجہ الور کے ہمرکاب رامپور گیا تھا تو پہلی شب کو جب میں محفل رقص وسرود میں حاضر نہ ہوا تھا تو بلوایا گیا تھا۔ لیکن جب میں نے عذر پیش کر دیا تو مہاراجہ صاحب نے اسے قبول فرمایا۔ بلکہ خود بھی اس کے بعد محفل رقص وسرود میں شریک نہ ہوئے اور اس کے عوض قوالی کی محفل اپنی قیام گاہ کے پاس ہی ہر شب کو منعقد کرائی، ہندوستان میں جو تھیٹروں کی حالت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ سینما میں بھی اکثر سوائے بوس وکنار کی تصاویر کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں سینما میں نہیں جایا کرتا۔ اور "بچا پیچ" کو یہ سنکر سخت تعجب ہوا کہ میں نے آج تک چارلی چیلپن[1] کو سینما میں نہیں دیکھا تھا۔ اور گذشتہ ہفتہ ہی میں اپنے محلہ کے ایک سینما میں ان کے فلم پروگرام میں دیکھتے ہی بس پڑے اتر پڑا۔ حالانکہ ٹکٹ پکاڈلی کے لیے تھا۔ تاکہ وہاں جاکر ایک تھیٹر میں سینما دیکھیں۔ البتہ میں سنجیدہ ڈرامے کا عاشق ہوں۔ اور ایلن میٹری جو ابھی انتقال کر گئی ہے اور اروِنگ بیر بو ہوم اور مسز ٹری فاربس رابرٹس اور مسز پیٹرک اور پھر ان کی بیوی گرٹروڈ ایلیئٹ ولسن بیرٹ اور نائد چیفریز اور پھر لیلا میک کارتھی وغیرہ کو آکسفرڈ کی تعطیلات میں دیکھنے کے لیے بار بار تھیٹر جایا کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب لندن آیا تھا تو مطلق فرصت نہ تھی۔ پھر بھی برنارڈ شا صاحب کے ایک تماشہ کو دوبارہ جاکر دیکھا، لیکن اب وہ بڑے بڑے ایکٹر باقی نہ رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تو اتنی بھی فرصت نہ تھی جتنی کہ ۱۹۱۴ء میں تھی، اور حقیقت میں دل بھی اب اس ڈرامے میں لگا ہوا تھا جس میں مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھی اناطولیہ میں ایکٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بار ذرا فرصت تھی اور ہنڈن میں طیاروں کے کرتب دیکھنے کے بعد شفیع کی رسٹوران میں ہندوستانی کھانا کھا کر تھیٹروں کی طرف رخ کیا۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ "بچا پیچ" کے اصرار سے ہوبرن کے

[1] انگلستان کا مشہور ترین ظریفہ فلم ایکٹر۔

امپائر نامی میوزک ہال میں گیا اور بالکل خیال نہ رہا کہ یہاں تو محفل رقص و سرود گرم ہوتی ہوگی۔ جب وہاں پہنچ چکا تھا تو میری آنکھوں نے پہلی بار تھیٹر میں وہ نظارہ دیکھا جو کبھی جوانی میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یعنی چند عورتیں ٹخنوں سے لے کر رانوں تک برہنہ ہمارے یہاں کی کبوتریوں کی طرح کرتب دکھا رہی ہیں۔ جب میں تیس برس پیشتر انگلستان آیا تھا تو میوزک ہال میں ہر رقاصہ ریشم کے ٹایٹ یعنی رانوں تک موزے پہنے ہوتی تھی۔ پھر بھی ایسے رقص گاہوں میں جانا "رنگیلے پن" کی علامت تھی لیکن اب تھیٹروں میں برہنگی کیوں نہ آئے جب سمندر کے کنارے کے ہر تفریح گاہ میں ہزاروں عورتیں مردوں کی طرح سے بنیان جانگیا پہنے ان ہی کے ساتھ تیرتی پھرتی ہیں، اور اس کا نظارہ گو ابتک کسی بندرگاہ پر جاکر نہیں کیا ہے تاہم اپنے جہاز ہی پر ولایت آتے وقت دو تین میم صاحبان کو ڈک پر کرچ کی حوض میں کودتے پھاندتے اور مردوں کی گردنوں پر سوار ہوتے دیکھ چکا تھا۔ آج کل ہر مصور اخبار میں ان ہزارہا عنابجات کے حسن کی نمائش اور اس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں ہر ہفتے چند پرچے مولانا عرفان کی خدمت میں بھیج دیا کرتا ہوں کہ وہ سمجھ سکیں کہ اب نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

برادران من! حقیقت میں اب پردہ یہاں تک اٹھ چکا ہے کہ شب عروسی بھی بے نقاب نظر آتی ہے۔ جب انگلستان کا یہ حال ہو، جہاں میری طالب علمی کے زمانے میں عورتوں اور مردوں کا ساتھ ساتھ نہانا قطعاً ممنوع تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں عورتوں کا سارا جسم ڈھکا ہوتا تھا، تو پھر آج پیرس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جب میں نے "بچا چیچ" سے سنا کہ وہ مولان اور نوفلی برنٹر یا جاکر اس عریانی کا نظارہ کر چکے ہیں تو میں نے بھی اس خیال سے

کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

فیصلہ کیا کہ سینیس جا کر دیکھوں تو کیا کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے "پاری پلیزیر" نامی ایک رسالہ میں متعدد تصاویر دیکھ چکا تھا، جس میں دو مسماتیں "وحید" اور "دہلی" نامی بھی تھیں۔ ان کا لباس دیکھ کر مجھے اس امریکن عورت کا قول یاد آیا، جس نے لکھا تھا کہ "ہاں میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کا قومی لباس کیا ہے۔ ہندوستان کا قومی لباس ایک ٹپکا اور ایک جیبی رومال ہے"۔ ان غیر مستورات کے سر پر بھی ایک ٹپکا تھا اور باقی جسم کے لیے ایک نہایت مختصر سا جیبی رومال رہ گیا تھا۔ اس رومال کو رومالی کی جگہ دیکھ کر بے اختیار غالب کے اس شعر میں تصرف کرنے کا جی چاہتا تھا ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو معشوق کی خشفت ہونا

میں نہیں کہہ سکتا کہ "خشفت" کے ہجے کیا ہیں۔ آج تک کبھی لکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے روہیلکھنڈ والوں کی پشتو کا ایک لفظ ہے۔ اور خ ق اور ش ت کا اجتماع یقیناً "پختو" پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن "بجا بچ" نے تصدیق کر دی کہ یہ لفظ مستعمل عام ہے۔ بلکہ پیش پا افتادہ ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ شاید یہ ہوگا Worn Thread bare۔ جو کچھ میں نے دیکھا، اس کے صرف ایک حصہ کی تصاویر آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ اگر ان کے بلاک بھی مل جاتے تب بھی "ہمدرد" میں یہ تصاویر شائع نہ ہو سکتیں، گو ایک بار شائع ہو جائیں تو یقیناً "ہمدرد" کی اشاعت "زمیندار" اور "انقلاب" سے بڑھ جائے اور ایک مجرو بے ریشے مولف[1] کے تجربات شب عروسی وغیرہ کو بھی مات کر دے۔

[1] دہلی کے ایک خاص مولف کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت اسی قسم کی کتابیں لکھ کر اور فروخت کر کے نام پیدا کر چکے تھے۔

اب میں اس خط کا بھی خاتمہ بالخیر کرتا ہوں۔ ہم سیلان سے جو فرانس کا ایلمڈ شاٹ یا راولپنڈی ہے
گذر چکے ہیں۔ اور اب نبلیسی سے گذر رہے ہیں۔ جو واٹے زے پہاڑوں کے سلسلہ کے پیچھے فرانس کے مدافعتی خط
کے وسط میں ہے۔ ممکن ہے کہ اگلا خط اتنا لمبا بھی نہ ہو سکے اس لیے کہ اس دن انگلستان کو واپس ہو رہا ہوں گا۔
گذشتہ ہفتہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ جمعہ کے بعد ہی آپ کو خط لکھنا شروع کر دوں گا لیکن نماز جمعہ کے بعد نماز گاہ
میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جماعت سے مذہبی مکالمہ کیا کرتا ہوں اور اس کے بعد آرنلڈ[۱] سے ملنے گیا۔ اور وہاں سے قادیانی
جماعت کے ساتھ شب کا کھانا کھانے گیا۔ مگر صرف دعوت ہی نہیں تھی بلکہ ایک پورا استقبال ہو گیا۔ ایک نومسلم
آئرش نے ایڈریس پڑھکر سنایا۔ اور مجھے بھی تقریر کرنا پڑی اور وہاں کے امام نیر صاحب نے بھی تقریر کی اور دوسرے
دن ان ہی نومسلم آئرش مین صاحب انکی موٹر میں لندن سے ۳۰-۴۰ میل باہر ان کے دوست اور اپنے واقف کار
ایک انگریز نومسلم صاحب سے ملنے جانا پڑا جو نیاسالینڈ (افریقہ) میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔ انکا نام سانڈرسن ہے اور
حج بیت اللہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کو ہم نے تار دیدیا تھا مگر افسوس کہ وہ تار ملنے سے پہلے ہی کہیں
باہر جا چکے تھے۔ یہ نیاسالینڈ کی زبان کے حروف تیار کر رہے ہیں تاکہ عربی رسم الخط میں حروف کا اضافہ کرکے
قرآن کریم کا اس زبان میں ترجمہ ٹائپ میں شائع کر دیا جائے۔ انشاءاللہ واپسی پر ان سے پھر ملنے ضرور جاؤنگا۔ اس سفر
کے باعث خط جمعرات سے پیشتر اس بار بھی شروع نہ کیا جا سکا اور جتنا لکھا گیا ہے اس کیلیے آپ کو اشرف صاحب[۲] کا شکریہ
ادا کرنا چاہیے جنھوں نے ابتک سوکھی روٹی بھی نہیں کھائی ہے۔ چونکہ "بچا کھچا" کو سیر و تفریح کیلیے علحدہ روپیہ نہیں
ملا ہے، اسلیے میرے طریقہ علاج پر عمل کرکے وہ صرف ایک وقت سوکھی کھاتے ہیں اور پیٹ کاٹ کر سفر کرتے ہیں
اور نپولین کے مشہور مقولہ پر کہ "فوج پیٹ کے بل پر چلا کرتی ہے" ایک دوسرے معنی میں عمل کر رہے ہیں۔ فی امان اللہ

آپ کا بھائی محمد علی

---

۱ مشہور ماہر ترقیات و اسلامیات سر ٹامس آرنلڈ سابق استاد علی گڑھ کالج ۲ کنور محمد اشرف۔ بعد کو ڈاکٹر اشرف
پہلے کانگرس کے اور بعد کے کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر۔

باب (۷۶)

۱۹۲۸ء سنہ(۸)

(ایک بے نوشہ کی بارات ۔ مفلس کی آن)

اگست کا مہینہ تھا کہ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے نہرو کمیٹی کی رپورٹ بحث و منظوری کے لیے پیش ہوئی۔ کمیٹی ہندوستان کے دستور اساسی کے اصول مرتب کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو اس کے صدر تھے ممبروں میں دو مسلمان بھی تھے، ایک شعیب قریشی، دوسرے سر علی امام۔ سر موصوف کو تو غالباً غور و توجہ کی فرصت ہی نہ ملی، اور شعیب قریشی صاحب بھی شاید اپنے کو کمزور پاکر دھیمی ہی آواز میں کچھ بولے۔ کمیٹی نے بہرصورت ایک اصولی مسودہ مرتب کر دیا جس میں مسلم حقوق بڑی حد تک پامال ہو رہے تھے۔ جلسہ کے صدر، سال رواں کے صدر کانگریس، ڈاکٹر انصاری صاحب تھے۔ مسلم اور غیر مسلم اکابر، کانگرسی اور نیشلسٹ خیال کے کہنا چاہیے کہ سب ہی جمع تھے۔ عجب پر بہار مجمع تھا۔ خوب خوب تقریریں ہوئیں۔ ہندو ممبر خوب خوب بولے۔ مولانا شوکت علی شریک ضرور ہوئے، لیکن ایک گوشہ میں، کس مپرسی کے عالم میں بیٹھے رہے۔ سامنے آکر، کھل کر، مخالفت نہ کی۔ یہ حصہ تو محمد علی ہی کا تھا۔ وہ ابھی یورپ سے کہاں واپس آئے تھے۔ جلسہ ساری ہماہمی، ساری گرماگرمی کے باوجود ایک محمد علی

کے وجود کے بغیر سونا سونا رہا۔ ع

بزم میں سب سہی مگر تم جو نہیں، کوئی نہیں!

ہیملٹ کا تماشا گھنٹوں بغیر ہیملٹ کے پارٹ کے ہوتا رہا ۔۔۔۔۔۔۔ بعد کو مسلمان بہت پچھتے پیٹے، کون سنتا تھا۔ فیصلہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ الٹے شوکت علی بدنام ہوتے اور گالیاں کھاتے رہے کہ گورنمنٹ کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ ملک کی ترقی اور آزادی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ برطانیہ کی غلامی پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

محمد علی دیر میں یورپ سے واپس پہنچے۔ ٹرکی، فلسطین، عراق وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے۔ ان ملکوں میں انھیں داخلہ کی اجازت ہی سرکار برطانیہ کی طرف سے نہیں مل رہی تھی بمشکل تمام ملی۔ ابھی کراچی پہنچے ہی تھے کہ پٹنہ میں بہار مسلم کانفرنس کی صدارت کی دعوت پہنچ گئی، اور اس کے معاً بعد کلکتہ میں خلافت کانفرنس کی بھی صدارت کرنا تھی۔ خلافت کانفرنس کا یہ شاید سب سے آخری اجلاس تھا، اس کے بعد پھر کوئی سالانہ جلسہ نہ ہو سکا۔ ع

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

محمد علی اب اپنے قدیم دوستوں اور عمر بھر کے رفیقوں ہی کے ہدف ملامت بن رہے تھے، ڈاکٹر سید محمود، چودھری خلیق الزماں، تصدق احمد خاں شروانی، عبدالمجید خواجہ، جو کل تک محمد علی کے دست و بازو تھے، آج سو فی صدی نیشنلسٹ کی حیثیت سے موتی لال نہرو کے کیمپ میں تھے۔ اور سب سے بڑھکر ڈاکٹر انصاری، جن کی رفاقت محمد علی کے ساتھ اب تک ضرب المثل تھی، آج مخالفین کے ساتھ تھے۔ اور اردو پریس میں تو بدزبانی اور سب و شتم کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ زمیندار اور مہاراجہ محمود آباد میں ایکا تھا۔ مہاراجہ کی مدح و منقبت سرائی

ہو رہی تھی۔ اور محمد علی کا نام ہر قسم کے تبرّا کے لیے وقف تھا ـــــــــــ ایک خبر دو تین ہفتہ قبل یہ آئی تھی کہ مولانا جب کربلا پہنچے ہیں تو وہاں ان پر رقت طاری ہوئی اور کچھ دیر تک روتے رہے۔ مولانا کے سے رفیق القلب شخص کے لیے اس میں کوئی انوکھی بات تھی ہی نہیں، تاہم خبر رساں ایجنسی نے مولانا کی شخصیت کے عظمت کے اعتراف میں اس خبر کو بھی روانہ کرنا ضروری سمجھا۔ ہندوستان میں زمیندار نے اس خبر کا عنوان دیا:

"محمد علی کربلائی رو پڑے!"

جب مولانا دہلی پہنچے ہیں، اور میں حسب دستور فوراً دریا باد سے چل کر دلی آیا تو یہ خبر بھی ان کے گوش گذار کی۔ معاً اور بلا چند سکنڈ تامل کیے بولے" یہ نہ لکھا کہ ظفر علی کرم بلائی ہنس دیے[1]!"

ـــــــــــ اس برجستگی اور حاضر جوابی کے تو وہ بادشاہ ہی تھے۔ غصہ سے بھرے ہوئے ہوں یا رنج میں ڈوبے ہوئے ہوں، یہ زندہ دلی ہر حال میں قائم رہتی۔

ماش کی دھوئی ہوئی دال گھی پڑی ہوئی اور ماش کی کھچڑی خوب گھی کے ساتھ، جاڑوں

---

[1] "کرم بلائی" میں اشارہ ہے "کرم آباد" کی طرف، مولانا ظفر علی خاں مالک "زمیندار" کا وطن ـــــــــــ ۲۶ء تا ۳۰ء کے ظفر علی خاں کو ان ظفر علی خاں سے کوئی مناسبت نہیں جو شروع ۳۱ء میں محمد علی کی موت پر یوں روئے ؎

دلکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی ۔ رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی
زنداں کو جس نے مطلع انوار کر دیا ۔ تابانی اس کرن کی محمد علی سے تھی
سر پہ لپیٹ لیتے ہیں جسکو غزا کے وقت ۔ آرایش اس کفن کی محمد علی سے تھی
توحید کے اصول کی حرمت کے ساتھ ساتھ ۔ ذلت ہر اک وثن کی محمد علی سے تھی

میں محمد علی کی محبوب غذا تھی۔ اب کی بھی قیام دہلی میں کھانے میں آئی محمد علی اپنی خرابیِ صحت کے زمانہ
میں بھی پرہیز کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، اور اب تو یورپ سے صحت ایک حد تک ٹھیک کر کے
لائے تھے۔ اب کھانے پینے میں پرہیز و احتیاط کیا کرتے، خوب آزادی سے ہر چیز کھاتے اور کھلاتے۔
پنجاب کے کوئی اڈیٹر صاحب (خیال ایسا پڑتا ہے کہ مہر صاحب تھے، جو زمیندار سے الگ ہو کر
اپنا روزنامہ انقلاب نکال رہے تھے، اور انقلاب اس وقت ان گنے چنے اخباروں میں
تھا، جو مولانا کا ساتھ اب تک دیے جا رہے تھے۔) مہمان آئے ہوئے تھے۔ مولانا پنجابی صحافت
سے عاجز آ چکے تھے۔ کھانے کی میز پر ان سے کہنے لگے کہ یہ پنجاب کے اخبارات اپنے الگ الگ
نام کیوں رکھتے ہیں بس ایک نام ہر اخبار کے لیے کافی ہے۔ ”پیسہ اخبار“[1]۔ ہر اخبار پیسہ اخبار
ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس پر نمبر ڈال دیا کریں۔ پیسہ اخبار نمبر (۱)، پیسہ اخبار نمبر (۲)“
اس پر ان اڈیٹر صاحب نے بھی خوب لطف لیا۔ اور ہنس ہنس کر تائید ہی کرتے رہے

شوکت علی بیچارہ تنہا اُس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے، جو ہندوؤں میں تو
تمامتر اور مسلمانوں کے بھی ایک بہت بڑے حلقہ میں خلافت کمیٹی کے لیڈروں کی مخالفت میں
برپا ہو چکا تھا۔ محمد علی کا آ جانا انھیں غنیمت کیا، ایک نعمت معلوم ہوا۔ ایک دنیا شوکت علی
کی مخالف تھی۔ حد یہ ہے کہ خاص محمد علی کے اخبار ہمدرد کا بھی رویہ تمامتر ان کی موافقت
و مدافعت میں نہ تھا۔ میں خود تو شوکت علی کا ساتھ دے رہا تھا، لیکن ہمارے نئے منیجر حاجی
ظفر الملک علوی صاحب تمامتر نیشنلسٹ خیال کے تھے۔ اور انچارج اڈیٹر جعفری صاحب کا
کچھ تو ذاتی میلان بھی اُسی طرف رکھتے تھے اور پھر ڈاکٹر انصاری وغیرہ کا بھی دباؤ محسوس کر رہے تھے

[1] لاہور کے ایک مشہور اخبار کا نام بھی ”پیسہ اخبار“ تھا، پہلے ہفتہ وار تھا، پھر سالہا سال، روزانہ ایڈیشن بھی نکلتا رہا۔ اور
پنجاب میں مدتوں بہت مقبول رہا۔ حاجی محبوب عالم مرحوم اس کے اڈیٹر اپنے زمانہ کے بڑے کامیاب لوگوں میں تھے۔

ایک محمد علی ہی کی ذات ایسی تھی جسے حق کے آگے دنیا کی کسی مخالفت و موافقت کی پروا نہیں رہتی تھی۔

محمد علی ہندوستان آگئے، لیکن ہمدرد بدستور میرے ہی چارج میں رہا۔ پرچہ کی پیشانی پر بحیثیت بانی ان کا نام ہوتا تھا، اور بحیثیت نگراں میرا۔ پرچہ کی روش و مسلک سے مولانا بحمداللہ خوش رہے اور یہی مجھے بڑا صلہ اپنی توقع سے زیادہ مل گیا۔ ورنہ دھڑکا برابر یہ لگا ہوا تھا کہ ان کی کڑی نکتہ چینی سے ہم لوگ کیسے بچ سکتے ہیں۔ فرصت و آرام محمد علی کی قسمت میں کہاں تھی۔ یہاں آتے ہی پھر کام میں جُت گئے یا جوت دیے گئے۔ اور کام لینے والے سب سے بڑھ کر ان ہی کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی تھے۔ کوئی کام کسی درجہ کا بھی ہو، سب محمد علی کے سپرد۔ حکم نامہ ان کے لیے موجود۔ بگڑتے، جھنجھلاتے، بلکہ بعض وقت واقعۃً آنسوؤں سے رونے تک لگتے۔ لیکن تعمیل بہرحال کرنی پڑتی۔ شوکت صاحب کے خیال میں محمد علی نہ کبھی تھک سکتے تھے، نہ کبھی بیماری یا اور کسی سبب سے معذور ہو سکتے تھے۔ اور اسی حسن ظن میں شوکت صاحب کے ساتھ ساری قوم مبتلا تھی!

دسمبر میں صحت درست کر کرا کے ابھی آئے تھے کہ کام کا سارا بوجھ پھر سر پر آ پڑا۔ ابھی پٹنہ، ابھی کلکتہ، ابھی پھر دہلی۔ یہاں صدارت، وہاں تقریر، اس سے جھگڑا، اس سے معرکہ۔ آج اس کا جواب لکھنا، کل اس کے مقابلہ میں بیان دینا۔ اور اب طرہ یہ ہوا کہ منجھلی صاحبزادی جن کی شادی ابھی چند ہی مہینے ہوئے مئی ۲۰ء میں ماجد علی خان کے ساتھ ہوئی تھی، وہ بیمار رہنے لگیں اور اندیشہ دق کا پیدا ہو چلا۔ (یاد ہو گا کہ منجھلی صاحبزادی ۲۴ء میں اسی مرض میں گزر چکی تھیں) تشویش ہر باپ کے لیے قدرتی تھی، اور پھر محمد علی جیسے سراپا محبت باپ کے لیے اس پر بھی شوکت صاحب کا، اور ان کی تائید میں صدر خلافت، شفیع داؤدی صاحب کا حکم پہنچا کہ بمبئی میں جو ہندو مسلمانوں میں سخت اور خوں ریز بلوہ ہوا ہے، اس کی پیروی

کے لیے فوراً بمبئی آؤ!

شروع مارچ میں میرا جانا دہلی ہوا تو دیکھا کہ محمد علی ایک طرف تو سرمایۂ خلافت کمیٹی و جامعہ ملیہ کی خاطر اور کسی قدر آرام و تبدیلی آب و ہوا کے خیال سے بھی سفر برما کی تیاریوں میں مصروف، اور دوسری طرف خاص دہلی میں ایک عظیم الشان آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کے اہتمام میں لگے ہوئے ہیں۔ میں وسط مارچ میں حج پر روانہ ہو رہا تھا۔ اسلیے خصوصی ملاقات بھی کرنا تھی۔ محمد علی کے ساتھ ساتھ شریف منزل گیا (اب حکیم اجمل خاں مرحوم کی جانشینی ان کے صاحبزادہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب کر رہے تھے) یہیں ابتدائی کمیٹیاں مشورہ وغیرہ کی ہو رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ اس وقت تک جمعیۃ العلما مولانا کے ساتھ تھی۔ مولوی احمد سعید صاحب وغیرہ جلسہ میں موجود تھے۔ ورنہ تو رفاقت میں ہم ہی چند قدیم نیازمند باقی رہ گئے تھے۔ ۳ یا ۴ مارچ کو میں ادھر واپس آیا اور ادھر مولانا سفر رنگون کے لیے کلکتہ روانہ ہو گئے ساتھ میں بطور سکریٹری کے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (جامعہ والے) گئے۔

مولانا کا سننا تھا کہ الور راج سے مہاراجہ کے بھیجے ہوئے ایجنٹ دہلی وارد ہوئے۔ مہاراجہ کے راج کی جوبلی منائی جا رہی تھی، اور خواہش قدرۃً یہ تھی کہ ہمدرد اس موقع پر الور جوبلی نمبر شائع کرے۔ جس میں مہاراجہ کی تصویریں ہوں، حالات ہوں، وقس ہذا۔ یہ مہاراجہ وہی تھے جو ابھی ابھی ہزارہا ہزار کے مصارف، مولانا کے سفر یورپ اور صحت کے لیے برداشت کر چکے تھے۔ اور مولانا سے گہرا اور خصوصی تعلق خاطر رکھنے لگے تھے۔ ان کے ہاں سے آئی ہوئی فرمائش کو رد کرنا کس کے بس کی بات تھی۔ خصوصاً جب کہ اس اسپشل نمبر کے مصارف طبع وغیرہ بھی ان کے ہاں سے مل رہے ہوں! جعفری صاحب ایڈیٹر کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو بیچارے دلی سے دوڑے ہوئے میرے پاس چلے آئے۔ پرچہ کا باضابطہ نگراں اب تک میں ہی بنا ہوا تھا۔

یک بیک بے نشان و گمان انھیں دریاآباد میں دیکھ میں دنگ ہوا۔ جلدی جلدی انھوں نے صورت حال سے باخبر کیا۔ میں کیا مشورہ دیتا۔ خود ہی حیران رہ گیا۔ نہ قبول کرتے بنتا تھا نہ انکار ہی کرتے۔ آخر میں رائے یہ قرار پائی کہ خود مولانا ہی سے رنگون تار بھیجکر دریافت کیا جائے جعفری صاحب تو گھڑی سواری آئے ہی تھے۔ پہلی ٹرین سے واپس گئے۔ مارچ کی ۱۰ ریا ۱۱ رتھی ۱۳ رکو مولانا کا ایک طویل تار جواب میں موصول ہوا۔

۱۳ رمارچ۔ رنگون۔ بالتصویر جبلی نامہ کی طبع و اشاعت میں مضائقہ نہیں۔ ہمدرد کے خریداروں کے پاس بھیجدیا جائے۔ لیکن خود ہمدرد نے کبھی کوئی خصوصی نمبر شائع نہیں کیا ہے۔ اس لیے ہمدرد کا جوبلی نمبر مجھے پسند نہیں"۔

یہ ظرف بھی محمد علی ہی کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمدرد کو مالی اعانت کی ضرورت قدم قدم پر تھی ادھر مہاراجہ جیسے محسن کی طرف سے فرمائش۔ اس پر بھی ہمدرد کا جوبلی نمبر نکالنا منظور نہیں! زیادہ سے زیادہ اجازت اس کی کہ ایک الگ رسالہ چھاپ کر اس کی تقسیم اشاعت ہمدرد کے حلقہ میں کردی جائے ——— افلاس و احتیاج کے وقت خود داری کو قائم رکھنا محمد علی کا جوہر خصوصی تھا، اور یہ واقعہ اس کی صرف ایک نظیر ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ تو خیر غالب کی شاعری تھی، باقی اس شاعری کو حقیقت میں تبدیل کرکے رکھنا محمد علی جوہر ہی کا کام تھا۔

——— • ———

باب (۷۷)

سنہ ۱۹۲۹ء (۱)

(ہمدرد مرحوم - روز افزوں معذوریاں)

مولانا غریب رنگون میں، بہ قول شخصے ابھی بستر بھی کھولنے نہیں پائے تھے کہ قومی کاموں کے سلسلے میں دہلی اور بمبئی سے طلبی کے حکمنامے پہنچنے لگے، اور برما کی سرزمین پر پورے دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ انھیں دہلی واپس ہونا پڑا ——— اس دوڑ دھوپ میں آرام جیسا ملا ہوگا، ظاہر ہی ہے۔ حالانکہ زیادہ تر اسی آرام وسکون ہی کے خیال سے ڈاکٹری مشورہ سے مجبور ہوکر مولانا نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ قوم وملت کی خدمت کی خاطر ان گنت ذاتی تکلیفیں اٹھاتے رہنا مولانا کے لیے مقدر ہو چکا تھا!

وسط مارچ سنہ ۲۹ء میں میں وطن سے حج کے لیے بمبئی روانہ ہوگیا اور مئی میں مدینہ منورہ میں تھا کہ مدینہ (بجنور) کے ایک پرچہ سے ہمدرد کے بند ہو جانے کی نہایت درجہ اندوہناک خبر ملی۔ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کرتا کیا۔ اور خود مولانا بیچارہ بھی کیا کرتے۔ مسلسل مالی خسارہ کب تک اٹھاتے رہتے ——— کامریڈ، انگریزی ہفتہ وار فروری سنہ ۲۶ء میں بند ہو چکا تھا، ہمدرد، اردو روزنامہ اپریل سنہ ۲۹ء میں بند کرنا پڑا! یہ تھا قوم کی طرف سے قوم کے سب سے بڑے خادم اور سب سے بڑے مخدوم کو عملی صلہ! کوئی دوسرا ہوتا تو تعجب نہیں

جو اتنی ہمت شکنیوں اور حوصلہ فرسائیوں کے بعد اس کا جگر شق ہو جاتا۔ یا کم از کم قومی خدمات کا تو ان کے بعد نام بھی نہ لیتا۔

جون کی ۱۰ر تھی۔ جب میرا جہاز ساحل بمبئی سے آ لگا۔ مولانا شوکت علی، مولوی شفیع داؤدی مولانا عرفان، سب سے گودی ہی پر ملاقات ہو گئی۔ مولانا عرفان سے ملتے ہی میں نے محمد علی کی خیریت دریافت کی۔ (یہ مولانا عرفان اب تک محمد علی کے مخصوص مخلصین میں سے تھے) سفر یورپ سے واپسی وغیرہ کا حال اجمالاً ان سے وہیں معلوم ہو گیا۔ اپنی خیریت سے بھی مولانا کو فوری اطلاع دے دینی ضروری تھی۔ اسی دن تار دے دیا۔ مصارف سفر حج سے بچی بچائی ایک مختصر سی رقم پڑی رہ گئی تھی۔ اسی وقت بمبئی سے مولانا کے نام روانہ کر دی۔ اور خط بڑی لجاجت سے لکھ دیا کہ اس مخلص نیاز مند کی اس نذر حقیر کو رد ہرگز نہ کیجئے گا۔ ورنہ بڑی دل شکنی ہوگی۔"
——— محمد علی کی خدمت کرنا وقت کے سب سے بڑے مجاہد ملت کی خدمت کرنا تھی۔

ڈیڑھ دو دن کے قیام بمبئی میں بہت سی کام کی باتیں (گو بڑی ہی تکلیف دہ) معلوم ہو گئیں۔ ڈاکٹر انصاری (اللہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے) اب علی برادران سے بالکل الگ ہو چکے تھے۔ بیچارہ پر قومیت اسلامیت سے کہیں زیادہ سوار تھی۔ آخر تک ان بھائیوں کا ساتھ دے ہی نہیں سکتے تھے، جو اول بھی مسلمان تھے، اور آخر بھی مسلمان۔ محمد علی کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کا ایک طویل شکایتی و اعتراضی خط انگریزی میں مولانا شوکت علی کے نام آیا تھا۔ جس کا جواب بھی شوکت صاحب نے بڑا مدلل و معقول، انگریزی ہی میں انھیں دیدیا تھا۔ اتنے سنجیدہ اور پر مغز جواب کی شوکت صاحب سے توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال وہ پوری خط و کتابت نظر سے گزر گئی۔ مولانا کی بیمار صاحبزادی حمیدہ بی کی طبیعت میں بھی دل لگا ہوا تھا۔ یہ سن لیا تھا کہ حالت اور گرتی ہی جاتی ہے۔ مولانا اب دہلی میں بے گھر تھے۔ کوچہ چیلان

کا قدیم، وسیع وشاندار مکان جس میں ہمدرد کا مرڈیکا دفتر، پریس وغیرہ سب کچھ تھا، وہ اب ہاتھ سے نکل چکا تھا، شاید اس کا کچھ کرایہ بھی مولانا کے ذمہ باقی رہ گیا تھا، اور مولانا اب وہاں سے بہت دور اپنے داماد ماجد علی خاں کے مکان، مقام راجپور روڈ پر مقیم تھے۔ یہ اپنا انجینیری کا کچھ کاروبار کسی کی شرکت میں کرتے تھے۔ اور اب ان کا کارخانہ بھی بگڑ جاتا تھا۔ بیوی کے علاج میں خاطر خواہ صرف کرنے سے معذور تھے۔ اور اس کا بار بھی ایک حد تک مولانا ہی پر پڑ رہا تھا۔ آنکھوں کی بینائی مولانا کی اور زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ حالانکہ سن ابھی ۵۰-۵۱ سے زیادہ نہ تھا۔

بمبئی سے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے دریاباد پہنچتے ہی فکر یہ ہوئی کہ ایک احرام سفر، بیمار اور معذور، مظلوم اور دکھیارے مولانا کی عیادت و مزاج پرسی کی خاطر دہلی کے لیے جلد سے جلد بندھے۔ عین اسی وقت یہ والانامہ صادر ہوا جو ابھی آ رہا ہے۔ ایک قرن گزر جانے کے بعد آج یہ خشک اور بے جان سا معلوم ہوگا۔ اس وقت اس میں جان تھی۔ اور ایک ایک فقرہ میں سوز تھا، درد تھا، تڑپ تھی، اور بے کسی کی پوری پوری داستان تھی۔

"۲۰ / جون ۱۹۲۹ء ۲۵ راجپور روڈ۔ دہلی۔

پیارے ماجد میاں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

زہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

الحمد للہ کہ آپ بھی اس سعادت کو حاصل فرما کر اعزا و احباب میں آ کر شامل ہو گئے۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ گیا ہوتا۔ مگر دیکھیے اب یہ سعادت کب نصیب ہوتی ہے۔

سنہ ۱۳۴۵[1] سے اس وقت تک ہزاروں لاکھوں گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے چکا ہوں، اور اب قوی بعد شقی القلب ہو چکا ہوں، کاش پھر میدان عرفات میں سہ پہر کو بیٹھ کر دل کو بخشش کی امید دلاتا سے بھرتا۔ اور کاش پھر دیار حبیب پہنچکر مولد سے مدفن مبارک کی طرف روانہ ہوتا اور روضۂ پاک پر ندامت کے آنسو بہاتا۔ اور پھر گھنٹوں وہاں بیٹھ کر آپ کی مدینہ منورہ کی ساری زندگی کا تصور کرتا اور قلب مضطر کو مسرور کرتا اور بعض وقت باوجود اس ادب کے جس نے مزار مبارک کے پردے کو بھی اپنے گندے ہاتھ نہ لگانے دیے۔ پھر ایک بار عرض کرتا کہ ؎

دیکھیے گا آج بھی دیدار سے محروم ہمیں — تھی جو ایک حسرت پابوس بدستور ہے آج

رقص بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجیے — حسن مسئول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج

عشق خود بدعت و سرمایۂ صد بدعت ہے — رحم کر رحم کہ عاشق ترا معذور ہے آج

اپنے والدین، بھائیوں اور بہن اور [2] کے لیے اور دوسرے اعزا و احباب نیز اپنے پیرومرشد[3] کے لیے دعائے مغفرت کرتا۔ حمیدہ[4] کی صحت کا سوال کرتا۔ نیز اپنی صحت کے لیے بھی عرض کرتا اور ان سب سے پہلے اور سب کے بعد بھی مسلمانان عالم اور بالخصوص ہندوستان کے اس مہلک انتشار اور ان کی بے فکری کو دور کرنے کے لیے گڑگڑاتا۔ مگر یہ نصیب کہاں۔ نہ معلوم اب کب جانا ہوتا ہے۔ شریف حسین ہی کے قبضہ کو میں قبضۂ دشمن سمجھتا تھا اور جب موسم حج آتا تھا یہ کہہ کر دل کو سنبھالا کرتا تھا کہ ؎

کیا جاؤں کوئے یار میں یوں اذن غیر سے

ہے انتظار دیکھیے کب تک بلائے دوست

[1] مولانا کا سال حج [2] مولانا کی محبوب لڑکی متوفیہ سنہ [illegible]۔ مولانا کی ہمشیرہ کا انتقال بھی حال ہی میں ہوا تھا۔

[3] یعنی مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ [4] مولانا کی منجھلی لڑکی اس وقت بیمار و صاحب فراش۔

ویار حبیبؓ کے متعلق ہزاروں سوال کرنا ہیں۔ مگر اس کے لیے تحریر بے فائدہ ہے۔ جب وعدہ
تشریف لائیے اور سب کچھ سنائیے۔ افسوس کہ نہ آپ کے جاتے وقت بمبئی پہنچ سکا نہ آپ کی
واپسی پر آپ کا خیر مقدم کر سکا۔ جو حالات ہیں ان کو بالتفصیل شوکت صاحب کو لکھ چکا ہوں
اس لیے کہ بظاہر وہ اب تک ان سے بے خبر تھے۔ دو دن صرف کر کے اہم صفحے کا خط لکھا نہ
معلوم وہ آپ کو دکھایا گیا یا نہیں۔ یا عرفان صاحب سے آپ کو یہاں کے حالات کا پتہ چلا۔
ہیں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اہم صفحے کا خط بھی بیکار گیا۔ اس لیے کہ شفیع داؤدی صاحب کا عجیب
وغریب خط آیا ہے کہ آپ کی پریشانی سے سخت تشویش ہے کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔ یہاں
آیئے تو سوچیں۔ وہاں گرمی بھی سخت ہے۔ یہاں بارش ہو گئی ہے۔ اگر حمیدہ اور بیگم صاحبہ
نہ آسکیں تو آپ ہی چلے آیئے۔ شوکت صاحب سخت پریشان ہیں۔ میں نے انھیں کہتے
سنا ہے کہ I am collapsing now. جو اس سے پہلے کبھی ان کی زبان
سے کسی نے نہیں سنا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ فسادات بمبئی کی کمیٹی شہادت لے رہی ہے میں
سب سے کہتا تھا کہ ایک محمد علی ان سب کے لیے کافی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جس کے معنی یہی ہیں کہ
بمبئی آکر فسادات بمبئی کی کمیٹی کے سامنے شہادت دو، اور شہادتیں دلواؤ۔ لیکن کوئی یہ نہیں
سمجھتا کہ میں بھی کبھی معذور ہو سکتا ہوں اور آج اپنی علالت نہ سہی حمیدہ کی علالت کے ہی
باعث معذور ہوں۔ آمنہ مرحومہ کی علالت کی تشخیص ہو چکی تھی۔ علاج تجویز ہو چکا تھا۔ تیمارداری
کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ کر کہاں نہیں گیا؟ جب اس کی آخری گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ اس
وقت بھی مصطفیٰ کمال کو بھیجنے کے لیے ایک طول طویل تار کا مسودہ تیار کر رہا تھا۔ اور
الغائے خلافت کو لڑکی کی موت سے کہیں زیادہ اہم شے سمجھتا تھا۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے
کہ اب تک مرض ہی کی تشخیص نہ کر سکا تھا۔ اس لیے کوئی علاج مفید ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اب

بخار روز ۱۰۲ - ۱۰۳ - ۱۰۴ - ۱۰۵ اور اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہر وقت متلی ہوتی ہے، نہ غذا
ٹکتی ہے نہ دوا۔ نقاہت کا یہ حال ہے کہ دوا پینے کے لیے اٹھنا بھی محال ہے۔ آج اس ڈاکٹر
سے رجوع کرتا ہوں کل دوسرے سے، پرسوں تیسرے سے۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر، حکیم، وید
کوئی نہیں چھوٹا۔ ملیریا، دق Baccillus coli نسوانی امراض ہر ایک کے متعلق
امتحان ہو چکا، اور ایک چیز نہ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری اور مولوی عبدالقادر قصوری
(کارفرما پنجابی ٹولی وسرگروہ وہابیان) کے بھتیجے ڈاکٹر محمد جنید قریشی نے سب جتن کر دیکھے
اور مجبور ہو کر کہا کہ اب سول سرجن سے آزاد رائے طلب کرو۔ چنانچہ ان کو دکھایا گیا اور
صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی۔ سو انھوں نے احتیاطاً اس کی بھی فرمائش کی یعنی X Ray
سے آنتوں کا امتحان۔ لیڈی ہارڈنگ زنانہ اسپتال میں بھی اس کا سامان موجود تھا، مگر
سنا گیا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر جو تصاویر لیتی ہیں، گرمیوں میں رخصت پر چلی گئی ہیں۔ اس لیے مجبوراً
سول اسپتال میں حمیدہ کو لے جا کر تصاویر کھنچیں۔ ہسپتال نہایت ہی گندہ اور تکلیف دہ
مقام ہے۔ کوئی کمرہ ایکس رے کے کمرے کے پاس ایسا نہ تھا جہاں مریضہ بارہ تیرہ گھنٹے رکھی
جا سکے۔ خوشامد اور کسی قدر سختی دونوں کے استعمال سے ایک کمرہ Nurses quarters
میں سول سرجن سے کہہ کر لیا۔ اور ۸ بجے صبح کو ایمبولنس کار میں ڈال کر حمیدہ کو سول ہسپتال
لے گیا۔ خود نماز فجر کے بعد ہی سے گیا ہوا تھا۔ تب جا کر اس کمرے کو صاف کرایا، دھلوایا
خس کی ٹٹی وغیرہ کا انتظام کروایا۔ (پہلے Lumber room کا کام دیتا تھا)
پنکھا لگوایا۔ دودھ، ڈبل روٹی میں Bismuth ملا کر ہزاروں دقتوں سے
حمیدہ کو کھلایا گیا۔ ہر وقت متلی کا خوف تھا۔ ایک معجزہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی وقت سب کچھ
نہ ڈال دیا گیا۔ اس لیے کہ جو غذا مرغوب ترین ہوتی تھی وہ تک اسی طرح ڈال دی جاتی تھی۔

مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس دن اس وقت نہ ڈالا۔ ایک تصویر اس وقت لی گئی۔ دوسری ایک بجے دوپہر کو۔ تیسری پانچ بجے اور چوتھی رات کے آٹھ بجے۔ اس کے بعد حمیدہ کو لے کر ہم لوگ اس کوٹھی پر جو ماجد[1] نے ا؍مئی سے ڈاکٹر اشرف کے ولایت جانے پر ان سے پانچ ماہ کے لیے کرایہ پر لی ہے، چلے آئے۔ دوسرے دن صبح کو ۸ بجے پھر ہسپتال گئے۔ اور پانچویں تصویر کھنچوائی۔ ان تصاویر سے پتہ چلتا ہے کہ غذا کتنی دیر تک آنتوں میں گھومتی ہے۔ پانچ بجے کے بعد دودھ کی برف دی گئی تھی۔ وہ آدھ گھنٹے کے بعد ڈال دی گئی اور متلی پھر ہر روز کی طرح ہوتی رہی۔ ڈاکٹر نعیم انصاری[2] نے جو ابھی دہرہ دون میں ایکسرے کا کام سیکھ رہے تھے کہا کہ یہ تصاویر اچھی نہیں ہیں، اور تقریباً سو روپیہ بیکار ضائع ہوا۔ سول سرجن ان کو ناقص تو نہیں بتاتے، مگر ان سے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ البتہ گمان کرتے تھے کہ آنتوں میں دق ہے۔ نعیم انصاری کی صلاح تھی کہ دہرہ دون میں پھر تصاویر لیجائیں۔ مگر جس دن یہ تصاویر لی گئیں۔ اسی دن سول سرجن نے احتیاطاً Baccilus coli کے امتحان کے لیے پھر قارورہ بھجوایا تھا اور گورنمنٹ کے Analyst کی رائے ہے کہ Baccilus coli کی Cullural Growth ہوئی حالانکہ اواخر مارچ میں ڈاکٹر مبین نے قارورہ کا امتحان کیا تھا تو باوجود ڈاکٹر انصاری کے گمان کے رپورٹ کی تھی کہ Cultural Growth نہیں ہوئی اور یہ بیسی لس موجود نہیں ہے، اس رپورٹ کے بعد علاج میں بالکل کایا پلٹ ہو گئی ہے اور اب پھر Baccilus coli کا علاج جاری کیا گیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر انصاری اور قریشی اس علاج کو چھوڑ چکے تھے،

---

[1] ماجد علی خاں حمیدہ بی بی کے شوہر [2] مولانا کے ایک مخلص ساکن انبہٹہ (ضلع سہارنپور) مدتوں لکھنؤ میں مطب جاری کیا پھر خدا معلوم کہاں کہاں گھومے۔ آخر میں کئی سال حیدرآباد میں گذارے۔ اس وقت غالباً پاکستان میں ہیں۔ ۱۹۵۳ء

اب اسی قارورہ سے Vaccine تیار ہو رہا ہے۔ اور چار پانچ روز کے بعد مل جائیگا۔ تو ٹیکے لگوانے شروع کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری نے پہلے پہاڑ پر جانے سے روک دیا ورنہ اپریل ہی میں منصوری بھیج دیا ہوتا۔ مگر اب تاکید ہے اور سول سرجن زور دے رہا ہے۔ ماجد بیچارہ صفدر علی صاحب قدوائی کے .... کے باعث سخت پریشان ہو۔ حکیم کے سامنے مقدمہ ہو رہا ہے اور کوئی امید تصفیہ کی نہیں۔ اور انھون نے سب ریاستوں کو لکھ کر ملبوں کی ادائگی رکوادی ہے۔ خود وقتاً فوقتاً اپنے لیے، اپنی بیوی بچوں کے لیے اور نیز اپنی ایک .... تک کے لیے رقمیں لیتے رہے مگر اب Material suppliers کی Bills ماجد کی فرم کے نام آرہی ہیں۔ اور چار پانچ روز سے سخت تقاضے ہو رہے ہیں اور روپیہ ہر جگہ بند پڑا ہے۔ وہ مارا مارا پھرتا ہے اور میں بھی کوچہ چیلا ن میں اپنا بندھا بندھایا سامان چھوڑے ہوئے یہاں تیمار داری کرتا ہوں اور رات کو پہرہ دیتا ہوں۔ اب پہاڑ بھی مجھ ہی کو جانا پڑے گا۔ یہاں میں مکان تبدیل کرنا چاہتا تھا مگر پریس کو اکھڑوانا ناممکن ہے۔ اس کی فروخت کی اجازت ڈبنچر ہولڈرز سے لینا ہے اور پھر فروخت کرانا ہے۔ مگر مالک مکان صرف پریس کا حصہ کرایہ پر پہلے کی طرح نہیں دیتے اور وہابیت میں مست مجھے گھر سے نکال رہے ہیں[1]۔ مگر میرا نکلنا آسان نہیں۔ پریس کو کہاں لے جاؤں؟ کل وکیل کی معرفت ان کا نوٹس آیا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں خالی کردو۔ یہ تو تھا ہی۔ اب منصوری میں مکان کی تلاش ہے اور اگر وہاں گیا تو پریس کو فروخت کون کرے گا؟ ان حالات کو پیش نظر رکھیے اور شفیع داؤدی صاحب کی اس تدبیر کو سوچیے کر

---

[1] کوچہ چیلان کے اس مکان میں ہمدرد کا قریہ کا ویع پریس اب تک موجود تھا۔ اس کے مالک ایک اہلحدیث صاحب تھے۔ اور اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا سنہ ۱۹۲۶ء سے اہل حدیث جماعت میں مبغوض ہو گئے تھے۔

اس لڑکی کو یوں ہی چھوڑ کر بمبئی چلے آؤ اور فسادات بمبئی کی شہادتیں دلواؤ۔

میری صحت اب ایسی ہے کہ مجھ کو بھی اب زندوں میں نہ سمجھیے۔ اس پر بھی آریہ سماج راجپال[ل] کے قتل کے بدلہ میں مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور ابھی لاہور سے اس Red Latter کے لونڈیہار نے ایک Carbon Paper Copy ارسال فرمائی ہے کہ چونکہ تم نے علم دین[ل] کی مدد نہیں کی ہے اس لیے ہم تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔ دونوں پاؤں بیکار ہیں اور روز حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ بائیں آنکھ پر پانی آ رہا ہے اور Catract[ل] بن رہا ہے۔ ہاتھوں میں لکھتے وقت اور یوں بھی احساس کی کمی ذرا ذرا سی معلوم ہوتی ہے۔

سب سے آخر میں رزق کا سوال ہے اور نہیں جانتا کہ جو روپیہ آج ہے اس کے ختم ہونے پر کہاں سے آئے گا۔ چاہتا تھا کہ ایک سال کے لیے قوت لایموت کا سامان ہو جائے تو ایک کتاب انگریزی میں اور ایک اردو میں اسلام پر لکھوں[ل]۔ پچھلے سفر کے حالات اس سے پہلے لکھ ڈالوں اور کچھ روپیہ سال بھر کے لیے کما لوں مگر ....

برما سے واپسی پر مولانا.......... صاحب ایک.......... پر لٹو ہو گئے۔ رنگون ہی میں جھیل کے کنارے بیٹھ کر حسن پرستی اور غزل گوئی کیا کرتے تھے۔ اب تو جہاز پر تغزل کا زور و شور تھا۔ ان ہی کی طرح میں مجھ سے دو شعر زبردستی نکل آئے۔ ان ہی سے میری حالت کا اندازہ

[ل] لاہور کے ایک آریہ سماجی کتب فروش راجپال نامی نے رسول کریم کی شان میں ایک نہایت گستاخانہ کتاب لکھ ماری تھی، مسلمان قدرۃً سخت مشتعل ہوئے، اور ایک پرجوش پنجابی علم الدین نے جا کر اس گندہ دہن کو قتل کر ڈالا۔ مقدمہ چلا اور فیصلہ وہی ہوا جو غیر اسلامی قانون اور غیر اسلامی عدالت کو کرنا ہی تھا، اب مولانا کی قوم کے لوگ اپنے مولانا ہی سے بیزار ہونے لگے کہ انھوں نے علم الدین کو بچانے کی کوشش کیوں نہ کی [ل] موتیا بند [ل] انگریزی میں مسودہ گو بہت ہی ناقص صورت میں بعد کو نکل آیا اور My life: A Fragment کے نام سے جوں توں شائع بھی ہو گیا، لاہور کے شیخ محمد اشرف کے ہاں سے۔

کر لیجیے۔ وہ یہ ہیں:

ہوا محسوس جب سے ہے خوشی تیری خوشی اپنی نہ اپنی موت موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے اسے بے چارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

آپ کا تار آتے ہی گمان ہوا کہ آپ اسی دن یا دوسرے تیسرے دن بچیوں کو لینے حیدرآباد جا رہے ہوں گے۔ اس لیے تار کا جواب نہ دیا۔ اب بیمہ کے ساتھ .... اور خط ملا۔ حیران ہوں کہ رسید کہاں بھیجوں اور اس عطیہ کی شکایت اور پھر شکریہ کس پتہ پر ارسال کروں۔ جب ہمدرد[1] کے آخری پرچہ کی طلبی کا کارڈ لکھنؤ سے آیا تو معلوم ہوا کہ آپ دریاباد جا رہے ہیں۔ آج .... وقت نکال کر بڑی مشکل سے یہ خط لکھا ہے، اور دریاباد بھیج رہا ہوں۔ کارڈ جعفری کو بھجوا دیا۔ اور تاکید کر دی کہ اس کی تعمیل کر دو۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ دفتر کا سارا سامان پریس کے حصہ میں بند پڑا ہے۔ کل نماز جمعہ کے لیے شہر جاؤں گا تو کوشش کر کے اپنے فائل میں دیکھوں گا کہ شاید اسی میں اوپر وہ پرچہ مل جائے مگر ؎

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

آپ نے روپیہ کیوں بھیجا؟ خدا گواہ ہے کہ صرف اس خیال سے کہ آپ برا مانیں گے۔ اسے واپس نہیں کیا۔ حمیدہ بی کو اسی وقت دے دیا۔ مگر وہ اور ان کے شوہر بھی واپس کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے روکا ہے۔ اگر آپ مجھ سے دوستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدا را یہ ہرگز نہ کیجیے۔ ہاں جب ضرورت ہوگی اور میرے مصارف آپ سے کم ہوں گے تو ضرور منگوا لیا کروں گا۔

[1] ہمدرد میری اس سفر حج کی غیر حاضری ہی کے زمانہ میں بند ہوا تھا۔

شکایت کے بعد شکریہ بھی قبول ہو۔ جمن بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ بچیوں کو پیار۔
خدارا جلد آؤ۔ اگر منصوری گیا تو وہاں بلاؤں گا۔ جس میں اور زحمت ہوگی۔ اگر یہیں آجاؤ
تو کیا اچھا ہو۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور سننے کو کان۔

لیجئے، ابھی خط ختم کیا تو صفحات بے ترتیب ہوگئے اور پاؤ گھنٹہ میں ترتیب دے سکا۔
اور ابھی اطلاع ملی کہ حمیدہ کا بخار بہت بڑھ گیا اور جاڑا آگیا۔ دعا کیجئے، خدا رحم کرے۔

آپ کا دلدادہ محمد علی

باب (۷۸)

۱۹۳۹ء (۲)

بکوئے عاشقی از عافیت نشاں نہ دہند
بآں کسے کہ براہ ایں دہند آں نہ دہند

جون کی کوئی تاریخ، وسط ماہ کے بعد کی ہے، اور میں دلی براہ مرادآباد پہنچا ہوں، اتفاق سے لکھنؤ سے ریل پر ساتھ اپنے ایک نامور ہمنام اور محمد علی کے مخلص مولانا عبد الماجد بدایونی[ل] کا ہوگیا۔ اور بریلی تک رہا۔ وہ بدایوں جارہے تھے۔ خوب باتیں رہیں۔ اب وقت وہ ہے کہ جمعیۃ العلماء والے بھی ایک ایک کرکے مولانا کی رفاقت سے کٹ رہے ہیں۔ یہی ایک پارٹی رہ گئی تھی۔ جو اب تک ساتھ دیے جارہی تھی۔ لیجئے اب وہ بھی الگ ہوگئی۔ اور محمد علی حق کی خاطر ایک ایک سے کٹ کر، ایک ایک سے لڑکر، اکیلے اپنے اللہ کے ہوچکے تھے ـــــ جس نے یہ شعر کبھی تخئیل کی دنیا میں کہا تھا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اس کی شاعری واقعات کی دنیا، اور عمل کے عالم میں جانچی، پرکھی جارہی تھی!

[ل] بڑے خوش تقریر اور ایک زبردست خطیب تھے۔ انتقال اواخر ۱۹۳۱ء میں فرمایا۔

صبح کاذب کے وقت دہلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ کوچہ چیلان کا مکان ہی نہیں، راستہ تک مانوس و محبوب تھا۔ بارہا پیدل بھی آ جا چکا تھا۔ آج ایک نامانوس و غیر معروف مکان تک راستہ پوچھتے پاچھتے پہنچنا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحب اسٹیشن پر واقف کار مل گئے ان کی رہنمائی سے نمبر ۲۵۔ راجپور روڈ پر پہنچا ——— یہ کوٹھی مسلمانون کے محبوب لیڈر اور نامور ایڈیٹر کی نہیں، ایک معمولی شہری کی ہے، اور محمد علی اس کے ہاں بہ طور مہمان کے ٹھہرے ہوئے ہیں! رام پور کے گلی کوچوں کو، اپنے مکان کے در و دیوار کے دیدار کو تو برسوں سے ترسے ہوئے تھے ہی، اب دہلی میں بھی کوئی ٹھکانا رہنے کو نہ رہ گیا! غریب الوطنی در غریب الوطنی!

اب سویرا ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ ابھی پلنگ ہی پر تھے۔ محمد علی غریب میرے انتظار میں تصویر اشتیاق بنے ہوئے۔ بڑھ کر لپٹ گئے۔ خوب لپٹائے رہے ——— آہ، وہ ان کے معانقہ کی گرمجوشی جس کی گرمی کی یاد آج تک تازہ ہے!

اتفاق سے آج ہی محمد علی کے مقدمہ کی پیشی ہے، عدالت دیوانی میں، سب جج کے ہاں! مقدمہ کیسا؟ مقدمہ گورنمنٹ کی طرف سے نہیں، کسی ہندو یا آریہ سماجی کی طرف سے نہیں۔ اپنے ہی ایک مل مدیث بھائی کی طرف سے، تخلیۂ مکان کی بابت[1]! عدالت کا وقت آیا۔ اور مولانا چلے۔ کوئی وکیل اور پیروکار بھی نہیں۔ صرف یہ خاکسار ساتھ، اور ایک نوجوان اور جو شاید الامان (مرحوم) کے رپورٹر تھے۔ نیشنلسٹ پریس تو اس وقت تک مولانا کا بائیکاٹ کر ہی چکا تھا۔ ساتھ دینے والے اخبار وہی چار رہ گئے تھے۔ انقلاب (لاہور)، الامان (دہلی)، وغیرہ۔ پہلی بار دہلی کی عدالتِ دیوانی کا منظر دیکھنے

---

[1] اس کا ذکر ابھی پچھلے ہی باب میں گزر چکا ہے۔

میں آیا۔ گواہوں، مدعیوں، مدعا علیہوں، پیروکاروں کے اس انبوہ عام کے درمیان عام مقدمہ والوں کی طرح گھستا اور پلٹتا ہوا، یہ مسلمانانِ ہند کا سردار و پیشوا! ——— وقت یہ تھا کہ عبرت کو خود اس پر رحم آجاتا!

ہجوم سے نکل کر ایک مرد مسلمان قریب آئے۔ اخلاص کے پتلے۔ دہلی کے عام مسلمانوں کے جان نثار اور مولانا کے خاص نیاز مند۔ نام مولوی عبد اللہ تھا (''آٹے والے'' بھی غالباً جزو نام تھا) جھک کر اور کمال نیاز کے ساتھ صلح و مصالحت کے راستے سمجھاتے رہے۔ لیکن مصیبت پر مصیبت یہ تھی کہ مولانا اپنے کو مظلوم و قابل ہمدردی سمجھتے کب تھے! اسوقت بھی یہی فرماتے رہے کہ ''میں کسی سے رحم کا طالب نہیں، میں ان کٹر غیر مقلدوں کی قلعی پوری طرح عدالت میں کھول کر رہوں گا۔ اور دکھادوں گا کہ دعویٰ دائر کرنے میں کتنا دخل اس کینہ کو ہے جو ابن سعود کی حمایت میں میرے ساتھ برتا جارہا ہے''۔ وہ مرد مسلمان بیچارا سر پٹختا رہا، اور عدالت میں پکار ہوگئی۔ اجلاس کے اندر فریق مخالف کے وکیل مولانا کے ساتھ عزت سے پیش آئے، اور مصالحت کی گفتگو کرتے رہے۔ حاکم عدالت (مسلمان ہی معلوم ہوتے تھے) نے بھی خاصی توجہ و التفات مولانا کے ساتھ صرف فرمایا۔ اور مولانا تقریر دو ہی چار منٹ کرنے پائے تھے کہ پیشی آئندہ کے لیے ملتوی ہوگئی ——— کوئی ایک مصیبت ہو تو بیان کی جائے، شدید قرضداری، شدید جسمانی بیماریاں، شدید دماغی افکار، محبوب لڑکی کی علالت، ذاتی مصیبتوں سے لے کر قومی و ملی مصیبتوں تک کون سی بلا تھی جس کی شکار یہ ایک ذات نہیں ہو رہی تھی! ؎

ہو رہے تھے جور ہفت افلاک کے ——— امتحاں تھے ایک مشت خاک کے

گھنٹوں اپنا دردِ دل سناتے رہے۔ مجھ سے سوالات جو کیے، وہ زیادہ تر حج وزیارت ہی کے سلسلہ کے تھے۔ مکہ، مدینہ، عرفات، جدہ، جہاز وغیرہ کے ایک ایک حال اور انتظام کو پوچھتے رہے۔ حجاز کی فلاح و بہبود ان سے زیادہ کس کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ اور ستم یہ تھا کہ سلطان حجاز کی مخالفت کی بنا پر خود حجاز کے مخالف سمجھے جا رہے تھے! رات کو میرے ہزار نہیں نہیں کہنے پر بھی، خود ہی پہنچانے اسٹیشن تک آئے! ——————

کون جان سکتا تھا کہ یہ اسٹیشن تک کی ہم سفری، موٹر کی مدت تک انکی آخری ہم سفری ہوگی!

گھر پہنچا ہی تھا کہ کسی ذریعہ سے خبر ملی، کہ حمیدہ بی کی علالت بہت زیادہ شدت پکڑ گئی۔ اور مولانا کو جس طرح بھی بن پڑا، سب کو لے لوا کر منصوری جانا پڑا۔ خبر سنکر سناٹے میں آگیا۔ ہا! کیسی کچھ زحمت ہوئی ہوگی۔ کوچہ چیلان والے مکان میں برسوں سے سکونت تھی۔ اتنا بڑا لق ودق مکان خالی کرنا، اس سے سارا سامان اٹھوا کر کئی میل کے فاصلہ پر قرول باغ کے نئے مکان میں لے جانا، مولانا جیسے شخص کے لیے کس قدر مصیبت کا باعث ہوا ہوگا، خصوصاً جب کہ وہ خود بیمار، زار ونزار، اور لڑکی اتنی شدت سے علیل۔ پھر نہ کوئی ملازم و خدمت گار، نہ بھانجوں بھتیجوں میں سے کوئی موجود، اور دفتر کے اہلکاروں میں سے کوئی کیوں ہونے لگا تھا، جب سرے سے اب ان کے کسی دفتر ہی کا وجود نہ تھا۔ منصوری پہاڑ کے سفر کا مرحلہ، ایسے نازک مریض کو ساتھ لیے ہوئے اس سے بھی سخت تر! سہارنپور میں گاڑی الگ بدلی جاتی ہے۔ شاید پورا درجہ رزرو کرا لیا ہو، جو دیرہ دون ٹرین میں کاٹ کر لگا دیا جائے گا، لیکن اس کے لیے مصارف کس کے گھر سے ہم پہنچے ہوں گے۔ بہر صورت کتنی طوالت کتنی مشقت، تعب اور کتنی زیر باری کا سامنا کرنا پڑا ہوگا! ان ہی خیالات سے متاثر ہو، منصوری خط لکھا، اور دوبارہ لکھا، سہ بارہ لکھا۔ سب سے زیادہ دل حمیدہ بی

کی صحت ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ خدا معلوم کیا حال ہو، اور محبت کے مارے ہوئے باپ پر کیا گذر رہی ہو۔

آخر خدا خدا کرکے وسط جولائی کے بعد جواب آیا۔ خیریت نامہ نہ تھا۔ مکتوب پریشانیوں کی ایک پوٹ تھا۔ پڑھ کر حسرت میں اور اضافہ ہی ہوا۔ بہر حال جیسا بھی تھا، درج ذیل ہوتا ہے۔

---

۲۵ جولائی ۲۹ئہ۔ البرٹ لاج منصوری۔

برادر محترم مکرم حاجی الحرمین الشریفین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپکے خط پیہم آرہے ہیں۔ کارڈ آرہے ہیں اور یہاں سے ایک حرف بھی جواب میں نہیں جاتا۔ پہلے آخری بات سنیے۔ پھر ابتدائی مراحل طے کروں گا۔ ڈاکٹر انصاری وسول سرجن اور ڈاکٹر بجر اور ایک لیڈی ڈاکٹر مسنر ڈالٹن نے خوب دیکھ لیا۔ اور آخری جواب دے دیا۔ صرف مجیب الدعوات کے جواب کا انتظار ہے۔ اسی لیے نہ بمبئی جاسکا نہ اس وقت تک دہلی جاسکوں گا۔ جب تک مجھے اپنے "حکیم" سے جواب نہ مل جائے۔ دن رات ہم لوگوں کو مریضہ کی چارپائی کے پاس ہی گذر رہے ہیں۔ جس کو جس وقت کچھ سونے کو مل جاتا ہے سو لیتا ہے۔ ایک انگریزی نرس دن بھر رہتی ہے مگر "باثر" نہیں۔ مجھی کو اصرار کرکے دوا (حقیقتاً دوا نہیں بلکہ غذا، اس لیے کہ اب یہی دوا رہ گئی ہے) پلانا پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ ایک طرف سے شوکت صاحب بمبئی کسی ملکی یا ملی کام کے لیے بلاتے ہیں، دوسری طرف شفیع داؤدی صاحب سے تقاضا کرایا جاتا ہے۔ تیسری طرف سیٹھ سلیمان ٹھٹھا[1] اسی پر اصرار کرتے ہیں اور مجھے میرے اسلامی فرائض یاد کرائے جاتے ہیں۔ اس وقت

---

[1] مسلمانان بمبئی کے ایک عوامی لیڈر۔

بظاہر میرا اسلامی فرض یہی ہے کہ مریضہ کی پٹی کے پاس بیٹھوں۔ برادرم کیا کہوں بعض وقت نماز تک قضا ہو جاتی ہے۔ اس لیے براہ کرم آپ منصوری تشریف لائیے۔ میرے دہلی جانے کا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے میں سہارنپور[1] کو لکھنے والا ہی تھا کہ کارڈ ملا کہ دریاباد ہی کو خط لکھو چنانچہ دریاباد کو لکھ رہا ہوں۔

اب ابتدائی مراحل سنیے۔ ڈاکٹر انصاری اور قریشی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا (پہلے Boccilus coli کا پھر آنتوں کی دق کا علاج کیا تھا) تو انھوں نے کہا کہ اب سول سرجن سے رجوع کرو اور اس کو آزادانہ رائے قائم کرنے دو، اس نے بھی کوئی رائے نہ قائم کی بلکہ کہا کہ ہر چیز کا تو تم امتحان کرا چکے ہو۔ آنتوں کی تصویریں بھی لوا لو۔ اس لیے بڑی سخت محنت اور گفت و شنید بلکہ تہدید کے بعد نیم انگریز نرسوں کے کمروں میں ایک کمرہ گودام کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ وہ ملا اور دھوپ اور لو میں پچاس گز اسٹریچر پر اسے ایک نہایت ہی تنگ مردوں سے گھرے ہوئے Private Room سے اسے x-ray کے کمرے میں لانا پڑتا۔ سخت محنت کے بعد اس کو صاف کرایا۔ اس میں پنکھے اور خس کی ٹٹی کا انتظام کرایا گیا۔ سب سے مشکل مریضہ کو وہ دودھ ڈبل روٹی کھلانا تھی۔ جس میں Bismuth بہت سا ملایا گیا تھا تاکہ تصاویر میں دیکھا جا سکے کہ چار چار گھنٹے کے بعد کھانا کس کس جگہ نظر آتا ہے۔ رو رو کر مریضہ نے کھانا کھایا۔ خدا کا بڑا شکر تھا کہ کھاتے ہی ڈال نہ دیا۔ اس لیے کہ روز یہی ہو رہا تھا۔ بہر حال تصاویر اس دن صبح کو آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک لی گئیں۔ اور ان تمام پریشانیوں اور دقتوں کے بعد نعیم انصاری نے ان کو

---

[1] سہارنپور میں میرے بھائی صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ والدہ ماجدہ مرحوم بھی زیادہ تر ان ہی کے ساتھ رہتی تھیں اور میرا بھی جانا آنا وہاں اکثر ہوتا رہتا تھا۔

دیکھ کر کہا کہ بیکار ہیں سول سرجن نے تو کوئی خرابی ان میں نہ بتائی۔ مگر مرض کے متعلق مذبذب تھے
Baccilus Coli کے لیے قارورہ کا امتحان اواخر مارچ میں ہو چکا تھا، مگر کچھ نہ نکلا
تھا۔ احتیاطاً سول سرجن نے سرکاری Laboratory میں امتحان کرایا۔ اور
اور میجر تلسی رام آئی۔ ایم۔ ایس نے فرمایا کہ پھر اور اسی بنا پر Auto Vaccine پھر تیار ہوا
اور ٹیکے لگوانا پھر شروع کیے۔ اور یہی تشخیص قرار پائی کہ B. Coli ہے جو پہلے انصاری
صاحب کا قیاس تھا۔ جس کی بنا پر انھوں نے Stock Vaccine سے ٹیکے لگوائے
تھے اور بے نتیجہ دیکھ کر قیاس کیا تھا کہ آنتوں کی دق ہوگی۔ سول سرجن کا اصرار تھا کہ دہلی کی
لو سخت مضر ہے۔ پہاڑ جاؤ۔ پہاڑ جاؤ۔ ماجدؔ کا روپیہ الور میں پھنسا ہوا تھا اور صفدر علی صاحب
کی عنایت سے ان کا دیوالہ نکلا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دو ہزار روپیہ (چالیس پچاس ہزار
میں سے) ملے تو منصوری میں مکان کے لیے انتظام کیا جانے لگا۔ میں پہلے ہی سے نصف مصارف
ادا کرنا طے کر چکا تھا۔ سول سرجن نے اس قدر اصرار کیا کہ ڈیڑھ دو دن تو فوراً لے جاؤ۔ وہاں
جا کر مکان کا انتظار کرنا۔ چنانچہ یکایک ۱۹؍ جون کو فیصلہ ہوا کہ ۲۰؍ کی شب کو چل دیں گے۔
میں نے ۱۹؍ ہی کو کہ عشرہ محرم تھا، قرول باغ میں مکان تلاش کر کے مغرب کے وقت مالک سے
کرایہ وغیرہ طے کیا اور ۲۰ کی صبح کو خود ہی جا کر ۵ موٹر لاریوں اور ۷ ٹھیلوں میں سب
سامان دہلی سے قرول باغ ڈھلوایا۔ اسی دن رخت سفر باندھا۔ اسی دن اور گزشتہ شب
ہی Through Carriage میں ایک درجہ Reserve کرایا (جو ہو
نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ گاڑی دہلی سے نہیں لگتی بلکہ جھانسی سے لگتی ہے) اور اسی شب کو
مریضہ ماجدؔ کے بچوں[1] اور اپنے اہل و عیال کو لے کر دہلی سے روانہ ہو گیا۔ پانچ دن دہرہ دون

[1] وہی مولانا کے داماد جن کی بیوی بستر مرگ پر ہیں۔ یہ بچے پہلی بیوی سے تھے۔

پڑا رہنا پڑا۔ اور سخت تکلیف رہی۔ اس لیے کہ گرمی تھی اور اس مکان میں پنکھے نہ تھے۔ مریضہ
کے سر پر رکھنے کے لیے برف مشکل سے ملتا تھا۔ ماجد کو معمولی کرایہ کا مکان نہ مل سکا۔ مگر ایک
بیش کرایہ مکان والی کو کرایہ دار نہ مل سکا تھا۔ اس لیے اس کی دو منزلہ کوٹھی جو ڈیڑھ دو ہزار
کو جاتی تھی۔ سات سو میں مل گئی۔ مگر ہمارے لیے تو یہ بھی ہزاروں تھے۔ ۲۶ کو مریضہ کو لیکر
میں یہاں آیا۔ سول سرجن کا علاج شروع ہوا۔ یکم جولائی کو ڈاکٹر انصاری بیچارے گوکرن ناتھ
مصرا[لے] کو دیکھنے یہاں آئے تھے۔ چونکہ اصلاح مرض مطلق نہ ہوئی تھی۔ اس لیے سول سرجن نے
انھیں بھی دکھایا۔ اور دونوں کی رائے ہوئی کہ Baccilus Coli نہیں ہے۔
اور غالباً آنتوں کی دق ہے۔ اب اس کا علاج پھر شروع ہوا۔ اور جب افاقہ نہ ہوا تو
لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھایا گیا۔ اور اب قطعی رائے ہوئی کہ آنتوں کی دق ہے۔ اور ڈاکٹروں
کے تیور بدلے۔ اور امید کم نظر آنے لگی۔ جب اس کے بعد بھی حالت خراب ہوتی گئی تو سول سرجن
سے کہہ کر ڈاکٹر بجبر سے بھی مشورہ لیا گیا۔ گذشتہ جمعہ کو یعنی پرسوں انھوں نے کہا کہ کوئی امید نہیں
ہے۔ ایک ہی موقع اصلاح کا ہے کہ ہم پیٹ پھاڑ کر دیکھیں کہ وہ کیا چیز ہے جو حائل ہو گئی ہے
اور کھانے کو آنتوں میں نہیں جانے دیتی۔ ہر چیز جو کھائی جاتی ہے ڈال دیجاتی ہے۔ مگر
مریضہ میں اب اتنی جان باقی نہیں ہے کہ یقیناً اس کی متحمل ہو سکے۔ غالباً صدمہ سے جانبر
نہ ہو سکے گی۔ اس وقت شوکت صاحب کو تار دیا گیا کہ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا ہے کہ امید باقی
نہیں ہے۔ ہماری امید خدا پر ہے۔ ہفتہ کو حالت کسی قدر اچھی رہی۔ اور مریضہ نے اتوار کو
ہوا خوری کے لیے علی الصباح ڈانڈی اور رکشے میں جانے کے لیے اصرار کیا۔ اور کپڑے بدلے کہ
دفعتہً Hysteria کا سخت دورہ پڑا۔ اور حالت اتنی خراب رہی کہ

[لے] لکھنؤ چیف کورٹ کے جج تھے۔ مختصر سی بیماری کے بعد یہیں دہرہ دون میں وفات پائی

رات کو ہم لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔ عجیب بات یہ ہے کہ کل ہی ماجد کی پہلی اہلیہ مرحومہ کی برسی تھی۔ اور مجھے یہ خوف دامنگیر ہوا کہ کہیں اس طرح نہ ہو کہ میرے سسر عظمت خاں صاحب نے اسی شب میں انتقال کیا جس کی مغرب کے وقت میرے والد مرحوم کی برسی کا فاتحہ تھا۔

حکیم محمد احمد صاحب[1] کو دہلی سے بلایا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں غالباً آئیں۔ دیکھیے اس وقت تک کیا ہوتا ہے۔ آپ آنے میں تکلف نہ کریں۔ آپ گھر والے ہیں۔ مہمان نہیں ہیں۔ پوری ایک منزل مکان کے لیے خالی ہے اور آپ تسلی و تسکین دے سکیں گے۔

میں آپ سے ناراض ہوں کہ باوجود میرے لکھنے کے آپ نے.........کا بیمہ اپنی خوش دامن صاحبہ کے نام سے بھجوا دیا۔ آدھ گھنٹہ کھولے بغیر سوچتا رہا کہ واپس کروں یا نہیں۔ وہ آپ کی امانت رکھی ہے۔ مختصر اُ سب کو سلام و دعا پیار۔

آپ کا پریشان حال گر صابر و شاکر بھائی

محمد علی

---

[1] دہلی کے مشہور طبیب حاذق، حاذق الملک اول، حکیم عبد المجید خاں کے لڑکے۔ اور حاذق الملک ثانی حکیم محمد اجمل خاں کے بھتیجے۔

باب (۷۹)

سنہ ۱۹۲۹ء (۳)

(زخمی شیر بپھرا ہوا)

حمیدہ بیچاری کی طرف سے اب مایوسی ہو چلی ——————— محمد علی غریب اب کیا کریں گے؟ ایک جوان لڑکی سنہ ۲۴ء میں اپنے ہاتھ سے علی گڑھ میں دفن کر چکے ہیں۔ یہ دوسری بھی اگر خدا نخواستہ چلی، تو ان پر کیا گزر کر رہے گی، خاص کر جب خود بھی ذیابیطس کے شکار ہیں، اور جسمانی قوت اور ایک آنکھ کی بینائی بڑی حد تک جواب دے چکی ہے، پیسہ پیسہ سے محتاج الگ ہو رہے ہیں، جتنا زیادہ سوچتا تھا، دل کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا، گھبرا کر جوابی تار دریافت خیریت کا دیا، ۲۱ جولائی کی صبح کو جواب موصول ہوا:۔

"منصوری، ۲۰ جولائی، ۱۲ بجکر ۲۰ منٹ۔

حکیم محمد احمد خاں کو دہلی سے دوبارہ بلوایا بنسوانی شکایات تشخیص کیں۔ علاج قابلہ کے ذریعہ سے بتایا۔ بچ جانے کی امید تو دلا رہے ہیں لیکن حالت ہے بدستور نازک۔"

اب زندگی کا جو سال بھی گزرتا تھا، مصیبتوں اور دکھ درد کا دور محمد علی کے لیے پچھلے سال سے زیادہ ہی لاتا تھا۔ ہر دفعہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سال بہت سخت گزرا، دوسرا سال اس سے بھی سخت تر نکلتا تھا۔ محمد علی جیسا شخص مجسم زندہ دلی تھا، اور اب اس کی ساری زندگی

ایک مسلسل ٹریجڈی (المیہ) تھی۔ صدمات پیہم اور دل شکستگی کی تصویر ——— حکیم محمد احمد خاں دہلوی بڑے حاذق طبیب تھے۔ ان کے آجانے سے تھوڑی بہت امید پڑ چلی تھی۔ کچھ دن اسی امید وبیم میں گزرے۔ آخر ہوا وہی جو تقدیر میں لکھا لائے تھے۔ جولائی ہی کی کوئی آخر تاریخ تھی کہ یہ دوسری جوان لڑکی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی!

منصوری پر دفن کہاں کرتے۔ رائے یہ ٹھہری کہ دہلی لاکر دفن کیا جائے۔ نعش کو پہاڑ سے اتار کر دہرہ دون تک لانا، پھر وہاں سے ریل پر سہارنپور تک لانا، وہاں سے دہلی کے لیے دوسری ٹرین میں لگانا، ان میں سے ہر مرحلہ وقت طلب، دقت طلب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خرچ طلب تھا۔ محمد علی غریب کے پاس تھا ہی کیا۔ جو کچھ بھی تھا، سب پہاڑ کے قیام اور ڈاکٹری اور پھر یونانی علاج میں بے دریغ اٹھا چکے تھے۔ اب مفلس قلاش کے حکم میں تھے۔ ریل کے کرایہ تک کا کام کسی نہ کسی طرح قرض ہی سے چلا۔ جوں توں دہلی پہنچے۔ اور جوان جہان لڑکی کو قبر میں خود ہی اتارا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ فرط غم سے بیخود ہو رہے تھے۔ لیکن اس بیخودی میں بھی اتنے حواس باقی تھے کہ کفن اور دفن وغیرہ کے ایک ایک جزئیہ سے متعلق احکام شریعت مفتی کفایت اللہ صاحب سے دریافت کرتے جاتے تھے۔ اور جہاں مفتی صاحب نرم پڑ جاتے تھے، خود ہی اصرار کرکے مستحن جزئیات کی ہدایات ان سے حاصل کرتے تھے ———
ہمت کرکے قبر میں اتر تو گئے۔ لیکن وہیں سر میں چکر آیا۔ دنیا نظر میں تیرہ و تار ہو گئی، اور بینائی گویا یک بیک جاتی رہی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ کر اور سہارا دیکر قبر سے باہر نکالا۔ نور نظر کو کھو کر، دفن کرکے، دل شکستہ باپ کی بصارت صحیح وسالم رہ بھی کیسے سکتی تھی!

مولانا کے اس صدمۂ عظیم کے وقت عملی ہمدردی میں سب سے آگے قدم جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کا رہا، ہندی مسلمانوں (خصوصاً بمبئی، گجرات وغیرہ کے باشندوں) کی خاصی بڑی تعداد یہاں عرصہ سے آباد ہے۔ اور یہ لوگ مدت سے مولانا کی زیارت کے مشتاق تھے، اب انھوں نے باقاعدہ دعوت نامہ بھی بھیجا۔ اور شاید تار سے اصرار جاری رکھا۔ یہاں بھی مولانا کے ہوا خواہوں کا مشورہ یہی ہوا کہ بہتر ہے بحری سفر کر آئیں۔ دل بہل جانے سے غم وصدمہ بھی ذرا ہلکا ہو جائیگا۔ اور عجب نہیں کہ صحت بھی درست ہو جائے۔ مولانا جانے پر آمادہ ہو گئے۔ تاریخ تک طے ہو گئی کہ ۲۳ر اگست کو دہلی سے بمبئی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس نامہ سیاہ کو تار پر طلب فرمایا:۔

"دہلی۔ ۲۱ر اگست۔ ۸ بجکر ۳۵ منٹ

کیا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جنوبی افریقہ کی روانگی سے پہلے ملاقات ہو سکے؟ روانگی ۲۳ کو ہے"

تقدیر الٰہی میں سفر درج نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے ایسی ایسی شرطیں مولانا کے داخلہ پر لگائیں کہ ان کا قبول کرنا کسی بھی خوددار ہندوستانی کے لیے ممکن نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت اس وقت عجب بدخو، غلط اور فرعون بے سامان قسم کے "گوروں" کے ہاتھ میں تھی۔ "کالوں" کی کوئی عزت اُنکے خیال میں تھی ہی نہیں۔ انڈین گورنمنٹ بھی "گوروں" ہی کی تھی۔ لیکن یہاں کے گورے بہرحال نسبتۂ شریف تھے۔ انھوں نے بڑا زور لگایا، بار بار لکھا پڑھی کی، تاروں پر سفارش کی۔ کچھ پیش نہ گئی۔ افریقہ کا بوالہول اپنی بات پر اڑا رہا۔ سفر کی تاریخیں پہلے تو بڑھتی رہیں۔ اور بالآخر سفر ہی منسوخ کرنا پڑا۔ جنرل ہرٹزنگ (وزیر داخلہ جنوبی افریقہ) کا آخری اور انقطاعی تار پاکر مولانا نے جو تار بطور رسید بھیجا، اس زمانہ میں اور اس ماحول میں تو خیر دل دہلا دینے والا تھا ہی باقی قابل دید آج بھی ہے:

"آپ نے سرکار ہند کو اس کا سبق دے دیا کہ دوستانہ معروضات کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

اس کا شکریہ۔ اب ہم اسی وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سبق دے لیں گے کہ اسلام اور ہندوستان کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔ محمد علی۔ صدر جمعیت خلافت۔"

محمد علی جمعیۃ خلافت کے صدر اب کی سال کے لیے بھی تھے۔ لیکن خود جمعیۃ خلافت ہی میں جان اب کہاں باقی رہ گئی تھی؟ وہ کانگرس کے سابق صدر کی حیثیت سے بھی ملک بھر میں عزت واحترام کے مستحق تھے۔ لیکن کانگرسی حلقے، نہرو رپورٹ کے شائع ہو چکنے کے بعد سے ۲۸ء سے ان کے نام سے بیزار ہو چلے تھے۔ اور اب متعدد اکابر کانگرس خصوصاً موتی لال نہرو، بلکہ خود گاندھی جی تک سے ان کی مخالفت کوئی ڈھکا چھپا ہوا راز نہ تھی!

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن محمد علی خاموش اور معطل بیٹھنے والے کب تھے۔ فضا کتنی ہی مخالف، حالات کیسے ہی ناساز گار ہوں، تھکنا اور ہارنا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی ۲۹ء میں ایک ہندو ممبر ہربلاس شاردا کی تحریک پر اسمبلی کے سامنے قانون یہ آیا کہ لڑکیوں کی شادی کمسنی میں قانوناً ممنوع قرار دے دی جائے۔ ابتداءً مسودہ قانون کا تعلق صرف ہندو قوم سے تھا، اور ان کے ہاں واقعۃً ایک حد تک اس کی ضرورت تھی بھی۔ لیکن بعض نافہم و کج اندیش مسلمان ممبروں اور بعض "علماء" نے اس کا دائرہ خواہ مخواہ وسیع کرا کے مسلمانوں کو بھی اس کی زد میں لے لیا۔ محمد علی کو خبر ہوئی، تو آگ ہو گئے کہ عمر نکاح پر یہ غیر مسلم گورنمنٹ کی طرف سے قید وبند کیسی! مسلمان قطعاً آزاد ہیں کہ اپنی لڑکیوں کو جس سن میں بھی چاہیں بیاہ دیں۔ غیروں کی طرف سے ان کے ان اندرونی و خانگی معاملات میں مداخلت صریحاً ناقابلِ برداشت ہے۔ اٹھے، اور اپنے ساتھ جمعیۃ علماء، دیوبند، فرنگی محل، بدایوں وغیرہ کے علماء کی ایک معقول تعداد کو لے کر اس شاردا بل کی عملی مخالفت میں اپنے اسی جوش وانہماک کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔

اکتوبر ختم ہو رہا تھا کہ ذیل کا گشتی مراسلہ ان کے دستخط سے، دوسروں کی طرح مجھے بھی موصول ہوا:

"دہلی۔ گلی قاسم جان۔ ۲۸ ر اکتوبر ۲۹ء

جناب مکرم۔ السلام علیکم

دہلی میں علماء و زعماء کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ۲۷ ر اکتوبر ۲۹ء کو ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی گئی۔ اور یہ طے کیا گیا کہ وائسرائے ہند کی خدمت میں وفد لے جانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ جو وائسرائے اور ان کی حکومت کا طرزِ عمل مسلمانوں کے اس عام جوش و خروش کے متعلق معلوم کرے۔ جو مسلمانوں میں شاردا ایکٹ کے نفاذ سے اپنے تئیں مستثنٰی کرانے اور شریعتِ اسلامیہ کو مداخلت سے محفوظ رکھنے کے باب میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ کمیٹی ان مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کرے جو اس مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔ چنانچہ ابتدائی کام کرنے کیلیے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے، جناب والا بھی اس کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ جناب جائنٹ سکریٹری کے پتہ پر اپنی منظوری سے اطلاع بخشیں گے۔ جواب بذریعہ تار مرحمت فرمائیے،

(مولانا) محمد علی (صدر)

"قرول باغ۔ دہلی"

مولانا نے اس سلسلہ میں کیسی کیسی سرگرم کوششیں کیں، کس کس طرح اپنی جد و جہد کو جاری رکھا، وائسرائے کے پاس کس طرح وفد لے گئے، وہاں سے کیا جواب لائے، کہاں کہاں تقریریں کیں، جوش و خروش کے ساتھ رہنمائی کن طریقوں پر کی۔ یہ ساری مفصل داستان دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ لیکن اس کا تعلق سیرتِ محمد علی سے ہے، نہ کہ اس سرسری ڈائری سے جس کا دائرہ صرف ڈائری نویس کے ذاتی علم میں آئے ہوئے واقعات تک محدود ہے۔

باب (۸۰)

سنہ ۱۹۳۰ء (۱)

(سب و شتم کی گرم بازاری - واماد و کا انتخاب)

سنہ ۳۰ء کی پہلی سہ ماہی تمامتر علالت اور مخالفتوں کی نذر ہوئی۔ خلافت کمیٹی اب علانیہ کانگریس سے برسرِ جنگ تھی۔ اور خلافت کی طرف سے کہنا چاہیے کہ سارا کام محمد علی ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ خلافت ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ایک بہت طویل اور اہم رزولیوشن انگریزی میں اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ وہ تمامتر محمد علی ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔ ادھر سے بولنے والوں، لکھنے والوں کام کرنے والوں کی کیا کمی تھی، ادھر گویا تنہا محمد علی کی ذات تھی، بجز شوکت علی اور مولانا عرفان اور شفیع داؤدی وغیرہ چند اِنے گنے کارکنوں کے، باقی سب رفیقانِ قدیم ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر سید محمود اور مولانا ابوالکلام اور عبدالمجید خواجہ اور تصدق احمد خاں شروانی وغیرہم کانگریس کیمپ میں تھے، اور جمعیۃ علمار کے لوگ بھی رفتہ رفتہ کٹ کٹ کر اسی طرف شریک ہوگئے۔ بہ قول داغ ؎

ساری خدائی اس کی طرفدار ہوگئی
اتنا نہیں کوئی جو ہو ایمان کی طرف

عبرت کا عجب منظر سامنے تھا۔ کل تک جن کا شمار معمولی رضاکاروں میں ہوتا تھا، جو دوڑ دوڑ کر

محمد علی کی خدمت کرنا باعثِ سعادت سمجھتے تھے، بلکہ محمد علی ان سے جوکی پر لوٹا رکھنے کو کہہ دیتے تو اس کو وہ فخر و مباہات سے بیان کرتے، وہ تک آج سب "فرنٹ" تھے ——

عوام مسلمین بیشک اس وقت پھر زرا خلافت کمیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس بھی محمد علی کی قیادت تسلیم کر رہی تھی، لیکن خواص کا طبقہ روز بروز الگ بلکہ بیزار ہی ہوتا جاتا تھا۔ اور مخالفین کے اخبارات تو جیسے اس موقع کی تاک ہی میں لگے تھے۔ شیر کو جاں بلب اور حالتِ نزع میں پاکر گیدڑ بھی اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

انگریزی کا سارا ہند۔ و پریس دشمن، اردو کے غیر مسلم اخبارات کی بھی بد زبانی کی حد نہیں۔ ان سب سے بھی بڑھ کر دلشکن، دلآزار اور تکلیف دہ دہلی اور لاہور کے متعدد مسلم اخبارات کی روش! کوئی سخت سے سخت طعن محمد علی کے لیے اٹھ نہ رہا۔ ہر چھوٹی سی چھوٹی افواہ بشرطیکہ اس سے محمد علی کی توہین و تفضیح کا کوئی پہلو نکلتا ہو، ان اخبارات کے لیے آیت و حدیث کا حکم رکھتی تھی۔ کبھی یہ خبر اڑتی کہ محمد علی نے گورنمنٹ میں عہدہ قبول کر لیا ہے، اور اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہونے والے ہیں۔ کبھی یہ دروغ بے فروغ شائع ہوتا کہ محمد علی کو فلاں مسلم والی ریاست نے گرانقدر ماہانہ وظیفہ سے نوازنا شروع کیا ہے۔ یہانتک کہ کبھی کبھی اس قبیل کی بھی مضحکہ خیز خبریں یار لوگ گڑھ لیتے کہ محمد علی علیگڈھ یونیورسٹی کی رجسٹراری قبول کرنے والے ہیں، جس کی تنخواہ چار پانچ سو سے زائد نہ تھی! یہ "ایماندار" اور "دیانتدار" اخبار نویس ان سب خبروں کو بڑے شوق اور چاؤ کیساتھ نہ صرف نمایاں کر کے شائع کرتے، بلکہ ان پر پرزور نوٹ لکھتے۔ بڑے بڑے اڈیٹوریل لکھ ڈالتے، اور ان میں زیادہ سے زیادہ زہر ملا دیتے۔ اور حد یہ ہے کہ غریب کی علالت تک ان بزرگوں کی نظر میں بجائے قابل ہمدردی ہونے کے قابلِ مضحکہ تھی!

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو!

——— اس ڈائری کے ناظرین ممکن ہے کہ ان بیانات کو مبالغہ آمیز سمجھیں اور خیال کریں کہ سیاسی مخالفتوں میں بھلا کوئی اتنا تھوڑے ہی حد سے گزر سکتا ہے، اور پھر اس کے مقابلہ میں جو ابھی کل تک ملت کا قائد اعظم تھا، ایسے حضرات بہتر ہوگا کہ کہیں تلاش کر کے کم از کم زمیندار (لاہور)[1] الجمعیۃ (دہلی)[2] اور ریاست (دہلی) کی ۳۰ء کی فائلیں ضرور پڑھ لیں!

جوابات کی محمد علی کے ہاں کمی نہ تھی، اب وہ جب جواب دیتے، تو مخالفین ہی کے لب و لہجہ میں نہایت سخت اور بہت تلخ جواب دیتے، لیکن اول تو بچارہ کو جواب دینے کی مہلت ہی کہاں تھی۔ یک انار و صد بیمار کا معاملہ تھا۔ کتنے اہم کام تنہا ان ہی کو انجام دینے پڑ رہے تھے، اس میں سب و شتم کے اس پشتارہ کے پڑھنے کا وقت ہی انھیں کہاں مل سکتا تھا۔ اور پھر آنکھ کی شدید کمزوری کے باعث طبی ہدایات کے ماتحت ان کا لکھنا پڑھنا بھی بہت محدود رہ گیا تھا۔ ضروری سی ضروری ملی و ملکی مسائل کے ہوتے ہوئے ان شخصی تعریضات اور ذاتی حملوں کی انھیں خبر ہی کم ہو پاتی۔ اور سب سے بڑی بات ہے (اور یہی ان کے ظرف کا پیمانہ تھا) کہ جواب وہ سخت تلخ یقیناً دیتے، لیکن صداقت و دیانت کا دامن اس شدید اشتعال کی حالت میں بھی نہ چھوڑتے، یہ کبھی بھی نہ کرتے کہ افتراء کے جواب میں افتراء، بہتان کے توڑ کیلیے بہتان پر اتر آئیں ——— شدید جسمانی آزار، شدید ذاتی صدمات، شدید ہجوم اعداء میں مبتلا ہو کر اگر زبان میں حدت اور مزاج میں غلظت آگئی ہو تو یہ عین فطرت بشری تھی

---

[1] و [2] ظاہر ہے کہ ان سے مراد نہ آج کا زمیندار اور نہ آج کا الجمعیہ۔ ۱۵ء و ۲۵ء میں تو یوم محمد علیؒ کے سلسلہ میں تعزیتی مقالے ایسے ادب و احترام کے ساتھ ان پرچوں میں نکلے کہ ان سے آگے بڑھ کر ممکن ہی نہ تھے۔

ایک امر طبعی تھا، اور اس کے لیے سند بعض مسلم اکابر سے مل جاتی ہے۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا۔

مزاج میں چڑچڑاہٹ آگئی تھی، تاہم زندہ دلی، بذلہ سنجی، برجستہ گوئی کا سرچشمہ خشک نہیں ہوگیا تھا۔ پنجاب میں نیا نیا لفظ "ٹوڈی" اور اس سے بڑھ کر "ٹوڈی بچہ" چلا ہوا تھا۔ زمیندار اسے خوب اچھال رہا تھا، اور روز ان لوگوں کی شان میں جو "نیشنلسٹ" نہ تھے، "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے"! کا نعرہ لگا رہا تھا۔ اور اس پارٹی سے بچوں اور نوجوانوں نے واقعی اس نعرے سے آسمان سر پر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اتفاق سے عین اسی زمانہ میں محمد علی کا گزر لاہور میں ہوا۔ یہ موٹر پر شہر کے اندر گزر رہے تھے کسی بدتمیز نے پکار کر کہا "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے"! یہ زبان کب رکنے والی اور طرح دینے والی تھی۔ معاً موٹر روک، اسی ردیف وقافیہ میں پکار کر مصرع لگایا "دھوتی بچہ وائے وائے"! ——— "دھوتی بچہ" میں ہندو پرستی پر جو چوٹ تھی، بالکل ظاہر ہے۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی (اور اب "سب سے چھوٹی" کہاں، چار میں سے کل دو تو رہ ہی گئی تھیں) گلنار بی کا بھی سن ماشاء اللہ اچھا خاصہ ہو چکا تھا۔ اور موزوں شوہر کی تلاش قدرۃً جاری تھی۔ ——— دسمبر ۲۱ئ؁ میں مولانا کی نظربندی کے زمانہ میں احمد آباد کانگرس کے موقع پر اسی چھوٹی اور ہونہار بچی کی طرف اشارہ کرکے گاندھی جی نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ اگر گرفتار ہو گئے تو اپنا جانشین کس کو بنایئے گا۔ ہنس کر کہا کہ "گلنار کو"! ——— خاندان اور برادری کا کوئی لڑکا خیال میں نہیں آ رہا تھا۔

مولانا کے ایک بڑے مخلص اور پرجوش جوان عمر رفیق کار شعیب قریشی تھے۔ ان کا ذکر آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، خلافت کمیٹی اور وفد حجاز کے سلسلہ میں بھی، اور بھی کئی بار اور عین ڈائری کی ان سطور کی نظر ثانی کے وقت خبر آئی ہے کہ وہ حکومت پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں

سفیر مقرر ہو کر دہلی آ رہے ہیں۔ علی گڈھ اور آکسفرڈ کے پڑھے ہوئے، بیرسٹر ایٹ لا، شریف خاندان صورت وسیرت دونوں میں ممتاز۔ نہرو رپورٹ کے تجربہ کے بعد کانگرس کی سیاست سے بیزار ہو کر پبلک قومی زندگی ہی کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اور بھوپال میں ایک بہت اونچے عہدے پر ہو گئے تھے۔ گلنار بی کے لیے نظر انتخاب ان پر پڑی، غالباً عبد الرحمٰن صدیقی سندھی کی تحریک پر۔ یہ عبد الرحمٰن بھی مولانا کے بڑے قدیم رفیقوں میں تھے۔ علی گڈھ کے ایم، اے۔ کمریڈ کے دور اول میں اس کے منیجر رہ چکے تھے۔ اب ایک عرصہ سے مولانا سے بے تعلق ہو کر انگلستان میں اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ شعیب کے خاص دوستوں میں تھے۔ بہر حال ان ہی کے حسن توسط سے معاملۂ نکاح شعیب قریشی کے ساتھ طے پا گیا۔ شعیب اب سن سے ذرا اتر چکے تھے۔ لیکن مرد کے لیے اتنا سن کچھ زیادہ نامناسب بھی نہ تھا۔ تندرست و وجیہ، انتخاب مالی، اخلاقی، دینی ہر حیثیت سے اچھا رہا۔

مولانا تلاش سکون و عافیت میں کچھ روز حیدر آباد کے ایک دور افتادہ مقام پر بھی میں اپنے ایک بے تکلف دوست قاسم حسین بدایونی (علیگ) کے پاس رہنے کے بعد اب بمبئی میں تھے۔ شوکت صاحب نے بلا کر با صرار وہیں رکھا تھا، زیادہ تر تو آنکھوں کے علاج کے لئے اور باقی قومی کام تو چھوٹ سکتا ہی نہ تھا۔ اب ہم نیاز مندوں کو فکر تھی تو یہ کہ کس طرح گلنار بی کے عقد سے فراغت حاصل کر لیجائے۔ اور مجھے سب سے بڑھ کر اندیشہ یہ لگا ہوا تھا کہ کہیں شادی کے موقع پر مولانا دل کھول کر نہ خرچ کرنے لگیں جس طرح گفتگو میں ان کی زبان نہیں رک سکتی تھی، اسی طرح خرچ کے باب میں ان کا ہاتھ رکنا جانتا ہی نہ تھا۔ مالی حالت جتنی زبوں تھی، مجھ پر روشن تھی۔ جی یہ ڈر رہا تھا کہ کہیں قرض ورض لے کر ہی سہی ساکھ بھی نہ ڈبو بیٹھیں۔ ڈرتے ڈرتے بمبئی خط لکھا، تو کچھ اسراف کی وعیدیں سنا ڈالیں۔ دریافت خیریت و دریافت حال کے لیے

پہلے ہی دو ایک کارڈ اور لفافہ ڈال چکا تھا۔ جمعیۃ العلماء کے بزرگوں نے مخالفت کی اب
پوری طرح ٹھان لی تھی، مجبوراً مولانا کے ہمدردوں اور معتقدوں کو جن میں پیش پیش قطب میاں
فرنگی محلی اور مولانا عبد الماجد بدایونی تھے، ایک دوسری جمعیۃ العلماء بھی بنا لینی پڑی تھی۔
جس کا صدر مقام کانپور تھا، اس کے حالات خاص طور پر پوچھنے تھے۔ وسط اپریل میں سب
کا اکٹھا جواب آیا، بڑے کاغذ کے ۳۹ صفحوں پر! ——— جواب ایسے قلم سے،
جو رفیقوں کی مسلسل غداریوں اور دوستوں کی خالی خولی بے مغز نصیحتوں اور ملامتوں سے
بھنایا ہوا، اور اپنے خلاف سازشوں کے زبردست جال سے جھلایا ہوا ہے۔ لب و لہجہ کی
تلخی اس حال میں شاید بالکل قابلِ معافی ٹھیرے۔ بعض بعض لفظوں اور فقروں کو اس ڈایری میں
مجبوراً قلم زد کرنا پڑ رہا ہے، اور یہ بعض جگہ اس سے قبل بھی ہو چکا ہے، لیکن اگر ایسے فقروں کو کہیں
قلم زن کر دیا جائے تو اتنی کتر بیونت شاید حدود تحریف میں داخل ہو جائے، اور ڈائری ڈایری ہی
رہ ہی نہ جائے۔

———•———

باب (۱۸)

۱۹۳۰ء (۲)

(شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو)

۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء

دار الخلافہ - لولیں - مجگاؤں
بمبئی

برادرم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ -

آپ کے تین کارڈ اور آج ہی جب کہ آپ کو عریضہ لکھنے والا تھا - ایک لفافہ بہمہ سب مجھے موصول ہوئے - چونکہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے ارادہ کیا تھا کہ جب گلنار کی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو آپ کو بلا لوں گا - اور بلا لکھے پڑھے گفتگو میں سب کچھ کہہ دیا جائے گا - مگر گلنار کی شادی کی تاریخ شعیب کے اور ہم سب کے رفیق صدیق عبد الرحمٰن صدیقی کی ولایت سے آمد پر موقوف ہے - اور متعدد تاروں کے تبادلے کے بعد وہ یورپ سے ۷ اپریل کو تو چل پڑے - مگر زیارت روضۂ پاک اور حج بیت اللہ کے بعد ہندوستان پہنچیں گے - اور ہم سب اسی امید پر جی رہے ہیں کہ وہ ذی الحجہ ہی کی کسی تاریخ کو دہلی پہنچ جائیں گے کیونکہ محرم میں شادی نہ ہو سکے گی اور صفر میں حمیدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تھا، وہ زمانہ بھی ناموزوں ہوگا - یوں تو کون عبد الرحمٰن کے حج سے خوش نہ ہوگا - بالخصوص جبکہ ان کی صحت بالکل غارت ہو گئی ہے اور وہ متعدد امراض میں گرفتار ہو گئے ہیں - اور سخت تکالیف اور درد میں مبتلا ہیں

لیکن ہم سب چاہتے ہیں کہ گلنار کی شادی جلد سے جلد ہو جائے اور صرف عبدالرحمٰن ہی کی وجہ سے دیر لگ رہی ہے، ورنہ مارچ ہی میں عقد کر دینے کا خیال تھا، خط نہ لکھنے کی وجہ میں نے بیان کر دی۔ مگر اب خط لکھ رہا ہوں تو باوجود آنکھوں کی بصارت اس درجہ کھو بیٹھنے کے جی نہیں مانتا کہ مفصل خط نہ لکھوں اور سب باتوں کا جواب نہ دوں اور کچھ شکایات بھی نہ کروں جو ایام سرما میں دل کو جلا رہی ہیں۔

پہلے اسراف کے متعلق سن لیجئے۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا جو گلنار کی شادی میں اسراف کروں گا۔ برادرم .... میں نے پہلے بھی ان رسوم میں اسراف سے کام نہیں لیا تھا۔ زہرہ اور آمنہ مرحومہ کی۔ نہ ان دو بچیوں کی کبھی کوئی رسم ادا کی جو اس اسراف کا الزام مجھ پر لگ سکتا ہے۔ چونکہ نہ عقیقہ میں، نہ بسم اللہ میں، نہ نشرہ میں، نہ منگنی میں کوئی رسم ادا کی تھی اور درحقیقت اس زمانے کا اکثر حصہ قید و بند میں گزرا تھا۔ رسم ادا بھی کس طرح کرتا۔ صرف نکاحوں کے موقعوں پر میری اہلیہ نے کچھ خوشی منائی۔ وہ بھی نہ اس طرح کہ ناچ رنگ ہوا ہو یا شب گشت ہوئی ہو یا کسی اور طریقہ پر برات نکلی ہو۔ جب سے پہلے دو بچیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی ماں عورتوں کے طریقہ پر ان کے لیے کچھ نہ کچھ میری نہایت محدود تنخواہ میں سے بناتی یا خریدتی ہی رہتی تھی۔ اور وہ بھی زیور نہ تھا، بلکہ معمولی روزمرہ کے استعمال کے کپڑے اور برتن بھانڈے۔ جب میں اکتوبر ۱۹۱۴ء میں یورپ سے واپس آیا تو ایک لڑکی ۱۸ کی تھی اور دوسری ۱۷، اسے کچھ ہی کم ہوگی۔ میں تو ایک ہی کا نکاح کرنا چاہتا تھا اور اسکا بھی اسوقت نہیں۔ لیکن میری بیوی نے سب انتظام میرے ولایت سے آنے سے قبل ہی کر لیا تھا اور انھوں نے کہا کہ تمھارے قید و بند کا زمانہ اب پھر آ گیا۔ میں تنہا دو جوان لڑکیوں کی ذمہ داری اپنے سر

نہیں لے سکتی .... مرنے پر بیاسے انتلاصی، دنیا زمندی عرض کیا تھا کہ ہر طرح کے اسراف سے احتیاط رہے۔

لینا نہیں چاہتی۔ دو مسلمان نوجوانوں کو اس ذمہ داری میں شریک کرتی ہوں۔ آمنہ کی عمر ابھی ۱۸ برس کی نہیں ہے جب سے قبل ہمارا ارادہ کسی لڑکی کے نکاح کا نہ تھا لیکن اس کو ہسٹریا کا مرض ہوگیا ہے۔ اور حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ نکاح بہترین علاج ہے۔ دوسرے اتنا روپیہ کس کے پاس ہے کہ ہر سال ایک نکاح کیا جائے۔ میں ان دلائل سے قائل ہوگیا اور نکاحوں کی اجازت دی۔ مگر مجھ کو جامعہ ملیہ کے آغاز کے باعث ایک منٹ فرصت نہ تھی۔ اس لیے نکاح سے دو تین روز پیشتر مہمان نہ اعلی آکر مرادآباد میں مظہر حسن صاحب اور عبد السلام اور مسعود کے مکانوں میں بیٹھ رہا۔ سوائے مولانا عبد الباری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی کو بھی مدعو نہ کیا۔ انصاری وغیرہ دہلی سے بلادعوت کے آگئے اور کچھ وہ ہی گئے۔ مہمانوں کو معمولی کھانا کھلایا گیا۔ عرفت رامپور سے برات آنے پر انھیں رسم کا پلاؤ، زردہ قلیہ، قورمہ کھلایا گیا۔ جو بظاہر نکاح کے کھانے کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح عید الفطر کے لیے سویاں اور شب برات کے لیے حلوا۔ میں نے اس شادی میں بجز شرکت کے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس لیے مجھے حق بھی نہ تھا کہ بیگم صاحبہ سے جن کے حسن انتظام کے ہم سب قائل ہیں، کچھ کہتا۔ یہ تھی میرے گھر کی پہلی رسم۔ آمنہ مرحومہ اور والدہ ماجدہ مرحومہ کی موتیں دوسری اور تیسری رسم تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسراف سے کام لیا۔ درحقیقت کوئی رسم ادا نہیں کی گئی اور جو کچھ کی بھی گئی تو خیرات نقد کی گئی اور جمعیۃ خلافت وغیرہ کی نذر کردی گئی، یا محلہ کی مسجد میں برقی روشنی کا انتظام کردیا گیا جو الحمد للہ اس وقت تک جاری ہے۔ آمنہ کا سارا زیور خلافت کو دے دیا گیا۔ یہی بڑی خیرات تھی۔ چوتھی رسم حمیدہ مرحومہ کی شادی تھی۔ جو بڑی دو بہنوں کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔ اس کے لیے بھی باوجود ہماری قید و بند کے میری بیوی نے کچھ نہ کچھ کرلیا تھا۔ مگر وہ انھیں کافی نہ معلوم ہوا۔ اور نہ معلوم مرحومہ

کو اپنی آنے والی موت کا پہلے ہی سے کچھ اندیشہ تھا یا کیا (اور ہو بھی تو کیا عجب ہے کہ تین سال سے
حرارت اور درد گردہ میں مبتلا تھی اور حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور انصاری دونوں کا اصرار
تھا کہ شادی کے بعد ہی نسوانی علاج ہو سکے گا۔ کیونکہ اس نے گھر میں آئی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کو
فیس دے کر امتحان و معاینہ کے بغیر رخصت کر دیا تھا) خود مرحومہ نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنی ماں پر
ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دھوم دھام چاہتی ہے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک صاحب نے دسمبر میں تین سو
روپے دیے تھے۔ مدراس کانگرس میں اسی کی عمدہ کھدر خرید لی تھی اور ایک دوست کی دکان
سے چینی کے برتن اور گلاس وغیرہ قرض لے لیے تھے۔ اور بس۔ مگر اس کی ماں نے اپنے بھائی
معظم کو لکھا کہ اپنے باپ کے ترکہ میں سے ۲۲ برس میں انھوں نے ایک بار کوئی دو ہزار روپیہ
آمنہ مرحومہ کے مکان کے لیے زمین خریدنے کو لیے تھے جو اب تک یوں ہی پڑی ہے۔ اور ایک بار
سنہ ۲۶ء میں اپنے اور میرے حج کے لیے دو ہزار لیے تھے۔ اب انھوں نے تین ہزار معظم کو لکھ کر
منگوائے اور ساری خرید و فروخت خود کی۔ اس بار چونکہ ماجد مالی مشکلات میں گھرے ہوئے
تھے، اس لیے رامپور سے بھی سب عزیزوں کو نہ بلایا گیا۔ معظم کی بیٹیاں اور میری بہن اور
شوکت صاحب کی بچیاں ہی شریک ہوئیں۔ باہر سے بھی کسی کو مدعو نہیں کیا گیا۔ البتہ ایک
شب کو دہلی سے کوئی سو پچاس احباب کو کھانے پر مدعو کر لیا گیا۔ یہی اسراف ہوا تھا۔ یا
مرحومہ کے لیے کپڑا لیا گیا تھا۔ پہلے اسراف کا کفارہ یہ کیا گیا کہ جامعہ ملیہ کو پانچسو، جمعیۃ خلافت اور
جمعیۃ العلماء وغیرہ کو چند سو نقد دیے گئے۔ دوسرے اسراف کا کفارہ یہ کیا جا رہا ہے کہ مرحومہ
کے کپڑے اور برتن بھانڈے غریب لڑکیوں کو ان کے عقد نکاح کے موقعوں پر دیے جا رہے
ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ گلنار کی شادی کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہے کہ شعیب جیسے صالح
مسلمان کے ساتھ خاندان کی رسم کو توڑ کر جوڑا جا رہا ہے۔ اور خدا اس کی عمر دراز کرے۔

توکل تو خدا ہی پر ہے لیکن اب اپنی صحت کا خیال کر کے کسی قدر مطمئن ہوں کہ اس رزاقِ حقیقی نے جو مسبب الاسباب ہے۔ میری بیوی اور بچوں کے لیے ایک یار و مددگار بھی پیدا کر دیا مگر اب خوشیاں منانے کی ہمت ہی نہیں۔ دو جوان لڑکیوں کے نکاحوں کے اتنے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا کہ شادی و خانہ آبادی کے نام سے ڈر لگتا ہے، میں نے جو کچھ اصراف کیا ہے وہ والدہ مرحومہ اور آمنہ مرحومہ کی قبروں کے بنانے میں کیا ہے، کوئی تبہ نہیں بنوایا، سینے پر سوائے خاک ورگھاس کے کچھ نہیں ہے، ایک جگہ سنگ سبز کا فریم سا بنوا دیا ہے، اور ایک جگہ سپید سنگ مرمر کا۔ اور لوحِ مزار کا خود Design کیا ہے۔ آمنہ کی قبر پر پیام محبس اور دعلے اسیری کا ایک شعر کندہ کرا دیا ہے۔

تیری صحت ہمیں مطلوب تھی لیکن اس کو … نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

حمیدہ کی قبر بھی سپید سنگ مرمر کی اسی طرح تیار کرائی جا رہی ہے، اور اس پر اس زمانے کے کہے ہوئے یہ دو شعر انشاء اللہ کندہ ہوں گے ؎

ہوا محسوس جب سے ہے خوشی تیری خوشی اپنی … نہ اپنی موت، موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے … اسے بیچارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

صبر کے سوا اب بھی چارہ نہیں۔ مگر اب یارائے ضبط کم ہے کیا کروں

تو نا گفتہ دانی بگفتن چہ سود

نکاح پڑھانے کا مسئلہ میرے اختیار کا نہیں ہے۔ شعیب کی جو مرضی ہوگی کیا جائے گا۔ گو میرا تو جی یہی چاہتا ہے کہ میرے صاحب السجن اور آپ کے پیر و مرشد ہی نکاح پڑھائیں۔[1] بہر حال انشاء اللہ مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند نکاح نہ پڑھائیں گے۔[2]

---

[1] میں نے مشورہ دیا تھا کہ نکاح مولانا حسین احمد صاحب پڑھائیں۔ کراچی کے مشہور مقدمہ میں دونوں ایک ساتھ اسیر ہوئے تھے اور ایک ساتھ ہی سزایاب۔ اس وقت تک یہی باہمی تعلقات غنیمت تھے۔ [2] مولانا سے اس وقت تک مفتی صاحب سے سخت بے لطفی ہو چکی تھی۔

بھائی اگر تم نہ بھی لکھتے[1]۔ تب بھی میں شریعت حقہ کے احترام کو قائم رکھنے کی خاطر ان مفسدوں کا مقابلہ ضرور کرتا، جو اسمبلی میں جا کر اپنے تئیں مصلحین کہتے ہیں۔ ان ہی پر سورہ بقرہ کی وہ آیات صادق ہیں کہ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ .... فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ۔ میں نے پربھنی[2] میں ایک لمبا چوڑا برقی پیغام تیار کرنا شروع کر دیا، مگر ٹائپسٹ نہ ملنے اور خود علیل ہونے کے باعث اسے ٹائپ کر کے بھجوا نے نہ پایا تھا کہ اندور میں معلوم ہوا کہ کونسل آف اسٹیٹ نے بھی شاردا بل کو پاس کر دیا۔ تب تو خود ہی بیٹھ کر ٹائپ رائٹر پر وائسرائے کو ایک طول طویل اور سخت خط لکھا۔ مگر وہ بدبخت منظوری دے چکا تھا۔ اور عازم یورپ ہو گیا۔ میں بھوپال میں تھا کہ دہلی کے جلسہ کی اطلاع ملی اور میرے پاس جمیل میاں[3] کا تار آیا کہ داعیوں میں مفتی صاحب کا، ان کا اور میرا نام ہوگا۔ اجازت درکار ہے۔ ہفتہ کو تار ملا۔ ارجنٹ تار کے دام کہاں سے لاتا۔ ارادہ کیا کہ پیر کو معمولی تار دے دوں گا۔ مگر بھول گیا۔ حالانکہ اس دن کا خط بھی پیر تک پہنچ جاتا۔ بعد کو بمبئی سے گھومتا گھامتا احمد سعید کا خط آیا کہ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا، اس لیے خلافت کی معرفت لکھا جا رہا ہے۔ بہرحال میں جواب دینا بھول گیا۔ مگر جلسے کی شرکت کے لیے پہلے ہی دلی پہنچا۔ احمد سعید تعین عمر کی کمیٹی کے سامنے تائید کر چکنے بعد خود ہی میری جگہ داعی بن بیٹھے تھے۔ میں آتے ہی دو بار ان کے اور مفتی صاحب کے گھر گیا۔ اور ایک بار دفتر جمعیت۔ مگر نہ ملے۔ دوسرے دن جمعیۃ کا جلسہ تھا جس میں سیاست (سطحی) بہت کچھ تھی۔ مگر مذہب کا قطعی

[1] شاردا ایکٹ (قانون امتناع ازدواج کمسنی) بنا تھا ہندوؤں کے لیے مگر جبیک دیا گیا مسلمانوں کے سر۔ میں نے لکھا تھا کہ اس عظیم الشان فتنہ کے مقابلہ کیلیے آپ ہی جیسے قائد کی ضرورت ہے [2] پربھنی علاقہ نظام دکن۔ مولانا وہاں اپنے ایک دوست کے ہاں سکون صحت اور تبدیل آب ہوا کے سلسلہ میں مقیم تھے [3] یعنی حکیم محمد جمیل خاں دہلوی فرزند حکیم اجمل خاں مرحوم [4] خوب یاد کر لیجئے کہ یہ وقت کونسا تھا۔ جمعیتہ العلماء اور مولانا کے اختلافات اس وقت تک نہایت درجہ تلخ ہو چکے ہیں

(باقی ص ۱۱۹)

فقدان تھا۔ شام کو دوسرے جلسہ کے متعلق جمیل صاحب کے ہاں مشورہ تھا۔ مگر مفتی صاحب اور احمد سعید دیر میں آئے۔ اور لوگ مشورہ کرتے رہے اور سب کی رائے یہی تھی کہ میں جلسہ کا صدر ہوں۔ وائسرائے کو ایک وفد کے ذریعہ الٹی میٹم دیدیا جائے۔ مسلمان اس ایکٹ سے مستثنیٰ نہ کیے جائیں تو کانپور کانفرنس منعقد کیجائے اور تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ پر عمل کرکے ہر کلمہ گو کو جو اس مداخلت فی الدین سے بیزار ہو دعوت دیجائے اور اس مصیبت پر خدا کا شکر کرکے انتشار افتراق کو دور کیا جائے۔ اس لیے باوجود میرے صدر خلافت ہونے کے میں نے صرف خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب نہ کیا، کیونکہ "معتدلین" نہ آتے، نہ شیعہ اور قادیانی شریک ہوتے۔ اتنے میں مفتی صاحب اور احمد سعید آگئے۔ پہلے صدارت کے متعلق پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کس کا صدر ہونا مناسب ہوگا۔ مفتی صاحب کا جواب بے حد (Significant) ہے۔ خود ہی داعیوں میں شامل ہیں اور خود ہی فرماتے ہیں کہ میں اس وقت تک اس کے متعلق بالکل خالی الذہن ہوں۔ مگر احمد سعید نے اس خلائے محض کے پُر ہونے کا ثبوت بھی دیدیا اور کہا کہ "اگر جلسہ تو جمعیۃ العلماء کا بلایا ہوا ہے، اسی کا مستقل اور دوامی صدر اس کا بھی صدر ہوگا۔" تب جاکر چند دہلی والوں نے جو اس وقت موجود تھے، کہا کہ جلسہ تو اہل دہلی کا طلب کردہ ہے۔ جمیل میاں بھی داعی ہیں۔ اہل دہلی نے مہمانوں کے لیے خود ہی چندہ کیا ہے۔ آپ کو اس لیے دیدیا ہے کہ جمعیۃ العلماء کی کمیٹی منتظمہ کا بھی جلسہ ہونے والا تھا۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہمارے مہمانوں کا بھی انتظام کردیجئے گا۔ بالآخر دعوت نامے منگا کر دیکھے گئے تو صاف درج تھا کہ یہ جلسہ جمعیۃ کے جلسے سے بالکل الگ تھا۔ مگر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۸) مولانا کا دل اپنے سابق رفیقوں کی طرف سے بہت ہی جلا ہوا ہے۔ اور وہ رنج کے خط میں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ پھر خود بھی ہر طرح کے جسمانی آرام اور قومی و ذاتی صدمات سے چور چور رہیں۔ لہجہ کی کرختگی اور خشونت ایسی حالت میں بالکل درگذر کے قابل ہے۔

احمد سعید صاحب کا تحریر کردہ دعوت نامہ جو جمعیت والوں کو بھیجا گیا تھا، اس میں جمعیۃ ہی کا جلسہ
بتایا گیا تھا۔ اس تضاد و تباین کا اقبال انھوں نے بھی کیا۔ بہرحال میرا نام صدارت کے لیے پیش
کیا گیا اور بلا عذر تسلیم کیا گیا۔ گو چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں علمائے کرام اسے کرہاً قبول
کر رہے ہیں۔ آپ کو نہ معلوم وہ گندہ قصہ یاد ہے یا نہیں، کہ ایک ہیجڑا بنیے کی دکان پر سے اسکی
غیر حاضری میں چنے ٹونگ رہا تھا۔ وہ پیشاب کر رہا تھا۔ پیٹھ پھیر کر دیکھا تو یہ نظارہ نظر آیا۔ نہیں
کہہ سکتا کہ یہ مرد ہے یا عورت۔ گھبرا کر چیخ اٹھا کہ سارے چنے ٹونگ گیا، سالے چنے ٹونگ گئی ....
مفتی صاحب نہ پورے دیندار نکلے نہ پورے دنیادار۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ محمد علی کا نام
صدارت کے لیے بحیثیت داعی جلسہ پیش فرمائیں اور جمیل میاں بحیثیت داعی دوم اس کی تائید
کر دیں گے تو فرمایا جمیل میاں پیش فرمائیں، میں تائید کر دوں گا۔ باوجود سب کے اصرار کے انھوں
نے تحریک کرنے سے انکار کیا۔ مگر تائید کرنے کا اقرار کیا۔ نواب اسمٰعیل خاں[1] نے اس حیرت انگیز
انکار و اقرار پر ایک سیدھا سوال کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو کچھ نہ فرما سکے۔ جواب دیا تو
یہ کہ تحریک پر اصرار کیوں ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ جو سلوک مولانا محمد علی کے ساتھ جمعیۃ العلماء
کے جلسہ میں حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کیا اور باوجود ان کے رکن جمعیت اور اس کی انتظامیہ
اور عاملہ دونوں مجالس کے رکن ہونے کے اپنی تقریر میں کہا کہ میں محمد علی کو تو جمعیت کا رکن ہی
تسلیم نہیں کرتا۔ اور جس طرح مسلم لیگ جلسہ میں جو گذشتہ اواخر مارچ میں ہوا انھوں نے لیمیز اللّٰہ
الخبیث من الطیب کی آیۂ کریمہ پڑھ کر نہرو رپورٹ کے مخالفین کو "خبیث" کا لقب عطا فرمایا
تھا اور نہروانیوں کو "طیب" کا۔ اور جس طرح مقدم الذکر جماعت کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر
محمد عالم کو صدر تجویز کر کے بلا رائے لیے ہوئے کرسی صدارت پر بٹھا دیا تھا۔ اور اسی طرح ایک

[1] میرٹھ والے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ اسوقت بھی قومی کاموں میں پیش پیش تھے۔ بعد کو مسلم لیگ کے رکن اعظم ہوئے ۱۹۴۸ء

تجویز نہرو رپورٹ کے متعلق پاس کرلی تھی۔ اس سے خطرہ ہے کہ جلسے کے لیے لوگوں کے آتے ہی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے بھائی نعیم خود آپ کا نام صدارت کے لیے پیش کر دینگے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ آپ خود ہی بہ حیثیت داعی جلسہ محمد علی کا نام پیش فرمائیں، تاکہ وہی بے لطفی پیدا نہ ہو جو مرادآباد میں جمعیۃ العلماء کی صدارت کے لیے ان کا نام پیش کیے جانے کے باعث کانپور کے سالانہ اجلاس جمعیۃ العلماء کی مجلس استقبالیہ کو آج تک نصیب ہو رہی ہے.........

اس کے بعد ان ہی کی طرف سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ صدر کا انتخاب تو حاضرین جلسہ کے ہاتھ میں ہے۔ تو ان سے عرض کیا گیا کہ یہ کلیہ نہیں ہے۔ خود جمعیۃ کے سالانہ جلسے کے لیے خلافت کانفرنس، کانگرس، مسلم لیگ وغیرہ کے لیے پہلے ہی انتخاب کرلیا جاتا ہے، تاکہ اس قسم کی ناگوار حالت پیدا نہ ہو۔ جو کانگرس کو سورت میں ۱۹۰۶ء میں پیش آئی تھی۔ دہلی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس آپ نے منعقد کرائی تھی اس کے لیے آغاخاں کا انتخاب ان کے ولایت جانے سے بھی پیشتر کرکے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ آپ لوگ بحیثیت داعیان کے انتخاب کرلیجیے اور اسی حیثیت سے جلسہ کا آغاز کل صبح فرماکر محمد علی سے صدارت کرائیے۔ یہ معاملہ صرف فتویٰ دینے کا نہیں ہے۔ فتویٰ تو جمعیۃ العلماء دے ہی چکی ہے۔ اب مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کرانے کی تدبیر پر غور کرنے اور ہر عقیدے اور ہر سیاسی روش کے مسلمان کو متحد کرکے شریعت کے احترام کرانے کا ہے۔ مفتی صاحب نے اس پر کہا کہ اچھا ہم تینوں داعی اس کا فیصلہ کرلیں گے کہ محمد علی کا نام میں پیش کروں یا جمیل میاں پیش کریں اور میں تائید کروں۔ چونکہ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اسی شب کو مسجد جامع میں فلسطین، افغانستان، شام، دابل وغیرہ کے متعلق بالتفصیل تقریر کرنا شروع کروں گا۔ اور دو تین روز تک اس سلسلہ کو جاری رکھوں گا۔ تاکہ ایک عرصہ سے میری دہلی کی غیر حاضری کے باعث اظہار خیالات کا جو موقع نہیں مل سکا ہے، وہ مل جائے۔ اور یہاں خلاف توقع صرف صدارت ہی

کے مسئلہ پر دیر تک بحث چھڑ جانے کے باعث ہمیں مولانا نثار احمد[1] وغیرہ کو مسجد جامع کا جلسہ شروع کر دینے کے لیے بھیجنا پڑا۔ اس لیے اب ہم لوگ اٹھ کر مسجد جامع کو چلے گئے۔ جہاں دہلی کے مسلم رضاکاروں کی ایک جمعیت نے تین راتوں کے لیے جلسوں کا پوسٹر وغیرہ کے ذریعہ اعلان اور روشنی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا، اور مفتی صاحب وغیرہ کو جمیل میاں کے پاس چھوڑ گئے۔ وہاں پہنچ تو دیکھا مولانا عبدالحلیم صدیقی[2] ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے بیچ میں کود پڑے تھے، اور جمعیۃ العلماء اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی فضیلت میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے وعظ دے رہے تھے، اور مولانا نثار احمد صاحب کو لب کشائی کا بھی موقع نہ دیا تھا، دوسرے دن بجائے مفتی صاحب کے جلسے کا بحیثیت داعی کے آغاز کرنے کے احمد سعید نے آغاز کر دیا اور یعقوب[3] کی اور مولانا عبدالحلیم کی تقریریں ہونے لگیں جس کے باعث یوں ہی فضا مکدر ہو گئی۔ اب حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مفتی صاحب کا نام پیش کر دیا۔ نعیم نے بھی اسی طرح کی تقریر کی (میں اب نہیں کہہ سکتا کہ کس کس نے تقریر کی۔ مگر جہاں تک ایک مریض کا حافظہ کام دے رہا ہے لکھ رہا ہوں) بالآخر خواجہ غلام السبطین نے جو انتظامات جلسہ اور دعوت ناموں کے اجرا میں احمد سعید کے ساتھ شریک مقرر کیے گئے تھے، رات کا فیصلہ مفتی صاحب کو یاد دلایا۔ اور مفتی صاحب نے مبہم طریقہ پر اس کی ایک حد تک تصدیق کی۔ مگر یہ نہ کہا کہ ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ بحیثیت داعی ہم خود ہی صدر کو منتخب کر لیں گے۔ کہا تو یہ کہ مجھے اس وقت تک فرصت نہیں ملی کہ جمیل میاں سے طے کرتا کہ وہ محمد علی کا نام پیش کریں اور میں تائید کروں یا میں خود تحریک کروں اور وہ تائید کریں۔ اب بحث اور چھڑ گئی اور

---

[1] کانپور اور آگرہ والے۔ کراچی میں ۱۹۲۱ء میں مولانا کے ساتھ ہی سزایاب ہوئے تھے اور اس وقت یہی مولانا کے مخلصوں میں تھے۔ چند سال ہوئے وفات پائی [2] جمعیۃ العلماء کے ایک سرگرم رکن اس وقت کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں استاذ ہیں [3] محمد یعقوب صاحب (علیگ) مراد آبادی ڈپٹی پریسیڈنٹ انڈین اسمبلی۔ بعد کو حیدرآباد میں ریفارم افیسر ہو گئے اور وہیں دفعۃً انتقال کیا،

گلابی وہابیوں کی تائید ایک پکے وہابی مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس طرح فرمائی کہ خود مجھ سے اپیل کیا کہ میں اپنا نام واپس لے لوں، میں نے مجبور ہو کر ایک تقریر کی اور اس کے آخر میں یہ کہہ کر اپنا نام واپس لے لیا کہ مجھ پر اس اپیل کے خلوص کا تو مطلق اثر نہیں ہوا۔ مگر جو حالات پیش آئے ہیں انکے بعد اس مجلس کی صدارت کرنا میں اپنی توہین سمجھوں گا۔

برادرم! جو ذہنیت ان دینداروں کی اور جو مکاری ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی اسے اس طرح ایک ایسے معاملہ میں بھی دیکھ کر جس میں ہمیں اپنی شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کیلیے غیروں کو بھی حاملین شریعت کے افکار اور ان کے اعمال سے متاثر کرنا تھا اور ہر عقیدے اور طبقے کے مسلمانوں کے اس امر میں اتحاد و اتفاق کو عالم آشکارا کرنا تھا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے جمعیۃ العلماء کی صدارت کا کبھی بھی خیال نہ کیا تھا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ایک خاص جماعت کو پُر اصرار ہے اور بلا مجھ سے استمزاج کیے ہوئے انھوں نے چند ماہ پیشتر ہی میرا نام مجلس استقبالیہ کی طرف سے بھجوا دیا تھا۔ اور اس کے بعد علمائے کرام میں عجیب عجیب ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں۔ تو میں نے کانپور سے خط آنے پر اور مجلس استقبالیہ کے اصرار پر صرف اس کا وعدہ کیا تھا کہ خود انکار نہ کروں گا اور نہ خود کوئی کوشش کروں گا۔ اگر منتخب ہو گیا تو مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور جمعیۃ کی از سر نو ترتیب کے متعلق جو عرصہ دراز سے میرے خیالات ہیں، انھیں بصد عجز و ادب جمعیت کے سامنے پیش کر دوں گا۔ مگر جو کارروائی کہ مرادآباد میں ہوئی اور اس سے پیشتر جو مضامین اور خطوط الجمعیۃ میں شفیع داؤدی اور شوکت صاحب کے خلاف صوبہ بمبئی کی جمعیۃ العلماء کے جلسہ کی صدارت کے بارہ میں بطور پیش بندی کے شائع کیے گئے۔ اور جس طرح کانپور والوں کے ساتھ صریح اور مسلسل بے ایمانی کی گئی ہے۔ اور اب جس طرح بلا حصول رائے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب خود کھسک کر مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اس کے بعد میرے لیے

ناممکن ہوگیا کہ ان حضرات سے کوئی توقع اصلاح کی رکھوں۔ جب جلسہ شروع ہوگیا تو میرے پاس متعدد درخواستیں آئیں کہ جلسہ سے ہم سب اٹھ کر چل دیں۔ مگر میں نے انکار کیا اور سب کو روکا تاکہ حکومت کو اور ہنود کو اس نفاق و شقاق کا نظارہ نہ دکھایا جائے۔ سب بیٹھے رہے۔ البتہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ شام کے جلسے میں نہ آئیں گے۔ ہم نے کوئی احتجاج نہ کیا اور جو بیان ان تمام واقعات کے متعلق تیار کیا گیا، اس کے حرف حرف کو صحیح اور درست کرنے کے بعد خود میں نے اس کی اشاعت کو روک دیا۔ جن لوگوں نے جمعیۃ العلماء سے استعفے دیے ان کے استعفوں کو بھی اس وقت نہ بھجوانے دیا۔ ہماری جماعت نے وائسرائے کے پاس جو وفد بھیجے کا فیصلہ کیا تھا، اسمیں بھی علاوہ مولانا حسین احمد صاحب کے اور دیوبند کے اکابر کے خود مفتی صاحب کو بھی شامل کیا لیکن شام کے جلسہ میں یوں بھی نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ علیل ہوگیا تھا۔ مفتی صاحب ان تمام بیہودگیوں کے بعد اشک شوئی کے لیے میری عیادت کے نام سے تشریف لائے۔ اور میں نے انھیں ناشتہ کرایا۔ اور وفد میں جانے کے لیے نواب اسماعیل خاں نے ان سے کہا اور انھوں نے اقرار کیا۔ مگر دوسرے دن یہ لکھ کر علیحدہ ہوگئے کہ شام کو میری "جماعت" (جمعیت نہیں۔ اس لیے کہ اس نے اس کے خلاف کوئی قرارداد نہیں کی) نے کہا کہ تم نہ جانا۔ تاہم میں نے ان سے احکام شریعت دربارۂ نکاح حاصل کیے اور گو مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عنایت اللہ صاحب کے بیانات نے جو بحد مفصل اور مرتب تھے، مجھے اس سے مستغنی کر دیا تھا۔ تاہم میں نے بار بار مفتی صاحب سے ان کے بیان کا تقاضا کیا۔ اور باوجود اپنی علالت کے ان سے ملنے گیا۔ مولانا حسین احمد صاحب شاہجہانپور جارہے تھے اور وہاں کئی روز وعظوں میں تھے۔ تاہم میرے اصرار پر تشریف لائے۔ اور اسٹیشن سے سیدھے گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم[۱] نے آنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

[۱] مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی، ناظم دار العلوم دیوبند۔

مگر مرض الموت نے نہ آنے دیا۔ اور طیب[1] کو اپنی جگہ بھجوایا۔ لیکن مفتی صاحب اور ان کے حواریوں کا رویہ دیکھیے کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے ایک تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا کہ خدارا ہمیں گورنمنٹ کے آستانہ پر سر جھکانے کے لیے نہ لے جایئے۔ ہم پر رحم کیجئے (حالانکہ احمد سعید Age of[2] Consent committe) کے سامنے غلط سلط شہادت دینے کے لیے بلا تامل چلے گئے تھے۔ بہار کے سجاد نے ہم پر وائسرائے کی دست بوسی کی تہمت لگائی اور احمد سعید نے ابھی الجمعیۃ میں دروغ بافیوں کا عرصہ تک سلسلہ جاری رکھا۔ (جو حقیقۃً آج تک جاری ہے) آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان ہم دونوں کو بیگار سمجھ کر سارا کام ہمیں پر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہ سنکر آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کو اسی جاہل مطلق نے جاکر سونے سے جگایا تھا۔ اور ہمدرد میں میرا ہی مضمون اواخر مارچ ۲۹ء میں اس بل کے خلاف شائع ہوا تھا اور اسکو لے کر میں صدر جمعیۃ العلماء کی خدمت میں خود حاضر ہوا تھا۔ اور اس پر بھی ان کی غفلت کا وہ عالم رہا کہ نہرو رپورٹ کے معاملے میں تو یہ اس کی تائید میں درپردہ کوشش کر رہے ہیں۔ مگر شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے شاردا بل کے منظور ہو جانے تک اسقدر کم کام کیا کہ نہیں کرنے کے برابر ہے۔ بہرحال اب باوجود بصارت اور اعصاب کی اس حالت کے اور بخار جاڑے کے دو تین دن میں نے Age of Consent کمیٹی کی رپورٹ پڑھی اور ۲۵ ٹائپ کے صفحات کا تحریری بیان تیار کیا۔ اور ساری رات اور سارے دن خود ہی جاگ کر اور آرام لیے یا کھانا کھائے بغیر اسے ٹائپ کرکے ایک دن پہلے وائسرائے کے سکریٹری کو دے آیا۔ مسلمانوں کی قوم میں ایک بھی ٹائپسٹ نہ ملا جو اس کام کو کرتا۔

تین بجے شام کو یہ بیان وائسرائے کو ملا۔ بیچارہ کو گھنٹہ بھر بھی اس کے دیکھنے کو نہ ملا ہوگا۔

---

[1] مولانا محمد طیب دیوبندی موجودہ ناظم دارالعلوم دیوبند [2] کمیٹی برائے عمر رضامندی

دوسرے دن گیارہ بجے وفد پہنچا۔ جو جواب دیا اس کا جواب ہمارے تحریری بیان میں پہلے سے موجود تھا۔ جب اس نے کہا کہ آپ کے بیان پر میں اس وقت تک صرف ایک سرسری نظر ڈال چکا ہوں تو میں نے اس اقبال سے فائدہ اٹھایا۔ اور کہا کہ آج ہم آپ سے جواب لینا نہیں چاہتے جب آپ اسے دوبارہ اچھی طرح سے پڑھ لیں گے۔ تو آخری جواب اس وقت لیں گے۔ چنانچہ ۱۵ر نومبر کو باوجودیکہ وہ اسی دن دکن کے دورہ پر جا رہا تھا، ڈیڑھ گھنٹہ اس سے مفصل اور صاف صاف گفتگو رہی۔ اور وہ قائل ہوگیا کہ ہم اپنے عقائد اسلامی پر قائم رہتے ہوئے اس قانون کو قبول نہیں کر سکتے۔ گو ہنود کے باعث اپنی مجبوری کا بھی اظہار کیا۔ (اس کو راز ہی میں رکھیے) دوسرے ہی دن وہ نواب صاحب سے ملا اور کہا کہ اگر محمد علی نے Test case اس بنا پر جیت لیا کہ میں نے جس بل کے پیش ہونے سے پیشتر اس کے پیش ہونے کی اجازت دی تھی (جس کے بغیر کسی کے مذہب یا مذہبی رسم و رواج کے متعلق کوئی مسودہ ہی نہیں پیش ہو سکتا) وہ صرف ہنود کے لیے تھی تو میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور مسلمانوں پر اس کا نفاذ کسی دوسرے بل کے ذریعہ سے نہیں ہونے دوں گا۔ میں وائسرائے سے ملنے سے پیشتر مفتی صاحب اور احمد سعید کے سامنے جامع مسجد میں مسلمانوں کو جتا کر گیا تھا کہ کیا کہنے جاتا ہوں اور واپس آکر مسجد جامع میں نماز مغرب سے قبل جو گفتگو ہوئی تھی، سب دہرا دی اور دونوں کو گھر سے بلوا کر ان ہی کے سامنے سب کچھ کہا۔ تاہم ان کی حرکات ملاحظہ ہوں کہ ایک مجلس ناموس تحفظ شریعت بناتے ہیں۔ جس میں نہروانی جماعت[1] حبیب الرحمٰن لدھیانوی، نعیم اور ظفر علی خاں تک ہیں لیکن میرا نام تک نہیں۔ ان کی بے سود ہڑتال کی میں نے مخالفت نہیں کی، گو اسے بے سود اور غیر مؤثر سمجھا، تاہم مجھے بدنام کیا گیا۔ پھر جب اس سے بھی کام نہ نکلا تو جلوس نکالا، مجھ سے آکر ملے اور

[1] نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں صدر کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کے ہم خیال لوگ۔

امداد چاہی تو میں نے اس جلسہ میں بھی ان کی صدارت میں تحریک پیش کی۔ گو انھوں نے میری رائے پر عمل نہ کیا، اور جلوس کو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی کچہری تک نہ لے گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے پاس کچھ نہ تھا۔ میرے گھر آئے، میں نہ تھا۔ دوسرے دن میں اسمٰعیل خاں اور شفیع کو لے کر ان کے گھر گیا تو انھوں نے کہا کہ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ تب میں نے وہی تدبیر بتائی جو میں انڈیپنڈنٹ کے قیام میں طے کر چکا تھا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ مگر اس طریقہ پر نہیں جس سے شریعت بدنام ہو یعنی محض خلاف ورزی کی خاطر بلا ضرورت گڈے گڑیا کا بیاہ کرنا بلکہ جس لڑکے کو جس کی عمر ۱۶ یا ۱۷ سال کی ہو، "توقان" کے باعث نکاح کی ضرورت ہو اور وہ اس حالت میں فرض یا کم سے کم واجب ہی ہوتا ہو، ایک ۱۵ یا ۱۶ برس کی تندرست اور بالغ لڑکی سے اس کا نکاح کرا دینا یا نابالغہ کا نکاح اس کے ولی کے حکم سے کرانا جبکہ اسے عمر یا سفر کے باعث اندیشہ ہو کہ اگر وہ مر گیا تو لڑکی یا اس کا مال ومتاع خراب لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جائے گا اور اس لیے وہ اس کے سسر وغیرہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ یا ایسی حالت میں جب کہ لڑکی کی ماں زندہ نہیں ہے یا بڑی بہن کی شادی ہونے کے بعد وہ رخصت کر دی جائے گی۔ اور اس کی تربیت کے لیے ساس کے سوا کوئی عورت میسر نہیں ہے یا ولی اس قدر غریب ہے کہ بچی کی پرورش نہیں کر سکتا اور سسر کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف ان ہی حالتوں میں نکاح پڑھوا کر اور رخصت کرا کے شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے۔[1]

یہاں تک ۱۱ اپریل کو لکھا جا چکا تھا، مگر اتنا لکھنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ دوسرے دن کے لیے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے دن آنکھوں کے Specialist کے پاس گیا۔ اور اس نے بہت محنت کے ساتھ آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ بائیں آنکھ

---

[1] اس کے آگے مکتوب مولانا کا لکھا ہوا نہیں، کسی اور کے قلم کا ہے۔

تو بالکل جا ہی چکی ہے۔ اس سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے۔ لیکن سیدھی آنکھ کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپنے حال ہی میں نگاہ پر زیادہ زور ڈالا ہے یا جوش کی حالت میں کسی سے باتیں کی ہیں۔ اس لیے کہ خون کی ایک دو پھٹکیں تازہ نظر آ رہی ہیں۔ غالباً یہ اسی عریضہ کے متعلق ڈاکٹر کا خیال تھا۔ یا ایک اور خط کے متعلق جس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں، جو میں نے سپرو[1] کو خود ہی بیٹھ کر مسلسل چھ گھنٹے میں ٹائپ کیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر کا بیان ہے کہ آنکھ کی Blood vessel[2] دیواریں پھٹنے کے بعد اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب ہر وقت دوبارہ پھٹنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت تک خدا کا بڑا فضل ہوا ہے کہ گو ہر طرف خون کی چند پھٹکیں موجود ہیں جو بصارت کو دھندلا کر رہی ہیں۔ مگر بیچ کے دائرے میں جسے MACULA کہتے ہیں ایک پھٹک بھی موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ اسی آنکھ کی بصارت ہے۔ اگر آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا یا تقریر کی تو نہیں کہہ سکتا کہ چند سکنڈ یا چند منٹوں یا چند گھنٹوں میں آپ بالکل اندھے نہ ہو جائیں۔ آپ کی آنکھ کے لیے کوئی دوا نہیں جو مفید ثابت ہو، سوائے اصل مرض کے علاج کے جو ذیابیطس ہے۔ اور سال دو سال کے مسلسل آرام کے۔ میں تو کہوں گا کہ آپ نوکر کو بھی کمرے میں نہ پکارا کریں بلکہ اسے کمرے ہی میں بیٹھے رہنے دیں۔ تاکہ اشارے سے بلا سکیں۔ اس لیے اس کو پکار کر بلانے سے بھی آنکھ کے کسی نہ کسی Blood vessel کے پھٹنے کا اندیشہ ہے اور اگر (Hemorrage)[3] ہو گیا اور خون کی پھٹک آنکھ کے سامنے آ گئی تو آپ بالکل اندھے ہو جائیں گے۔ کامل ایک گھنٹہ کے امتحان کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے Eye[4] Specialist کی یہ رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو دور رکھو، اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بالخصوص اس زمانہ

---

[1] سر تیج بہادر سپرو۔ ہندوستان کی لبرل پارٹی کے مشہور لیڈر [2] شریان خون [3] سیلان خون [4] ماہر امراض چشم

میں جب کہ بظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت و سماجت پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض باوجود ہماری آجکل کی منت سماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف چھپٹے چلے جا رہے ہیں۔ اور صرف اس لیے کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اور ان سنئیہ گرہی سورماؤں کو اپنی حفاظت کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ کریں۔ ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر بھی جو ان کا جواب نہیں دے سکتا متواتر حملے کر رہے ہیں۔ اور اس کے خلاف گندے سے گندے اور چھوٹے سے چھوٹا پروپگنڈا کر رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ حاملین شریعت حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد اور رہنما ہیں اور الجمیعۃ[1] کے کالم اس کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔ اب ان جملہ ہائے معترضہ کو میں یہیں ختم کرتا ہوں اور اپنے عریضہ کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتا ہوں۔ میری بتائی ہوئی تدبیر پر خوب جرح و قدح کی گئی اور جو تدبیریں بتائی جا رہی تھیں یعنی شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ وغیرہ۔ اس پر بھی غور کیا گیا اور آخر کو یہی طے پایا کہ دہلی میں ہم سب مل کر متفقہ طور پر متذکرۂ بالا قسم کا نکاح پڑھوا کر ساردا ایکٹ کی خلاف ورزی کریں اور جب ہم پر مقدمہ چلایا جائے تو عذر پیش کریں کہ اس قانون کا نفاذ مسلمانوں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ہماری شریعت کے خلاف ہے، اور ایسے قانون کو مجلسِ مقننہ میں پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل سے

(مکتوب اس مقام پر اچانک ختم ہو گیا ہے۔ اس کے آگے کے فقرے پھر مولانا کے قلم کے ہیں)

[1] جمیعۃ العلماء کا اخبار جو اس وقت ہفتہ وار یا سہ روزہ تھا۔

برادرم ایک اپاہج بھائی سے جس قدر لکھایا لکھوایا جا سکا۔ کیا گیا۔ مگر اتنے دن کے انتظار کے بعد مجبور ہو کر اس عریضے کو اسی طرح ناتمام بھیج رہا ہوں۔ میری آخری تحریر ہے۔ آخری تقریر بی اماں کے مولد امروہہ میں ۳ رہر ۵ رکو کروں گا[1]۔ براہ کرم وہاں تشریف لے آیئے۔ کانپور کا وعدہ فرمانے کے باوجود انتظار ہی دکھایا[2]۔ اگر میں واقعی اب بھی اس قابل ہوں کہ آپ جیسا مسلمان مجھ سے مل سکے تو ضرور آیئے۔

آپ کا اپاہج بھائی

محمد علی

---

[1] امروہہ میں جمیعۃ العلماء جدید کا جلسہ تھا۔ یہ انتہائی حسرت و یاس کے لفظ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے لیڈر کے قلم سے کل ۵۲ سال کی عمر میں نکل رہے ہیں۔

[2] کانپور میں مجبوراً مولانا کو اپنے جدید رفیقوں کے ساتھ مل کر ایک جدید جمیعۃ العلماء بنانا پڑی تھی۔

باب (۸۲)

سنہ ۱۹۳۰ء (۳)

("یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہی")

صحابیوں کے سرتاج عمر فاروقؓ سے متعلق جب حدیث نبوی میں یہ مضمون نظر سے گذرا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے ان کا کوئی دوست باقی نہ رکھا۔ تو دل پر بڑا اثر پڑا تھا، اور حیرت بھی ہوئی تھی۔ قدرت حق نے اس کا ایک ہلکا نمونہ آنکھوں کو دکھا دیا محمد علی اس آفتاب کے سامنے ایک ذرہ سہی، لیکن بہرحال اس ذرہ پر بھی اسی آفتاب کا پرتو پڑ رہا تھا۔ یہ مخالف، وہ مخالف، عمر بھر کے دوست رفیق، عزیز مخالف۔ جو اپنے خاص دست و بازو تھے وہ مخالف۔ اب کارٹون ان کے نکل رہے ہیں، ہجویں ان کی چھپ رہی ہیں، اور مخالفانہ مضمونوں اور تقریروں کی تو حد ہی نہیں۔ اور یہ ساری یورش اس محمد علی پر، جس کی بائیں آنکھ تو بالکل ہی جا چکی، اور داہنی آنکھ کے بھی چلے جانے کا ہر وقت خطرہ۔ زور سے بات کرنا تک منع تھا! ——— عجب تماشہ تھا۔ کل تک عین مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں یہ الزام بعض مقدسین کی زبان سے لگایا جا رہا تھا کہ محمد علی تو بالکل ہندوؤں کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ برابر مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں بولتے۔ اور آج جب محمد علی کانگرس میں اندھا دھند شرکت سے رکنے لگے، تو خود ہی لوگ پلٹ پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ تو عین انگریز پرستی ہے، یہ ہمیں آزادی

کی راہ سے روک رہے ہیں!

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا!

لمبا چوڑا خط جس کے بعض حصے خونِ جگر سے لکھے ہوئے ہیں، ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن جی نہیں مانتا کہ بعض فقروں پر دوبارہ آپ کو توجہ نہ دلائی جائے۔ سنیئے:-

"....... یہ ہندوستان کے سب سے بڑے ماہر امراض چشم کی رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو دور رکھ، اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ بہ ظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت و سماجت پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے، اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے الٹے بعض ان میں وہ ہماری آجکل کی منت و سماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف جھپٹے چلے جا رہے ہیں، اور صرف اس لیے کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اور ان سفیہ گرہی سورماؤں کو اپنی حفاظت کا سوا اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ کریں۔ ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر جو ان کا جواب بھی نہیں دے سکتا، متواتر حملہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے خلاف گندے سے گندے اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اور لطف یہ ہے حاملین شریعت حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد و رہنما ہیں اور الجمعیۃ[1] کے کالم اس کیلیے وقف ہو گئے ہیں۔"

[1] ظاہر ہے کہ یہ سنہ ۱۹۳۰ء کے الجمعیۃ کا ذکر ہے، نہ کہ اس ڈائری کے مسودہ کے وقت کا۔ سنہ ۴۹ء کے الجمعیۃ کا، ورنہ اور نہ اس کی نظرثانی کے وقت سنہ ۱۹۵۲ء کے الجمعیۃ کا۔

اجلاس جمعیۃ العلماء کی صدارت کے لیے مولانا کا نام بعض علماء ہی کی طرف سے پیش ہوا۔ لیکن بعض بڑے ذمہ دار اور اونچے قسم کے علماء نے یہ کہہ کر اس کی شدید مخالفت کی کہ محمد علی "عالم" نہیں ہیں۔ اعتراض ضابطہ سے صحیح تھا لیکن اول تو بعض غیر علما اس کے قبل بھی جمعیۃ کی صدارت کر چکے تھے، اس کی نظیر موجود تھی۔ دوسرے محمد علی کا اصل استدلال یہ تھا کہ مذہبی مباحث میں تو علماء کی قیادت بیشک مسلّم لیکن جمعیۃ جب مذہبی مسائل پر نہیں بلکہ سیاسی امور پر بحث کر رہی ہے تو اب عالم اور غیر عالم کے کوئی معنی نہیں۔ علماء کا احترام اپنی جگہ پر قطعاً مسلّم لیکن صرف مذہبیات کے حدود کے اندر۔ یہ نہیں کہ عالم کو ہر حال میں اور ہر موقع پر غیر عالم سے بلند تر رکھا جائے محض دنیوی مسائل پر جہاں بحث ہو گی، وہاں عالم و غیر عالم ہر مسلمان کا درجہ یکساں ہے۔ محمد علی باوجود اپنی علیگڈھی اور ولایتی تعلیم و تربیت کے علماء کے احترام کے ہرگز منکر نہ تھے۔ وہ ان کے پورے مرتبہ شناس و قدر شناس تھے۔ لیکن اس میں غلو کے بھی قائل نہ تھے۔ درجۂ اعتدال و توازن قائم رکھے ہوئے تھے۔ احترام واجب کے ڈانڈے پرستش سے الگ کیے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح ڈاکٹر صرف مسائلِ طب میں مستند و معتمد ہے، اور وکیل صرف مسائلِ قانون میں، اسی طرح فقیہ صرف مسائلِ فقہ میں معتمد او محترم تسلیم کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ چونکہ وہ فقیہ ہے، اس لیے محفلِ مشاعرہ کا بھی صدر وہی ہو، مسائل طب میں بھی اسی کا حکم چلے، سیاسیات میں بھی وہی امام تسلیم کر لیا جائے — یہ نکتہ آج ایک موٹی اور معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت خدا معلوم کیوں بہتوں کی سمجھ میں یہ آیا نہیں، یا بعض کو اس کے نہ سمجھنے ہی میں مصلحت نظر آئی۔

بہرحال محمد علی کو بہت کچھ اس جرم میں سننا پڑا۔ اور یقیناً اس طوفانِ سب و شتم سے ان کے بہت سے گناہ زبان کے ڈھل گئے۔ ذیل میں اقتباسات اس قسم کی "شریفانہ" تحریروں کے

کے دیے جاتے ہیں کہ ڈائری خواں کچھ تو اس وقت کی فضا کی تیرگی کا اندازہ کر سکیں۔۔۔۔ لیکن نہیں، اس سے سوا اس کے کہ آج اتنے دنوں کے بعد پھر کچھ تلخیاں عود کر آئیں، اور ناظرین کو بھی مزید غصہ اُن وقت کے مخالفین و معاندین پر آ جائے، اور کچھ حاصل نہیں اس لیے ان اقتباسات کی یہاں تلاش نہ فرمائیے۔

یہ سب کچھ تھا ہی، اُدھر لڑکی کی شادی کی تاریخ سر پر چڑھی چلی آ رہی تھی۔ اوپر گذر چکا ہے کہ گلنار بی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ منگیتر شعیب قریشی مولانا کے خاص رفیقوں میں رہ چکے تھے۔ سن سے ذرا اتر چلے تھے۔ مگر ماشاء اللہ ہر طرح کس بل سے درست، خوب ٹانٹھے، جیسا کہ ہر جوان صالح و پاکباز جوانی کے بعد تک رہتا ہے۔ تاریخ بالآخر طے پا گئی۔ اور دعوت نامہ اس نیاز مند کے نام موصول ہوا، دعوت نامے بہت ہی محدود تعداد میں جاری ہوئے تھے۔ مخصوصین کے نام نہیں، بلکہ مخصوصین میں جو اخص تھے، صرف ان ہی کے نام۔ اور اسی فہرست میں یہ ڈائری نویس بھی داخل تھا، مولانا اب بمبئی سے دہلی واپس آ چکے تھے۔ اور قرول باغ میں جو نیا مکان اقبال منزل کے نام سے لیا تھا، وہیں مقیم تھے۔ اس مکان کو کوچہ چیلان والے وسیع مکان سے کوئی مناسبت نہ تھی، تاہم یہ بھی غنیمت تھا۔ کئی درجہ چھوٹے چھوٹے تھے۔ اور سب ملا کر فی الجملہ گزر کے قابل تھا۔ شادی اسی مکان سے ہونے والی تھی، اور خط یہیں سے موصول ہوا:

"۳ مئی ۳۱ء۔ اقبال منزل، قرول باغ، دہلی۔

برادرم ماجد میاں صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ایک نہایت ہی طویل مگر اپنی نابینائی کے باعث ناتمام عریضہ مدت ہوئی ارسال کر چکا ہوں۔

مگر اب تک رسید نہ ملی، کانپور آنے کا وعدہ کرکے نہ آئے۔[3] حالانکہ اس وعدہ میں بھی مجھ سے علیحدگی کا اعلان تھا۔ اب امروہہ بلایا تب بھی نہ آئے۔[5] سنا ہے بہن کی طبیعت نادرست ہے[6] اگر یہ ہے تو دست بہ دعا ہوں، گو

کیا کہوں میری دعا بھی تو نہیں ہے مقبول

ورنہ خود حالت اس قدر خراب کیوں ہوتی۔

گلنار کا نکاح چھ بجے شام کو بہ تاریخ ۲۹ ذی الحجہ ۲۹ مئی قرار پایا ہے۔ مع بہن اور بچوں کے تشریف لایئے۔ آپ کا سخت انتظار ہے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کا انتقال ہوگیا۔[7] عالی حضرت نواب صاحب رامپور سخت علیل ہیں۔[8] مگر اپنی مجبوریوں کے باعث معذور ہوں۔[9] یہ سنت مارچ سے ٹلتے ٹلتے آخر مئی تک آپہنچی۔ تشریف آوری کے وقت مطلع فرمایئے۔

ہمدرد کے نام پیسے آتا تھا جو بند ہوگیا۔ تعجب ہے کہ پیسے میرے نام جاری نہ ہوا۔[10]

آپ کا بھائی، محمد علی"

مکتوب میں کئی باتیں تشریح طلب ہیں۔ اس لیے کتابت میں اس پر ہندسہ ڈال کر تشریحات نمبروار ذیل میں عرض کیجاتی ہیں:۔

[1] وہی طویل مکتوب بمبئی سے ۱۱ اپریل کا لکھا ہوا ہے، جو اوپر درج ہو چکا۔

[2] یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا کا مکتوب آئے، اور جواب نہ عرض کیا جائے۔ خدا معلوم اس وقت کیا صورت پیش آگئی تھی، جو مولانا تک جواب نہ پہنچ سکا۔

[3] کانپور میں جدید جمعیۃ العلماء کا افتتاحی جلسہ ہوا تھا۔ اور کانپور ہی اس جدید جمعیۃ کا مستقر قرار پایا تھا۔ صدر، غالباً مولانا ہی مقرر ہوئے تھے۔ اصلی کارکن اور بہت پیش پیش مولانا

عبد الماجد بدایونی تھے۔

۲؎ میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ آپ جہاں کہیں بھی موجود ہوں اور جس غرض سے بھی بلائیں، مجھے حاضری میں کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن یہ حاضری محض شخصی تعلقِ اخلاص و نیازمندی کی بنا پر ہوگی، نہ کہ اس مجلس کے ساتھ ہم آہنگی کی بنا پر۔ مولانا نے اس کو اپنے سے علٰحدگی کے معنی میں لیا۔

۳؎ امروہہ میں دوسرا جلسہ اسی جدید جمعیۃ کا بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ اور اس میں مولانا نے گویا اپنا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ بڑا چرچا ان کی اس تقریر کا رہا تھا۔

۴؎ عین اُس وقت تو نہیں لیکن اس سے کچھ قبل گھر میں طبیعت زیادہ علیل تھی۔

۵؎ نواب سلطان جہاں بیگم نور اللہ مرقدہا مراد ہیں۔ بڑی مسلم صفت و درویش دل فرمانروا گزری ہیں۔

۶؎ ہز ہائینس نواب حامد علی خاں مراد ہیں۔ اسی کے چند روز بعد انتقال کر گئے۔ یہ وہی ذات شریف ہیں، جنھوں نے اپنی آخر عمر تک محمد علی کو رام پور میں قدم نہ رکھنے دیا۔ حالانکہ محمد علی اپنی طرف سے ان کی ذات خاص کے ساتھ برابر تعلق وفاداری و نیازمندی قائم رکھے رہے۔

۷؎ مطلب یہ کہ ان حالات کا اقتضا یہ تھا کہ عقد کی تاریخ کچھ بڑھا دی جائے لیکن دوسری معذوریاں اس راہ میں بھی حائل تھیں۔

۸؎ حضرت مولانا تھانویؒ اور خود محمد علیؒ، یہ دونوں بزرگ ایسے گزرے ہیں کہ ان سے جہاں مجھے انتہائی عقیدت اور محبت تھی، وہیں میں ان سے ڈرتا بھی بہت رہتا تھا۔ دونوں کے احساس نہایت نازک و لطیف تھے۔ ادنیٰ سی ادنی چیز پر بھی نظر رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان دونوں بزرگوں کے نام سچ یا صدق جاری نہیں کیا، اس ڈر سے کہ خدا معلوم کون سی تحریر ان کے مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ اور فوراً مجھ سے مواخذہ ہونے لگے

——— مولانا محمد علیؒ نے بعد کو ایک بار زبانی بھی تقاضا کیا کہ سچ میرے نام کیوں نہیں آتا۔ میں نے جواب عرض کیا کہ "مجھے اپنا تعلق نیازمندی آپ کے ساتھ بہت ہی عزیز ہے، اور اس کے تحفظ کے خیال سے میں نہیں چاہتا کہ آپ میرا اخبار پڑھتے رہیں۔"

باب (۴۳)

سنہ ۱۹۳۰ء (۴)

(چھوٹی لڑکی کا عقد۔ عالمِ ناسوت میں آخری ملاقات)

دعوت نامہ ایسے وقت پہنچا، جب میں تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی کی خدمت میں طویل عرصہ کے لیے مقیم تھا۔ حضرت تھانوی کے ساتھ گہری عقیدت دو ڈھائی سال سے پیدا ہو گئی تھی، پہلے تو ان کے مواعظ و تصانیف متعلق فنِ سلوک کو پڑھکر، اور پھر جب سے جولائی سنہ ۲۸ء میں پہلی بار ان کی زیارت ہوئی، اس وقت سے عقیدت کے درجات میں بھی ترقی ہو گئی تھی، اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔ چنانچہ اب جبکہ آخری مئی سنہ ۳۰ء تھا، یہاں ۵، ۶ ہفتوں کے قیام کے ارادہ سے آیا ہوا تھا، اور ابھی یہ مدت آدھی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ خط پاکر ایک عجب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ نہ جاؤں تو دل اسے کیسے گوارا کرے، جاؤں تو اس سفر کے لیے حضرت تھانوی سے اجازت حاصل کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں ــــــ مولانا سے اور حضرت سے بے لطفی ایک مدت سے چلی آرہی تھی، اور بے لطفی کا سبب خاص یعنی شدید سیاسی اختلاف، اب نسبتہً بہت ضعیف ہو چکا تھا، پھر بھی غلط فہمیوں کا پہاڑ درمیان میں حائل تھا ــــــ غلط فہمیوں اور باہمی رنجشوں سے جب رسول پاکؐ کے صحابیوں تک کا دامن نہ پاک رہ سکا، تو چودھویں صدی ہجری کے بزرگانِ امت کیلیے اس سے بری اور

تنزیہ کا دعویٰ کس منہ سے کیا جا سکتا ہے؟ یہ شان تو اس دنیا والوں کی نہیں ہے۔ صرف اہلِ جنت کی ہوگی کہ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ مِنْ غِلٍّ۔

ڈرتے ڈرتے حضرت کی خدمت میں ذکر کیا۔ اجازت صرف ملی ہی نہیں، بڑی خندہ جبینی اور انبساط قلب کے ساتھ ملی۔ یہی نہیں، اصرار و تاکید کے ساتھ ارشاد ہوا کہ "ضرور جائیے۔ اتنے قدیم تعلقات کے حقوق کی ادائی یہی ہے"۔ ——— کیا کہا جائے ان بدا دگروں کو جنھوں نے حضرت تھانوی کو "خشک" مشہور کر رکھا ہے! ——— بیوی اور بچیاں اس وقت سہارنپور میں تھیں۔ بھائی صاحب وہیں ڈپٹی کالکٹر تھے، اور اس سلسلہ میں میرے بھی اہل وعیال وہاں آکر عرصہ تک رہ جاتے تھے، تھانہ بھون سے وہاں کا فاصلہ ہی کیا تھا۔ سہارنپور آ سب کو لے لوا، ۵، ۶ آدمیوں کا قافلہ دہلی کو روانہ ہوگیا۔ شادی وغیرہ کی تقریبات میں شرکت کا اپنا عام معمول اس وقت بھی نہ تھا۔ عزیزوں کے ہاں شرکت کا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ محمد علی کے ہاں کی کشش عزیزوں کے ہاں سے بڑھ کر تھی۔ شدید گرمی میں سفر اختیار کر کے شریک ہوا، اور وہ بھی تنہا اپنی ذات سے نہیں، بیوی اور بچیوں کو لے کر شریک ہوا۔ ایک طرف یہ احساس بھی پورے طور پر تھا کہ مہمان جتنے بھی بڑھیں گے، خواہ مخواہ محمد علی پر زیر باری ہی ہوگی اور اس لیے عقل کا مشورہ یہی تھا کہ شریک نہ ہوا جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ ڈر بھی تھا کہ اگر ایکی بھی بلائے پر نہ گیا، محمد علی کو بڑی سخت ناخوشی ہوگی۔ اور یہی خیال آخر میں مرتبہ غالب آیا۔

محمد علی کے ساتھ اب سیاسی کام کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے، جو ابھی چند سال تک ان کے مشن کے مخالف رہ چکے تھے۔ سرکار برطانیہ سے اپنے ہوا خواہانہ تعلقات بنے کے لیے

بدنام تھے، اور "ٹینٹ" تحریک کے بالکل مخالف تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے ذاتی تعلقات محمد علی سے پہلے سے بھی بہت اچھے تھے، لیکن اب وہ ان کی سیاسیات میں بھی بہت پیش پیش ہوتے جا رہے تھے۔ سچ برابر اپنے اسی مسلک قدیم کے ساتھ، گو لب و لہجہ کو ہلکا کر کے نکل رہا تھا۔ سچ کو ان بزرگوار کی اتنی مداخلت خلافت کمیٹی میں کھٹکنا گواری کے ساتھ حیرت ہوئی اور ایک بار ڈرتے ڈرتے یہ عرض کرنا پڑا کہ اور کسی سے تو کچھ کہنے سننے کی ہمت نہیں، البتہ ملت کے سب سے زیادہ محبوب اور مخلص ترین لیڈر محمد علی سے یہ ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

صبح کوئی ۸، ۹ کا وقت ہو گا جب ہم لوگ اسٹیشن سے ایک شکرم[۱] پر لدے پھندے قرولباغ میں اقبال منزل کے دروازہ پر آ کر رکے، سامنے ہی نظر اپنے ہمنام مولانا بدایونی اور نواب محمد اسمٰعیل خاں (میرٹھ والے) پر پڑی۔ یہ لوگ اس وقت مولانا کے مخلص ترین رفیق تھے، اور مولانا بدایونی تو دور تحریک خلافت میں بھی بہت کچھ ساتھ دے چکے تھے۔ باہر کے مہمانوں میں یاد پڑتا ہے کہ بس ہم ہی تین تھے۔ اور باقی مہمانوں میں مولانا کے اعزہ و اہل خاندان تھے۔ چند ہی منٹ میں محمد علی خود دکھائی دیے۔ پر جوش معانقہ کے بعد فوراً بولے "آپ کے مصرعہ کے جواب میں جی میں آیا کہ سچ کو ایک پوسٹ کارڈ پر ایک شعر ہی لکھ کر بھیجوں ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!"

---

[۱] کرایہ کی گھوڑے گاڑی کو (جس میں دو گھوڑے جتے ہوتے تھے) شکرم کہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء تک دہلی میں اس کا رواج تھا۔ اور یہ اسٹیشن پر مل جایا کرتی تھی۔

شعر سننا تھا کہ جیسے میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا، ندامت کا احساس آج تک زندہ ہے ——
کیا گزر گئی ہو گی محمد علی کے قلب پر، جب مجھ جیسے ہمہ اخلاص و نیاز کے قلم سے وہ مصرعہ اپنی شان میں پڑھا ہو گا! یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس وقت تک وہ گالیاں کھاتے کھاتے اور سب و شتم سنتے سنتے ہر طنز و ہر تعریض کے بالکل عادی ہو چکے تھے، لیکن میرے قلم سے اس مصرعہ کے ادا ہونے کے معنی ہی کچھ اور تھے۔ حسین بن منصور حلاج کی حکایت سنی ہے کہ اوروں کے پھینکے ہوئے پتھر بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیے تھے لیکن ابوبکر شبلی کے ہاتھ کا پھول بھی نہ سہ سکے!

دہلی جمعیۃ العلماء کا مرکز و مستقر تھا، اور یہاں اس وقت محمد علی کی مخالفت شباب پر تھی۔ جامع مسجد کی جمعہ والی تقریروں میں کسی مقرر کا محمد علی کا مقابلہ میں ٹھہرنا مشکل تھا۔ حالانکہ جمعیۃ کے پاس خود بھی بڑے بڑے خوش بیان مقرر موجود تھے۔ آخر مولوی شاہ عطاء اللہ صاحب بخاری امرتسر سے دہلی لائے گئے۔ شاہ صاحب خطیبوں اور مقرروں کے سردار تھے خصوصاً عوام کے مجمعوں کے لیے تو خطیب اعظم۔ میرے دہلی پہنچتے ہی خبر یہ سننے میں آئی کہ مولانا کو پوری طرح زیر کرنے کے لیے یہ سب سے زیادہ زبردست توپ لے آئی گئی ہے۔ اور ان کے چیلنج کے الفاظ بھی سننے میں آئے، جھنکا دہرانا بھی اب تکلیف دہ ہے۔ خود مولانا سے ذکر آیا تو غصہ کے لہجہ میں نہیں بلکہ نیم مزاحیہ انداز میں بولے کہ "جی ہاں میں نے بھی سنا ہے، مسلم کے مقابلہ میں بخاری کو لایا گیا ہے"۔ "بخاری" اور "مسلم" کا تقابل ظاہر ہے۔ مولانا ان صنعتوں کے بادشاہ تھے۔ بہر حال اس لطیفہ گوئی سے اپنا دل مطمئن نہ ہو سکا، اور فکر یہ پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس فتنہ کو روکا جائے، ورنہ معاملہ بہت آگے بڑھ جائے گا، اور نتائج بڑے افسوسناک اور بہت دور رس نکلیں گے۔ معلوم ہوا بخاری شاہ صاحب قرولباغ ہی میں جامعہ ملیہ کے

ایک پنجابی استاد کے ہاں فروکش ہیں، ہمت کرکے وہاں پہنچا۔ مولانا سے اجازت لیے بغیر۔ اجازت لینے کی ہمت ہی کس میں تھی۔ شاہ صاحب اس ڈائری نویس پر شروع سے کرم فرمایا کرتے تھے آج بھی اسی گرمجوشی سے ملے۔ میں نے کھل کر عرض کیا کہ "آپ کی دہلی تشریف آوری کی غرض یہ سننے میں آئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ملت کی تو بڑی بدقسمتی ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ آپ مولانا کے رفیق کے حیثیت سے کام کرتے۔ جیسا کہ دو چار سال ادھر تحریک خلافت کے دور میں کر بھی چکے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ اگر اب نہیں ممکن، تو یہ تو کسی حال میں بھی نہ ہو کہ آپ اور وہ ایک میدان میں باہم حریف اور مناظر کی حیثیت سے قدم رکھیں، اور خلقت کچھ آپ کے ساتھ ہو کچھ ان کے ساتھ ہو۔ اس میں تو سارے مسلمانوں کی رسوائی ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری خاطر ہی سے اس تکلیف دہ امکان کو ختم کیجیے۔" شاہ صاحب نے جواب میں بڑی تشفی کی باتیں کیں، اور مجھے اطمینان دلایا کہ وہ خبر ہی مجھے بہت مبالغہ آمیز ملی تھی بہرحال اس کامیاب ملاقات کے بعد میں شاہ صاحب کا شکر گزار لوٹا، اور اُن کا یہ احسان آج تک یاد ہے۔

قیام دو ڈھائی دن رہا۔ ہمیشہ شگفتہ اور باغ و بہار رہنے والے محمد علی کو پہلی بار میں نے متفکر اور اداس پایا۔ عمر بھر کی زندہ دلی اب رخصت ہو رہی تھی۔ ۵۲ سال کی عمر میں ۶۴-۶۵ سال کے معلوم ہونے لگے تھے۔ ذاتی صدموں، جسمانی بیماریوں، مالی پریشانیوں، قومی اور ملی فکرمندیوں کے ہجوم نے وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا۔ نوشہ ڈاکٹر انصاری کے ہاں ٹھہرے تھے۔ باراتیوں میں سب سے پیش پیش عبد الرحمٰن صدیقی سندھی ایم اے تھے جو ایک طرف نوشہ کے حبیب لبیب تھے، اور دوسری طرف محمد علی کے مخلص قدیم

ہائے وہی عبدالرحمٰن جن کی قسمت میں چند ہی مہینہ بعد، لندن میں محمد علیؒ کو غسل میت دینا اور کفن پہنانا لکھا تھا! ــــــــــ دلہن والوں میں سب سے پیش پیش مولانا عبدالماجد بدایونی تھے۔ بارات سہ پہر کو موٹروں پر آئی۔ جامعہ ملیہ کی متعدد عمارتیں اس وقت قرولباغ ہی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی عمارت مع وسیع لالہ زار صحن کے، اقبال منزل سے قریب ہی تھی۔ بارات وہیں اتری، وہیں نکاح ہوا۔ خطبہ نکاح مولانا بدایونی نے پڑھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب، مولوی احمد سعید صاحب وغیرہم کی شرکت کا تو اب امکان ہی نہ تھا۔ رہے سہے تعلقات جو مولانا حسین احمد صاحب سے تھے، وہ بھی اس وقت تک ٹوٹ چکے تھے، سیاسی وملی اختلافات سے قطع نظر، محمد علی نے جیب سے ان کا ایک کارڈ بھی نکال کر دکھایا، جس میں دعوت نامہ کے جواب میں تقریب کے "اسرافی" پہلو پر کچھ گرفتیں تھیں۔ محمد علی کا دل ہر طرف سے ٹوٹا ہوا تھا، اس وقت ان فقروں کی برداشت کی قوت کہاں سے لاتا! بعد مغرب اسی لان پر چائے اور ناشتہ رہا۔

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی زوروں پر چل رہی تھی۔ اور محمد علی مسلمانوں کو لیے ہوئے اس سے علیحدہ تھے۔ اسی ہی قیام میں اپنے دو تین شعر اس تحریک کی رفتار سے متعلق سنائے، جن میں شوخی کے ساتھ ساتھ ذرا تلخی بھی تھی۔ افسوس ہے کہ اب حافظہ میں صرف ایک ہی مصرع ہے

یہ نمک سازی کرے اور وہ نمک پاشی کرے

باقی قافیے "خدمت کاشی کرے" "شب باشی کرے" تھے۔ اب یہ شعر بھلا کہاں مل سکتے ہیں؛

محمد علی کے بعض بے تکلف دوست اور مخلص اپنی بیویوں کو انکے سامنے لے آئے تھے میری دقیانوسیت مجھے اس کی اجازت نہ دے سکی۔ اسی قیام میں ایک روز رات کے وقت جب محمد علی زنانہ میں آئے تو بعض بعض بیویوں کو پردہ میں دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون کون ہیں، میرا

سلام کہہ دو۔ ان کی بیگم صاحبہ نے میری بیوی کو بتایا۔ بولے "بہن، مجھ اندھے سے کیا پردہ۔ اب میرے سامنے آنے میں کیا مضائقہ" ——— مسئلے کے شرعی و فقہی پہلو سے یہاں غرض نہیں، غور صرف اس پر کیجئے کہ حسرت کی کن گہرائیوں کے ساتھ یہ فقرہ دل سے نکلا ہوگا! بصارت ایک آنکھ کی تو واقعی جا چکی تھی، اور دوسری کی بھی اچھی خاصی دھندلی ہو چکی تھی! یہ بے نور ۸۰-۸۵ سال کے سن میں نہیں، کل ۷۵ سال کی عمر میں وہ آنکھیں ہو رہی تھیں، جنکی ذہانت کی چمک دمک ابھی کل تک دوسروں کو حیران کیے ہوئے تھی!

تیسری شام تھی کہ مولانا سے بعد مغرب رخصت ہوا ——— عالم ناسوت میں آخری رخصتی، آخری مصافحہ، آخری معانقہ! کون جان سکتا تھا کہ اب یہ پیارا پیارا چہرہ حشر تک دیکھنا نصیب نہ ہوگا! یہ محبت و اخلاص سے منور، اور اسلامیت کے نور سے دمکتا ہوا مکھڑا اب کبھی زندگی بھر دیکھنے میں نہ آئے گا! ؎

اب ہم ہیں اور یہاں تماشہ ہے حشر تک
آنکھیں ہوئی ہیں بند رخِ یار دیکھ کر!

ہائے، اس چہرہ کی محبوبیت اور نورانیت کا ایک ہلکا سا عکس بھی کس طرح کاغذ کے صفحہ پر منتقل کیا جا سکے!

ہرگز نیامد در نظر نقشے ز رویت خوب تر
شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری!

——— . ———

باب (۸۴)

سنہ ۱۹۳۰ء (۵)

(" ایک مرگ ناگہانی اور ہے - بیمار مظلوم ")

امیر المومنین سیدنا حضرت علیؓ کی خلافت کے حالات جب تاریخ و سیر کی کتابوں میں نظر گذرتے ہیں، تو حیرت اور عبرت دونوں شدت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ رسول اکرمؐ کے قریب ترین عزیز، اسلام لانے میں شرف اولیت سے ممتاز، شجاعت میں بے مثال، علم، عمل، تفقہ، ورع میں اپنی نظیر آپ۔ تمام صحابی آپ کے فضل و کمال کے قائل، اس پر یہ حال کہ آپ خلیفہ ہوئے نہیں کہ بغاوتیں ہر طرف پھوٹ پڑیں۔ ادھر شورش، اُدھر بد امنی۔ آج اس مخلص نے بغاوت کر دی، کل وہ وفادار، غدار بن گیا۔ بڑے بڑے قدیم مخلص غدر و فساد پر آمادہ، سرکشی و گستاخی پر مستعد، ہر ہر فرد معترض و نکتہ چین، جیسے کسی کی زبان میں لگام ہی نہیں ——— انھوں نے اس منظر کو ایک ہلکے پیمانہ پر محمد علی کی زندگی کے آخری دور میں دیکھ لیا۔ علیؓ صحابی ہی نہیں، خلیفہ راشد بھی تھے، محمد علی بیچارہ عام امتی۔ اس کھلے ہوئے فرق مراتب سے قطع نظر کر لیجئے، تو تاریخ اپنے کو دہراتی ہوئی موجود۔ محمد علی ابھی چند سال قبل تک عملاً "امیر المومنین" ہی تھے۔ مسلمانان ہند کے محبوب ترین لیڈر۔ یا اب یہ حال ہو گیا کہ بچہ بچہ دشمن و نکتہ چین۔ خال خال اخبارات مثلاً انقلاب (لاہور) و الامان (دہلی) ساتھ رہ گئے، اور سچ تو اپنی محدود بساط کے مطابق مخلص تھا ہی

باقی ہمارے کے سارے اخبارات اور اخبار نویس بس آستین چڑھائے ہوئے۔ جی مین بے اختیار آیا کہ ایک مستقل مقالہ "علیؓ اور محمد علی" کے عنوان سے لکھیئے، اور دنیا کو دکھایئے کہ خادم کے حصہ مین بھی قسمت کچھ حیدریؓ ہی کی سی آرہی ہے۔ اور اپنا یہ منصوبہ مولانا کو لکھ بھی بھیجا۔ یہ بھی عرض کردیا کہ اپنا پریس ایجنٹ اب مجھی کو کردیجیئے، سب سے نپٹ لونگا، بھگت لونگا۔ نت نئے جھوٹے سے جھوٹے اور گندے سے گندے الزامات اب ہم نیازمندون کے لیئے برداشت سے باہر ہوگئے ہین۔ لکھنؤ کے حاجی ظفر الملک علوی (سچ کے منیجر اور بانی) کہان ابھی کل ڈیڑھ برس ہوئے ہمدرد کی منیجری بلامعاوضہ کرنا اپنے لیئے باعثِ فخر و سعادت سمجھ رہے تھے، اور کہان اب مقابلہ و مخالفت مین قلم در کف!

مولانا اب شملہ مین تھے، زار و نزار، ضعیف و ناتوان، بستر مرض پر دراز۔ ڈاکٹرون نے لکھنے پڑھنے، دماغی کام کرنے کی قطعی ممانعت کر رکھی تھی۔ اتنی سکت ہی کہان تھی، کہ مخالفین دمعاندین کی طرف توجہ کرسکین۔ دہلی سے، لڑکی کے عقد کے معاً بعد روانہ ہوجانے کو تھے، اور یہی مجھ سے فرمایا بھی تھا جب۔ کئی دن ہوئے، تو مین نے دریافت خیریت کو عریضہ لکھا۔ جواب شملہ سے آیا:-

"۱۰ جون سنہ۳۰ء، ڈونالڈ لاج۔ کارٹ روڈ۔ شملہ

برادر محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہٗ۔

ہو چکین غالب بلائین سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میرے امراض کی فہرست یون بھی طویل ہو چکی تھی، صرف مرگ ناگہانی کا انتظار اور تھا۔ اب قلب کی بیماری نکلا۔ بار حملہ ہو رہا ہے۔ اس نے مرگ ناگہانی کا بھی انتظام کردیا۔ ارادہ کرچکا تھا کہ گلنار کے نکاح کے بعد ہی یہان آجاؤنگا۔ مگر ایک وہابی کی نالش نے ۱۵ دن روکے رکھا[1]۔ ۱۵ کو چل کر ۱۶ کو

[1] یہ وہی دیوانی کی نالش کوچہ چیلان کے مکان اور پریس کے سلسلہ میں تھی۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جولائی سنہ۲۹ء کے واقعات کے ذیل میں۔

جون کو یہان پہونچا۔ راستہ مین درد اُٹھا۔ دوسرے دن یہان بھی شب کو وہی حالت رہی۔ تیسرے دن صبح کو بھی وہی حالت تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اب طبیعت قدرے سدھری ہے۔

مین اب ظفر الملک صاحب کے مضامین اور عطاء اللہ شاہ کی تقاریر اور کفایت اللہ صاحب و احمد سعید صاحب کی سازشون کے جواب دینے کے قابل کہان ہون جو جلسون مین شریک ہون ڈیڑھ ماہ آرام اور کچھ کام کی غرض سے یہان آیا ہون۔ آیئے تو یہان آیئے، تاکہ دل کھول کر باتین ہون۔

آپ کا عقیدتمند بھائی محمد علی"۔

آہ کہ یہ آخری خط تھا جو مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موصول ہوا ——— کون اُسوقت جانسکتا تھا کہ اس کے بعد ایک خط بھی انکے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھنا نصیب نہ ہوگا![1]

شملہ مشہور و معروف دار الصحت تھا۔ بڑے بڑے پرانے مریضون کو ڈاکٹری مشورے وہین کی آب و ہوا مین کچھ دن بسر کرنے کے دیئے جاتے تھے۔ پھر دہلی وغیرہ کے شور و شغب سے دور وہان کا سکون خود ایک بہت بڑی نعمت تھا۔ علاج کے لئے سہولتین ایک سے بڑھکر ایک اور ڈاکٹر ایک سے بڑا موجود۔ شملہ اُسوقت ہندوستان کا گرمائی دار السلطنت ہی تھا، جس طرح دہلی سرمائی دار السلطنت تھا۔ وائسرائے بہادر سال کا بیشتر حصہ وہین بسر فرماتے تھے۔ صرف جاڑون کے چار مہینون کے لیے دہلی مین نزول اجلال ہوتا تھا۔ محمد علی کے امراض کی شدتون پر آخر وائسرائے کو بھی رحم آگیا۔ اتفاق سے اُسوقت وائسرائے تھا بھی ایک بڑا شریف دل انگریز، لارڈ اِروِن نامے (جو بعد کو لارڈ ہیلیفکس کے نام سے

---

[1] شروع جولائی میں میں نے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں جو خط لکھا تھا، اسکا اقتباس ذیل مسودہ حکیم الامتؒ (ص ۲۵) سے نقل کرتا ہوں۔

"مولانا محمد علی صاحب اسوقت بہت زائد علیل ہیں۔ قدیم امراض ذیابطیس وغیرہ پر جدید امراض ریاحی، دورۂ قلب وغیرہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ تنفس سا ہر وقت رہنے لگا ہے۔ شملہ میں ایک سپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ خواب آور دوا کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہ سونا ممکن ہے نہ لیٹنا۔ دعاے صحت کے لیے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے"۔

لقب سے مشہور ہوا) اُس نے خود اپنا ڈاکٹر ان کے علاج کے لئے بھیج دیا۔ غرض جو بھی ممکن انسانی تدبیرین دوا علاج کے سلسلہ مین تھین، ہوتی رہین۔ افاقہ خاطر خواہ تو نہ ہوا، اور نہ کسی کو اب اس کی امید باقی رہ گئی تھی۔ البتہ کئی ہفتوں کی دوا درمن اور ہم نیازمندون کی مسلسل مخلصانہ دعاؤن کے بعد اتنا ہوا کہ مولانا شملہ سے سفر کرنے کے قابل ہو گئے۔

انکی یہ جبری فرصت کا زمانہ مجھے بہت غنیمت نظر آیا۔ حضرت تھانویؒ کی بعض مختصر کتابین پارسل بنا روانہ خدمت کر دین کہ "لیٹے لیٹے انھین حسب فرصت ملاحظہ فرما لیجئیے گا، عجب کیا جو مشیت الٰہی مین اب وقت آگیا ہو کہ اسلام کے دو بہترین خادمون کے درمیان غلط فہمیان دور ہو جائین، اور ایک نئی مصالحت و مفاہمت کی بنیاد پڑ جائے"۔ شوق وطن اور قصد السبیل یہ دو نام تو اچھی طرح یاد ہین، شاید ایک آدھ اور کتاب مثلاً تربیت السالک بھی ان کے علاوہ تھی۔ مدت دراز کے بعد وقت آیا تھا کہ محمد علی کا دل حضرت تھانویؒ کی طرف سے صاف ہو چلا تھا، اور اتفاق سے اسوقت نسبتہ فرصت بھی انہین تھی۔ یہ عاجز تو دونون کی نیازمندی اپنے لیے سرمایۂ سعادت سمجھ رہا تھا۔ دل نے کہا کہ اس خداداد موقع سے پورا فائدہ اٹھائیے، اور اپنی والی جہان تک بھی بن پڑے، دونون کو ایک دوسرے سے قریب لائیے۔

کتابین پہونچین۔ لیکن تقدیر نے ایک بار پھر تدبیر کو باطل کر دیا۔ مولانا ابھی انھین پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ سفر کی ٹھن گئی۔ والی بھوپال ہز ہائنیس نواب سر حمید اللہ خان، مولانا کے پرانے عقیدتمندون مین تھے، اور اب رامپور کے نئے نواب کو (جو اسی جون مین اپنے والد متوفی کی جگہ مسند نشین ہوئے تھے) بھی مولانا سے عناد باقی نہ تھا۔ یہ دونون مولانا کو بلا رہے تھے۔ اس زمانہ مین برطانیہ کی لیبر وزارت نے ہندوستان سے صلح کرنے اور مطالبات ہند پر غور کرنے کے لئے

دسمبر مین ایک گول میز کانفرنس کے لندن مین منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس مین ہندوستان کی ساری ہی پارٹیون کے نمایندے بلائے جاتے۔ مسلمانون کے نمایندون مین سب سے پہلا نام مولانا ہی کا وائسرائے (لارڈ اِرون) کے ذہن مین آنا چاہیے تھا اور شاید آیا بھی۔ لیکن مخالفین اور حاسدین یہان بھی نہ چوکے۔ اور رنج کی سرگوشیون سے لیکر اخبارات کے صفحات تک مولانا کی ذات پر خوب خوب حملے کر ڈالے۔ ایک مشہور دہلوی معاند نے تو کمال ہی کیا۔ کسی سے انگریزی مین لکھوا کر، اور اپنے صرف سے کئی سو کی تعداد مین چھپوا کر، ایک پورا پمفلٹ مولانا کی مخالفت مین برطانوی پارلیمنٹ کے ممبرون اور وزیرون کے پاس ڈاک سے روانہ کر کے، خود اپنی رسوائی کا مستقل سامان کر لیا! —— چلاہوا مصرعہ،

بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

شاید ایسے ہی موقع کے لئے ہے —— یہ سب کوششین بحمداللہ ناکام رہین۔ اور مولانا کا انتخاب بالآخر گول میز کانفرنس کی ممبری کے لئے ہوکر رہا۔ مولانا اب بھوپال مین نواب صاحب کے مہمان تھے، اور اپنے ہر ضعف و خستگی، ناتوانی و شدت مرض کے باوجود ولایت جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ مسلمانان ہند کی وکالت ان سے بہتر کوئی نہین کر سکتا، اور نہ اس امت کا نقطۂ نظر اتنی خوبی سے کوئی اور سمجھا سکتا ہے۔ اخباری اطلاع اس درمیان مین یہ چھپی کہ اب مولانا کو افاقہ ہو رہا ہے۔ اور مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس (مسلم کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ) لکھنؤ مین ۵ اگست کو قرار پایا۔ کچھ امید پڑی کہ شاید مولانا اس جلسہ مین آجائین بڑی امیدون کے ساتھ شروع اگست مین عریضہ بھوپال کے پتہ پر لکھا۔ پانیر (۳۱ جولائی) مین کسی کا مضمون بھی مولانا کی شخصیت پر مع انکی تصویر کے نکلا تھا۔ عنوان تھا "قابل مگر ناکام لیڈر" Brilliant Man without an Achievement تمامتر مخالف

فضا میں یہ مقالہ غنیمت معلوم ہوا، کہ اس میں فی الجملہ تو مولانا کے کمالات کی داد تھی۔ مخالفت کی شدت دیکھ کر دبی زبان کچھ یہ عرض معروض بھی تھی، کہ ذرا اپنے رویہ میں بھی نرمی و مصالحت آمیزی پیدا کرنا چاہئے۔ اور ابھی کچھ معروضات تھے۔ جواب مفصّل اور خوب مفصل، اگست کے چوتھے ہفتہ میں موصول ہوا۔ اور آہ کہ یہ آخری خط تھا۔ جو سرزمین ہند سے مجھے موصول ہوا۔ اور یہ خط بھی لکھا ہوا نہیں، انکا صرف لکھوایا ہوا تھا۔ محض دستخط آخر میں اپنے قلم سے کئے تھے ——— کون جانتا تھا کہ تازہ دستخط کے لئے بھی اب آنکھیں عمر بھر ترستی ہی رہینگی!

خط کا لب و لہجہ یقیناً بہت تلخ ہے، خصوصاً بعض دوسرے مخدومان ملت سے متعلق۔ لیکن خط کا پورا پس منظر اگر سامنے ہو، تو خط نویس اپنی ان تلخ نوائیوں کے لئے شاید بالکل ہی معذور قرار پا جائے، خصوصاً جبکہ وہ غریب ایک طرف ذیابیطس، ضعف اعصاب، شدید ضعف بصارت ضعف قلب، ضغطۃ الدم (خون کا دباؤ) اکٹھے اتنے امراض کا شکار ہو، اور دوسری طرف طنز و تعریض، طعن و تشنیع کے تیروں کی مسلسل بارش سے اس کا دل چھلنی ہو چکا ہو۔ بہرحال اب وہ والا نامہ ملاحظہ ہو۔

باب (۸۵)

سنہ ۱۹۳۰ء (۶)

(مظلوم کی آہ ۔ بیمار کی کراہ)

"۲۰ ستمبر ۳۰ء ۔ گسٹ ہاؤس ۔ بھوپال ۔

برادرم محترم ۔ السلام علیکم وبرکاتہٗ ۔

آپ کا محبت نامہ مورخہ ۲ اگست مجھے کوئی ۷ ۔ ۸ اگست تک غالباً مل گیا تھا ۔ لیکن چونکہ محض عیادت نامہ نہ تھا بلکہ سیاست نامہ[1] بھی تھا، اس لئے جواب کی ہمت اس وقت نہ کر سکا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن[2] کے حکم سے اس وقت تک انتظار کیا جبکہ خود گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر خط لکھنے کے قابل ہو جانے کی امید تھی ۔ جون ہی حالت اس قابل ہوئی ۔ سیدھی آنکھ نے تقریباً جواب دیدیا اور جب بیمار کو سنئے نواب صاحب رامپور اور شوکت صاحب کی طلبی پر رامپور جانے سے ڈاکٹر صاحب نے روک دیا تھا اور نواب صاحب بھوپال نے معذرت کا تار بھیج کر اس کی وجہ بیان کر دی تھی، اس کو دوسرے ہی دن بمبئی بھاگنا پڑا کہ ڈاکٹر چشم کو پھر آنکھ دکھائے اور بالکل اندھا بننے سے بچ سکے ۔ اس دن سے آج تک آنکھ اس قابل نہیں ہے کہ کچھ بھی لکھ پڑھ سکوں، اور دوسروں کا محتاج

[1] ایک بار پھر یاد کر لیجئے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا شدت سے علیل ہیں اور ساتھ ہی خود اسلامی پریس میں ہر طرح کے طنز و تعریض اور گندے گندے اتہامات کے ہدف بنے ہوئے ۔ مزاج میں جھنجلاہٹ ایسے موقع پر بالکل طبعی ہے

[2] ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال کے خاص ڈاکٹر اور سرجن ۔ مولانا کے بھی بے تکلف دوستوں میں تھے ۔

آپنے میری صحت کے متعلق ۷ اگست کو لکھا تھا کہ "میری دعاؤن سے خدا خدا کرکے آپ کے افاقہ کی خبر سنائی دی"۔ یقیناً میری بیماری مین افاقہ ہوا تھا، مگر نہ اسقدر کہ جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا۔ حقیقتاً افاقہ کا زائد حصہ خود شملہ کی بلندی سے نزول تھا۔ سولن پہونچتے ہی جب کہ ہوا اتنی تیز نہ ہی اس سے زائد افاقہ ہوگیا۔ اور پہلی بار اتنی بھوک لگی کہ مین نے دوسرون کو چائے پیتے دیکھ کر خود بھی ایک پیالی چائے مانگی۔ باقی افاقہ پلنگ پر پڑے رہنے سے ہوا۔ شاید کسی قدر دواؤن سے بھی ہوا ہوگا۔ رہا دعاؤن کا معاملہ، مین کب آپکی دعا کی تاثیر کا قائل نہ تھا۔ البتہ اگر اب بھی صاحبِ فراش ہون تو ممکن ہے کہ تھانہ بھون[1] تو نہین مگر شاید دیوبند[2] کی مقدس ہستیون کی آپکی دعاؤن مین شرکت کا اثر ہو۔

اگر آپ کو افاقہ کے متعلق غلط فہمی نہ ہوئی ہوتی تو آپ ہرگز مجھ سے نہ پوچھتے کہ مین ۱۵ اگست کو لکھنؤ آ رہا ہون یا نہین[3] "شد رحال[4]" اب تو میرے مذہب مین گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کیلئے جائز رہ گیا ہے جس کے متعلق ابھی عمل کرون گا۔ مین آج ہی مع اپنی اہلیہ کے دہلی جانا چاہتا تھا تاکہ رخت سفر باندھ سکون۔ لیکن گذشتہ ہفتون مین خون کا دباؤ کسی قدر بڑھا رہا اور ضیق نفس بھی کسی قدر رہا۔ اس کے باعث ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے پھر امتناعی حکم جاری کر دیا اور اب صرف میری اہلیہ دو ایک دن مین چلی جائینگی۔ ارادہ تھا کہ رامپور جاتے وقت آپکو تار دے کر کم از کم وہین بلالون اور نہ معلوم واپسی ہو یا نہ ہو[5] چلتے وقت آپ سے مل لون۔ لیکن اب آپ سے اتنا قرب بھی اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ بھوپال

[1] اشارہ ہے حضرت تھانوی کیجانب جن سے مولانا سے تعلقات میں اب پہلے کی سی کشیدگی نہیں باقی رہی تھی [2] اشارہ ہے مولانا حسین احمد صاحب کیطرف جن سے مولانا کے تعلقات اب بہت ہی کشیدہ ہو چکے تھے [3] یہ جلسہ مرکزی خلافت کمیٹی کا تھا۔ اور اس میں مولانا کی شرکت کے لیے ہر شخص چشم براہ بنا ہوا تھا [4] تلمیح ہے ایک حدیث کیجانب جس کا یہ مضمون ہے کہ شد رحال (کجاوہ کا کسنا یعنی سواری پر سفر اختیار کرنا) تین ہی مسجدوں کے لیے ہونا چاہیے۔

[5] اپنی موت کے قرب کا احساس اب مولانا کو برابر رہنے لگا تھا۔

تشریف لائین اور خلافت کمیٹی کے جلسہ مین جو ۲۰ اور ۲۰ اکتوبر کو ہونے والا ہے بمبئی جا کر شریک ہون۔ مین انشاءاللہ ۲۹ ۔۔۔ ۲ تک بمبئی چلا جاؤن گا بشرطیکہ گول میز کانفرنس کے التوا کا حکم نہ آیا۔ براہ کرم ضرور آکر مل لیجئے۔ گو اب مین بزدل اور غدار ہون اور آپکے ۔۔۔ کی طرح ایسا ہندو پرست نہین رہا جیسا کہ وہ دو تین سال پیشتر مجھکو کہتے تھے۔ تاہم چونکہ آپ کو نہ صرف دیوبند بلکہ تھانہ بھون سے بھی عقیدت ہے اس لئے بزدلون اور غدارون سے ملنا بھی آپ کے مذہب مین ناجائز نہ ہوگا۔

پانیر مین جو مضمون نکلا تھا وہ خود لغو تھا اور اسکا لکھنے والا بھی لغو۔ یہ ایک متعصب ہندو کا لکھا ہے۔ جو ان بزرگون کی طرح خوب جانتا ہے کہ جینا اور سر محمد شفیع بھی خریدے جا سکتے ہین مگر محمد علی انمول آپ جس طرح مذہب کے بارے مین ابتک صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے اور آپکی زندگی مین اس کے پہلے حصہ کی فلسفیت کے خلاف ابھی تک ردعمل جاری ہے اور آپ سائنس کو حرام سمجھتے ہین اسی طرح آپ ابتک سیاست مین بھی صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے۔ تہذیب مغرب کی بیہودگیون اور مغربی استعمار کے خلاف ابھی ردعمل جاری ہے اور وہ ہندوؤن کی تنگدلی اور تعصب کو ایک بڑی حد تک آپکی آنکھون سے چھپائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نہ پانیر کے مضمون نگار کی شیطنت کو پہچان سکے اور نہ ستیہ گرہیون کی روزانہ دروغ بانی کو۔

میرے اسمبلی کے انتخاب کے متعلق آپنے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ نہ

---

(۱) ایک مشہور عالم کا نام (۲) ۱۲ر جولائی کے پانیر میں مولانا پر ایک مفصل مضمون کسی کا نکلا تھا جس میں مولانا کو بہترین مگر ناکام ترین لیڈر دکھایا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو باب ماقبل۔ مکتوب الیہ نے اپنے خط میں اس مضمون کی فی الجملہ داد دی تھی (۳) یہ صرف مولانا کا خیال ہی خیال تھا جو یقیناً میری ہی گفتگو یا تحریر کی بے اعتدالیوں سے پیدا ہو گیا ہوگا۔ مگر بہرحال یہ تمامتر واقعہ نہیں۔ (۴) یہ لفظ مکتوب الیہ نے بدلکر رکھدیا ہی مولانا کا اصل لفظ اس سے زائد کریہہ تھا (۵) لیڈر، ریڈیوں وغیرہ ہندوؤں کے انگریزی اخبار وں کے روزناموں کے حوالے سے بعض اسلامی روزناموں نے بھی یہ خبر خوب اچھالا اور مشتہر کر دی تھی کہ مولانا اسمبلی کی ممبری کے امیدوار ہیں اور انکا ارادہ اسکی صدارت اپنے لیے [illegible] کے لیے!

نہ صرف زمیندار وغیرہ پر اعتراض کر رہے ہین بلکہ مجھ سے بھی استفسار کر رہے ہین کہ کیا واقعی تم اسمبلی مین شریک
ہو گئے ۔ حقیقتہً میرے قلب کی حالت نہ اس وقت ایسی تھی کہ مین سکون کے ساتھ ان چیزون کے متعلق
لکھ سکتا نہ اب پوری طرح اس قابل ہوا ہون کہ سکون کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھ سکون ۔ آپ کو شاید
یہ سن کر حیرت و افسوس دونون ہون کہ مین نے اپنے دو دوستون کو اس کی اجازت اپنی استپال مین دے دی
تھی جہان کہ بستر مرض نہ اسی دیر مین بستر مرگ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ چاہین تو مجھے اسمبلی کا ممبر منتخب کرا سکتے
ہین ۔ واقعہ یہ تھا کہ مین اب اس رائے پر پہونچا تھا کہ اگر نیا دستور اساسی ایسا بن گیا کہ اس مین اسمبلی کو
حقیقی آزادی مل گئی تو مین بھی اس مین شریک ہو جاؤنگا گو اس وقت تک مین مولانا حسین احمد صاحب
کی طرح اس مین شرکت کو جائز نہین سمجھتا ۔ ایک زمانہ مین مولانا حسین احمد صاحب میرے ہمخیال تھے
اور جمعیتہ العلماء کی مجلس انتظامیہ مین میرے ہی کہنے سے جیل سے چھوٹتے ہی انھون نے ایک تحریک
سوراجیون کے نقطۂ نظر کے خلاف پیش کرنا چاہی تھی جس کو ۔ ۔ ۔ کفایت اللہ صاحب نے (آپ زمیندار
اور ۔ ۔ ۔ ۔ کی دروغ بافیون پر تو معترض ہین ۔ ۔ ۔ ۔ کفایت اللہ صاحب اور الجمعیتہ کی افترا پردازیون
کے متعلق نہ آپ نے کبھی کچھ لکھا نہ مولانا حسین احمد نے) ٹال دینا چاہا تھا ۔ دو سال بعد ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب اور
انکے ۔ ۔ ۔ ۔ احمد سعید نے مولانا حسین احمد ہی سے ایک روز لیوشن تیار کرا کے جمعیتہ العلماء کے جلسہ
انتظامیہ میں پاس کرا ہی کے چھوڑا ۔ جس مین مرکے گرد ہاتھ گھما کر ناک پکڑی گئی تھی اور اسمبلی اور کونسلون
مین شرکت کے جواز کا فتویٰ دار الافتراء سے شایع کیا گیا تھا ۔ خیر یہ پرانی بحث ہے ۔ مین مسلمان ممبران
اسمبلی کی بے اصولیون اور نفس پروریون سے اتنا تنگ آگیا تھا کہ نواب اسمٰعیل خان اور شفیع داؤدی صاحب
کے اصرار سے اور چند اور خلافت والون کے کہنے سے مین نے اسے قبول کر لیا تھا کہ اگر دستور اساسی

---

[1] مفتی صاحب کا ذکر ہے [2] موصوف کو مولانا نے تنبیہ جاہلیت کے ایک شخص سے دی تھی ۔ جو اپنی پرخوری
دتن وتوش کے لیے مشہور تھا ۔

کی بنیاد حقیقی آزادی قرار پائی تو مین شریک ہو جاؤن گا اور ان کے دوش بدوش تحفظ اسلامی اور اتحاد ملل ہند کے لیے جد وجہد کرون گا ۔ مین خود وایسرائے کو رائے دے چکا تھا کہ انتخاب گول میز کانفرنس کے بعد کیا جائے لیکن شملہ مین جبکہ میری حالت بہت خراب تھی مجھے اطلاع ملی کہ انتخاب ابھی ہوگا اس پر مین نے فیصلہ کیا کہ اگر میرے دوست ضرورت سمجھین تو میرا انتخاب کرا دین ۔ لیکن چونکہ پہلا اجلاس گول میز کانفرنس کے بعد ہوگا میری شرکت اس پر منحصر ہوگی کہ دستور اساسی آزادی پر مبنی ہو ۔ یہ تھی کل حقیقت لیکن آپکے ستیہ گرہیون نے اس پر اسپیکری وغیرہ کا قصر تیار کر دیا ۔

چون ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مفتری افترا پردازی سے باز نہین آتے اور افسانہ گوئی کے بغیر رہ نہین سکتے ۔

انقلاب[1] مین جو مکتوب شایع ہوا تھا وہ میری درخواست کے ایک ماہ سے زائد کے بعد شایع ہوا ۔ مین تو عہد کر کے بند کرکے مہر سکوت اپنے ہونٹون پر لگا چکا تھا ۔ لیکن اس ملت مرحومہ کی مردم شناسی کو کیا کہا جائے الجمعیۃ اور مہند وغیرہ کی افترا پردازیون کے بعد مجبور ہو کر یہ خط سالک صاحب کو لکھنا پڑا اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اس مین فراہم کردہ مواد کو اپنے دو ایک مضمون مین شایع کر دین جو انھون نے نہین کیا ۔

اب شرکت [گول میز] کانفرنس کے متعلق کچھ مواد آپکو بھیج رہا ہون[1] کہ آپ اسے اپنے کسی مضمون مین شایع کرا دین ۔ مین نہین چاہتا کہ میرا اصلی خط وائسرائے کے نام کا شایع کیا جائے تاآنکہ

[1] شریک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب (لاہور) نے ۳۰ ء میں نے لکھا تھا کہ لوگ طرح طرح کے اتہامات لگا رہے ہیں آپ خود ان معاندین کے منہ نہیں لگتے نہ سہی، لیکن اپنے متعلق صحیح معلومات تو اس نیازمند کے پاس کبھی کبھی بھیجدیا کیجئے ۔ اشاعت انشاءاللہ معقول طریق پر ہوجایا کرے گی

اشد ضرورت نہ ہو مگر اس کا سارا مواد آپ حرف بحرف شایع کر سکتے ہین اور یہ بھی لکھ سکتے ہین کہ
ان خیالات کا اظہار مین نے ان حلقون مین کر دیا ہے جہان سے دعوت آئی تھی۔ پاؤن مین پہلے ہی
حس نہ تھا اب حالت کچھ بدتر ہی ہے اور سردی مین ہر وقت گنگرین اور پانو کی قطع برید اور اسی طرح
کی موت کا اندیشہ رہیگا جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم و مغفور منجھلے بھائی صاحب کو دوچار ہونا پڑا
اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس مین نہ صرف ہندوؤن اور
انگریزون بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیون سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنا پڑیگی۔ ان تین
محاذون پر جنگ کرنے مین ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے اور موت کا اندیشہ ہے۔
سب سے زائد کہ اب لکھ پڑھ نہین سکتا۔ کامل نابینائی کا ماہر علاج چشم نے پورا یقین دلا دیا ہے کہ اگر
مین سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤن جہان دنیا کی کوئی خبر نہ ملے۔ لیکن اس پر بھی
مین سمجھتا ہون کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس مین شریک ہون اور وہان سلطان جابر اور
رعایائے جائر دونون کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کر دون[۲]۔ تاآنکہ اس کام مین مرجاؤن
اس لئے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کرکے
اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلون گا اسلئے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل مین میری رفیق سفر رہی
جب منزل مقصود کے لیے احرام باندھون تو چاہتا ہون کہ وہ موجود ہو[۳]۔ ورنہ لندن کا بدترین موسم
ہے۔ اور ہر متمول انگریز اور میم انگلستان تک کو چھوڑ کر دوسرے ملکون کو بھاگ جاتے ہین۔
بہر حال وائسرائے کا دعوت نامہ اور میرا جواب ملفوف ہے۔ میرے خط بنام وائسرائے کو

[۱] یہ بہادر مجاہد جسکے خلاف ہر قسم کے اتہامات کے نعرے خود اسی کے قوم کے اکابر لگا رہے تھے! [۲] اشارہ ہے اس حدیث
نبویؐ کی طرف جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے
[۳] سچے بندہ کی یہ دردناک پیشین گوئی کیسی سچی اتری۔

بطور خط کے نہ چھاپیے ۔ اپنے مضمون مین آپ اس کے خیالات کو میرے ہی الفاظ مین شایع کر سکتے ہین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اخبار ہی اس کے لئے بہتر ہوگا ۔

جب آپ یہان آئین گے تو آپ کو وہ خطوط دکھاؤن گا جو مسلمانون کی نمائندگی کے متعلق مین نے بستر مرض پر سے بھی وائسرائے کو لکھے تھے ۔ اب رخصت ہوتا ہون ۔ میری گستاخیون کو معاف کیجئے اور میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے اور جلد آکر مجھ سے مل جائیے ۔ میری اہلیہ کا بھی سلام قبول کیجئے اور اپنے گھر مین ہمارا سلام شوق کہئے اور بچون کو خوب سا پیار کیجئے ۔

آپ کا گستاخ بھائی محمد علی"

اس کے بعد ان ہی کاتب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا کارڈ مورخہ ۳ اکتوبر بھوپال سے حسب ذیل ملا ۔

"بہ ایماء حسب ارشاد مولانا محمد علی صاحب قبلہ لکھ رہا ہون ۔ صاحب موصوف یکم اکتوبر کا دن گزار کر شب کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہو گئے ۔ یہ فرمایا کہ جناب کو اور جناب قطب الدین عبدالوالی صاحب کو اس امر کی اطلاع کر دون کہ ہر دو حضرات موصوف کے لئے دعا فرمائین اس لئے کہ مولانا ممدوح کی علالت کا سلسلہ روانگی کے وقت تک تھا گو کسی قدر سابقہ حالت سے مرض مین کمی تھی لیکن جدید شکایت ملیریا کی ہو گئی تھی جس سے ایک روز متلی کے باعث تکلیف رہی مگر روانگی کے دن اس مین افاقہ ہو گیا تھا ۔"

باب (۸۶)

۱۹۳۰ء (۷)

(مرنے کے لیے۔ اللہ کے شیر کی آخری گرج)

شروع اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا جہاز پر بیٹھ برطانیہ روانہ ہوگئے۔ اپنی پہونچ نہ بھوپال ہوسکی نہ بمبئی۔ قسمت مین یہی تھا کہ رخصتی ملاقات نہ ہونے پائے، حالانکہ مولانا نے بھوپال بار بار بلایا، اور بمبئی مین بھی کئی دن انکا قیام رہا تھا ——— آہ، یہ گمان بھی کسے تھا کہ یہ ولایت کا مسافر حقیقتہً ٹکٹ جنت کا لے رہا ہے! ——— علالت روز بروز بڑھتی اور حالت ہر روز گرتی جارہی تھی۔ بیدرد معاندین، شاید اپنے ظرف پر قیاس کر کے، سمجھ یہ رہے تھے کہ مولانا یہ سفر کسی لطف وتفریح کی خاطر کر رہے ہین۔ وہاں اس کا امکان ہی اب کیا باقی رہ گیا تھا۔ اُدھر دھن تھی، تو بس یہ کہ گرتا پڑتا، لڑکھڑاتا، جس طرح بھی بن پڑے، اس نادر موقع پر پہونچون اور دین اور وطن کی طرف سے آخری فریضۂ تبلیغ ادا کر جاؤن۔ میرے نام کا خط بھوپال سے لکھا ہوا جو ابھی آپ پڑھ چکے ہین، ایک بار پھر انکے ان فقرون سے اپنی یادداشت تازہ کر لیجئے:۔

"غرض حالت اب تو میرے مذہب مین گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لئے جائز رہ گیا ہے۔ ... پاؤن مین حس پہلے ہی نہ تھا، اب حالت کچھ بدتر ہی ہے۔ اور سردیون مین گنگرین یا ان کی قطع وبرید اور اسی طرح کی موت کا اندیشہ رہیگا، جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم

و مغفور منجھلے بھائی کو دو چار ہونا پڑا تھا ..... ابتک صاحب فراش ہون۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس مین نہ صرف ہندوؤن اور انگریزون بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑیگی۔ ان تین محاذون پر جنگ کرنے مین ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا ..... مین سمجھتا ہون کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس مین شریک ہون اور وہاں سلطان جائر اور رعایائے جائر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں۔"

اللہ اللہ! کیا ہمت تھی، اور کتنا مضبوط ایمان تھا! موت کو اپنی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے ہین، پھر بھی بڑھتے ہی چلے جاتے ہین! شملہ مین جب سرکاری اسپتال مین اسٹریچر پر پڑے ہوئے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ کو لائے جا رہے تھے، تو کسی نوعمر یوروپین خاتون نے ترس کھا کر انگریز ڈاکٹر سے پوچھا، کہ "ان بڑے میان کو کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے جواب دیا "یہ نہ پوچھو۔ یہ پوچھو کہ کون سی تکلیف انھین نہیں ہے"۔ ——— سفر شروع کرتے کرتے تو حالت اور بھی زار ہو چکی تھی۔ بیوی کو بھی، باوجود مصارف سفر مہیا نہ ہونے کے جو ساتھ لئے جا رہے تھے، تو وہ بھی اسی خیال سے کہ جو زندگی کی ہر منزل مین رفیق رہی، وہ سفر آخرت شروع کرتے وقت بھی پاس ہی رہے۔ خط مین یہ الفاظ بھی تو تھے،

"قرض دام لیکر، بھیگ مانگ کر، جس طرح بھی ہو سکے گا، تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلونگا، اس لئے کہ وہ زندگی کی ساری منازل و مراحل مین میری رفیق سفر رہی جب منزل مقصود کے لیے احرام سفر باندھوں تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو۔"

عین روانگی کے وقت ایک بڑے مخلص رفیق، میرے ہمنام مولانا عبدالماجد بدایونی نے جب پوچھا کہ آخر علالتون کی پوٹ اور ایک زندہ لاش بنے ہوئے آپ ولایت جا ہی کیون رہے ہین

تو جواب مین صرف یہ الفاظ کہے :- "مرنے کے لیئے"

جہاز پر جب سوار ہوئے ہین، تو خود سے سوار ہونے کے قابل کہان تھے۔ اسٹریچر (بیمار ڈولی) پر لٹاکر سوار کرائے گئے۔ فرانس پہونچتے پہونچتے حالت اور ردی ہوگئی، لندن ابھی دور تھا۔ اور حالت اتنی گرگئی تھی کہ اتنے سفر کا تحمل بھی ممکن نہ تھا، راستہ ہی سے پیرس مین اُتار لیئے گئے۔ اور علاج بہین بڑے بڑے ماہرین فن کا شروع کردیا گیا۔ عین جس وقت ہندوستان مین یہ سخت تشویش انگیز اطلاعین آرہی تھین، یعنی یکم نومبر، یا اس کے لگ بھگ، اسلامی ہند کا ایک خاصہ بڑا طبقہ، اسلامی ہند کی کشتی کے اس سب سے بڑے ناخدا پر قہقہہ لگا رہا تھا! آپ کہتے اور سمجھتے ہونگے کہ یہ وقت تو وہ تھا کہ دشمن بھی ایسے موقع پر قابل رحم و ہمدردی ہو جاتا ہے، لیکن محمد علی غریب کی قسمت مین یہ بھی نہ تھا۔ شقاوت کے پورے کمالات کے ساتھ عین اسوقت یہ ایڈیٹوریل لاہور کے مشہور "اسلامی" روزنامہ زمیندار مین "مولانا محمد علی کی علالت" کے زیر عنوان نکلا تھا:-

"اسوقت جبکہ گول میز کانفرنس کے دوسرے مندوبین ہائیڈ پارک کی سیر سے دل بہلا رہے ہین، اور ہوائی جہازون کی نمائشین دیکھ رہے ہین، مولانا محمد علی پیرس مین صاحب فراش ہین۔ اگر یہ علالت مولانا کی شملہ کی علالت سے مماثل ہے، جس کے بعد آپ فوراً بھوپال پہونچ کر والیٔ بھوپال کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہوگئے تھے تو چندان تشویش کی بات نہین"!

گویا محمد علی کا جرم یہ تھا کہ وہ شملہ کی شدید علالتوں کے بعد زندہ کیون باقی رہ گئے!

آپ کہینگے کہ شرافت تحریر کی حد کردی۔ لیکن ذرا ٹھہریئے، ابھی کچھ درجے اور باقی ہین :-

"اگر اس علالت کی واقعی کوئی حقیقت ہے، تو یہ امر سخت مصیبت ناک ہے"

آپ جلدی سے یہ نہ کہہ اٹھیئے کہ خیر، بیچارہ نے کچھ تو تلافی کردی، لیکن اس "مصیبت ناکی"

کی ذرا تشریح بھی سن لیجیے۔ ہمدردی اس لیے نہیں کہ محمد علی کی زندگی کی قیمت کسی ادنیٰ مسلمان کی زندگی کے برابر بھی ہے، یا یہ کہ لکھنے والے کو محمد علی کی جان کا درد و قلق کسی درجہ میں بھی ہے، بلکہ طنز و تعریض کے اس بھاری پتھر کے نیچے حقیقت یہ دبی ہوئی ہے کہ

"جس اعزاز کے حصول کے لیے مولانا ممدوح نے اپنے اصول کو چھوڑا، اس سے کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع آپ کو نہ مل سکے گا.......... دعا ہے کہ خدا مولانا کو صحت عطا فرمائے، تاکہ آقایانِ فرنگ کے آستانہ پر ناصیہ فرسائی کرنے کی جو آرزو انھیں اس پیرانہ سالی میں کشاں کشاں یورپ لے گئی ہے، پوری ہو جائے[1]"

اور یہ تحریر جو محض نمونہ کے طور پر درج ہوئی، نہ اس اخبار ہی کی آخری اور اکیلی تحریر تھی اور نہ خود یہ اخبار اپنے اس رنگِ تحریر میں منفرد تھا ـــــــ محمد علی کا شمار یوں بھی صالحین امت میں تھا، پھر بھی خدا جانے زبان کے کتنے گناہ ان سے سرزد ہوتے رہے ہوں گے۔ حکمتِ خداوندی نے کیا اچھا سامان ان گناہوں کے ڈھل جانے کا یوں بدزبانوں کے زبان و قلم سے ادا کرا دیا!

[1] کتنا مختلف تھا نومبر و دسمبر ۱۹۳۰ء کا زمیندار جنوری ۱۹۵۲ء کے زمیندار سے جو اب لکھتا ہے: "وہ باتیں کرتا تو سننے والا ایسا محسوس کرتا جیسے شیرِ نر کچھار میں گونج رہا ہے، تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو سامعین یہ سمجھتے کہ آسمان کے آغوش میں بادل گرج رہا ہے، منبر پر ہوتا تو امام غزالی کی زندہ تصویر، میدان میں ہو تو محمد بن قاسم کا قابلِ فخر نمونہ...... اسلامیان ہند کا قائد اولوالعزم، مجاہد سپہ سالار چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے مضبوط قدموں سے کرۂ ارض کا سینہ بیٹھا جاتا ہے۔ دوران تقریر میں اپنا ہاتھ جوش کیساتھ لہراتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ اپنے آہنی پنجہ سے گردشِ افلاک کو مروڑ ڈالنے کو آگے بڑھ رہا ہے...... مختصر یہ کہ وہ ایک ہی وقت میں بلند پایہ شاعر، بے مثال ادیب، متبحر عالم، حقیقت بیان خطیب، عدیم النظیر مقرر، اعلیٰ ترین مدبر، کوہ وقار مجاہد، اولوالعزم سپہ سالار، لاثانی اخبار نویس، جلیل القدر رہنما اور بہترین سیاست داں تھے، افسوس ہے کہ پاکستان کو اس مجسمۂ علم و عمل، اور تصویرِ عزم و ہمت جرنیل کی قیادت نصیب نہ ہو سکی۔

دنوں سے گزر کر نوبت ہفتوں کی آپہنچی، اور علالت کی تشویش انگیز خبریں برابر پہنچتی رہیں، خدا خدا کر کے وسط نومبر میں افاقہ ہوا اور محمد علی اس قابل ہوئے کہ کسی طرح لندن پہنچ سکے، معاندین کے طبقہ کے سوا اور جتنے مسلمان تھے، سب کے دل سے یہی دعائیں نکل رہی تھیں کہ مولانا کسی طرح لندن پہنچیں تو کہ ان کی شرکت کے بغیر مسلمانوں کی نمائندگی کانفرنس میں ادھوری کیا بمنزلۂ صفر کے رہ جائے گی۔ اللہ نے غریب مسلمانوں کی سن لی، اور مولانا کانفرنس میں پہنچ گئے۔ پہلے ہی اجلاسِ عام میں انکی جو تقریر ہوئی۔ اس نے دوست تو دوست دشمنوں تک سے داد لے لی۔ دسمبر کے شروع کی کوئی تاریخ تھی، جب مولانا کی تقریر کا جو خلاصہ تار پر اخبارات میں آیا، اس میں بھی یہ الفاظ موجود تھے:-

"ہم دونوں بھائی وہ پہلے دو شخص ہیں جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں ڈال دیا تھا، لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں لیکن اپنے ملک کی آزادی کا تو میں اس وقت قائل ہو نگا جب مجھے یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ میں جب چاہوں، لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل بھجوا دوں .....

میں درجۂ نوآبادیات کا قائل نہیں۔ میں تو آزادئ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں ...... برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے، لیکن ۳۳ کروڑ کی جس آبادی نے خود اپنے میں مرجانے کی ہمت پیدا کر لی ہے، اسے مار ڈالنا کچھ آسان نہیں...... اصلی مسئلہ اس وقت ہند و مسلم مفاہمت کا مسئلہ ہے، دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرانے کا مسئلہ اب ایک بھولا ہوا خواب ہے...... میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں، اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا، جب تک کہ اپنے ہمراہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں، اگر آپنے یہ نہ دیا تو

تو میرے لیے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجئے۔"

اللہ اللہ! یہ اللہ کے شیر کی آخری گرج تھی، جو کہنا چاہیے کہ عین سلطان جائر کے دربار میں بلند ہوئی، اور حدیث نبوی کی وہ بات پوری ہوئی کہ سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے! ——— خوب لحاظ رکھ لیجئے کہ یہ دسمبر ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ ۱۹۴۷ء و ۱۹۴۸ء نہ تھا۔ ۱۹۳۰ء کے معیار تقریر و تحریر میں رکھ لیجئے۔ اور جب ایک نظر اس تقریر کے تیوروں پر کیجئے۔ یہ لارڈ ریڈنگ وہی "صاحب جبروت" بزرگ ہیں، جو ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے وائسرائے تھے، اور جن کی قہرمانی سے ایک عالم لرز رہا تھا۔ اور یہ حضرت بنفس نفیس گول میز کانفرنس میں جلوس افروز بھی تھے۔ ——— "موت یا آزادی"! یہ قلندرانہ نعرہ اس بیباکی سے کون لگا سکتا تھا، بجز اُس مردِ مومن کے جس کا ایمان غیب پر اس کے شہود و مشاہدہ سے شاید کچھ کم نہ تھا۔ مالک الملک کو اپنے بندۂ غیور کی بات کی لاج رکھنی تھی۔ کیسی بات اُس کی زبان سے نکلوادی۔

اُدھر دنیا ہمت مردانہ کی ان رجز خوانیوں سے گونج رہی تھی، ادھر ہندوستان (خصوصاً لاہور، دہلی اور بمبئی) کے بعض معلوم و معروف، اور اردو و انگریزی اخبارات مسلسل بدزبانیوں اور سب و شتم کے تیر برسانے میں مشغول تھے، بیماریوں کی خبریں اور کارگزاریوں کی روداد یں اس زمانہ میں دوسرے ذریعوں سے آتی رہیں۔ خود مولانا کے خطوط اس درمیان میں جو آئے، وہ اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ بی کے نام آئے۔ لیکن اکثر ان میں یہ تصریح بھی ہوتی تھی کہ وہ خط اس نامہ سیاہ کے پاس بھیج دیے جائیں۔ مولانا کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بی اپنے شوہر شعیب قریشی (وزیر ریاست بھوپال) کے ساتھ خود بھی اس وقت انگلستان میں تھیں،

اور بیگم محمد علی تو (جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے) آخر وقت میں اپنے شوہر نامدار کا ساتھ دینے کیلیے ہمراہ ہی تھیں، اور ان کی عمر کی آخری منزل میں بھی زندگی بھر کی رفاقت کا حق ادا کر رہی تھیں ——— بیگم محمد علی محض بیوی نہ تھیں، محبوب اور بڑی چہیتی بیوی تھیں ——— مولانا شوکت علی بھی لندن ہی میں تھے۔ غرض محمد علی کے قریبی عزیزوں میں اس وقت صرف زہرہ بی ہی ہندوستان میں تھیں، اور قدرۃً ان کے ہر خط کی مخاطب بھی یہی تھیں۔ ذیل میں اس دور کے صرف دو خط درج کیے جاتے ہیں۔ نمونہ کے لیے بالکل کافی ہونگے۔ پہلا خط ۱۶ر نومبر کا بیرس سے لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرا اس سے سات ہفتے بعد ۲۶ر دسمبر کا لندن سے لکھا ہوا۔

باب (۴۶)

سنہ ۱۹۳۰ء (۴)

(سفر کی کہانی مسافر کی زبانی)

(۱)

"پیرس (اسپلنڈر ہوٹل)

۲ر نومبر سنہ ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ۔

خداوند کریم تجھے اور طارق کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آج ہندوستان سے چلنے کے ایک ماہ اور دو دن بعد میں پہلی بار تجھے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج رہا ہوں تاکہ تو اور سب عزیز و اقارب اور دوست احباب مطمئن ہوجائیں کہ خداوند کریم کے فضل سے میں نے دوبارہ زندگی پائی۔ حقیقتاً جو دھچکا مجھے اس بار لگا وہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ باوجودیکہ یہ جگہ شملہ کی طرح سطح سمندر سے اونچی نہ تھی۔ تاہم خون کا دباؤ بالکل شملہ کی طرح ۹۰ سے اوپر ہوگیا تھا اور لمبا سانس کے باعث ناممکن ہوگیا تھا۔ بھوپال میں بھی ابتدائے ستمبر میں بمبئی سے واپسی پر خون کا دباؤ یکایک اسی طرح بڑھ گیا تھا۔ مگر سانس کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ اس بار سب سے زیادہ تکلیف دہ بخار، جگر کا بڑھ جانا اور اس میں درد پیدا ہوجانا، بھوک کا بالکل غائب ہوجانا

متلی کا بار بار ہونا اور صفرے کی عجیب غریب زیادتیوں کے باعث پانچ دن تک غذا بالکل
ہضم نہ ہو سکی اور اس طرح ایک طرف ضعف اور دوسری طرف صفرے سے کشتی لڑنا یہ سب
کچھ ہوا۔ شملہ میں مرض کا پہلا سخت حملہ تھا اور بدن میں مقابلہ کی قوت تھی۔ بھوپال میں بمبئی کو
واپسی پر حملہ اس قدر سخت نہ تھا، مگر بدن میں اب جان نہ تھی۔ یہاں تو کچھ نہ پوچھو کیا گزری۔ خدا
تیری بی بی کا بھلا کرے، رات دن میری رفیقِ سفر تھی اور مجھے اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ خدا بھلا
کرے میرے مصری اور ترک دوست ڈاکٹر بہجت وہبی کا جنھوں نے بہتر سے بہتر ماہرینِ علاجِ
قلب و معدہ سے میرا علاج کرایا۔ اور صبح و شام خود بھی اس میں مصروف رہے۔ جو امداد ان سے
ملی ساری عمر میں کسی سے نہیں ملی۔ ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ ان سے زیادہ اچھا اور سچا مسلمان
میں نے آج تک نہیں دیکھا اور ان کا عشق میرے دل میں پہلی بار اُس وقت جاگزیں ہوا تھا
جسے اب کوئی پچیس برس ہوئے ہوں گے۔ جب میں نے مدراس کے اسلامی اخبار میں اس
مضمون کی نقل پڑھی جو انھوں نے انگلستان کے مشہور رسالہ "انیسویں صدی اور مابعد"
Nineteenth Century and After میں پین اسلامزم یعنی اخوتِ اسلامی پر لکھا تھا۔ اقبال سے
بھی پہلے میں نے اپنے اسلامی خیالات کا نقشہ انکے اس مضمون میں دیکھا تھا۔ اس سچے مسلمان پر جو ڈاکٹر
انصاری کی طرح ایم ڈی کی ڈگری انگلستان سے لے چکا ہے اور جو مصری حکومت میں جنگ سے پہلے اناٹومی یعنی علم تشریح
کا پروفیسر تھا، اسکے اسلام اور اسکی علمی اور عملی قابلیت کے باعث جو کچھ گزرا ہے وہ ایک ہی داستان ہے اور جس طرح
وہ آج پیرس میں ایک جلاوطن کی زندگی گزار رہا ہے اور دال روٹی کھا رہا ہے وہ بھی ایک داستان
سے کم نہیں ہے۔ انشاء اللہ کبھی یہ سب داستان دہرائی جائے گی۔ آج وقت نہیں۔ جب میں
سنہ ۱۹۳۰ء میں وفد خلافت کو لے کر آیا تھا تو میرے ترک دوست اسعد فواد بے اور میری مصری
دوست زیبا خانم اسعد کی بیگم صاحبہ کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں رہتے تھے۔ پہلی بار ان تینوں

دوستوں سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ جب ۱۹۲۰ء میں مہاراجہ صاحب الور کی فیاضی اور قدر افزائی کے باعث میں یورپ کو پھر علاج کے لیے آیا تو ڈاکٹر وہیں نے مجھے یہاں کے ایک ماہر علاج ذیابیطس کو بھی دکھایا تھا۔ جب جرمنی جاتے وقت پیرس ہی میں بیمار پڑ گیا تھا تو ان ہی نے دیکھا بھالا تھا اور فرینکفرٹ روانہ کرایا تھا۔ واپسی میں مظفر اور میں اسی ہوٹل میں جہاں یہ ہا کرتے ہیں ٹھہرا تھا، جہاں اب بیماری کے باعث بی اور میں رہتے ہیں۔

جہاز پر تو میں آنکھوں سے اندھا تھا۔ اور قلب کی حالت خراب تھی۔ البتہ عدن پہنچنے تک طبیعت درست ہو گئی تھی۔ وہاں جہاز سے اترنا چڑھنا اور اپنی مریدنی خیر النساء اور حسین بھائی کے لائے ہوئے کھانے میں ذرا سا چکھ لینا بھی مضر ثابت ہوا اور دو دن بعد اس کا اثر محسوس ہوا مگر دو چار روز بعد طبیعت پھر سدھر گئی۔ میں شوکت صاحب، زاہد اور بی کے ساتھ قاہرہ تو اس بار نہ جا سکا، مگر پورٹ سعید میں بیت المقدس سے آکر حضرت مفتی اعظم امین الحسینی صاحب جہاز پر مجھ سے مل گئے۔ اور ان کے سکریٹری اور ہمارے موتمر عالم اسلام منعقدہ مکہ معظمہ کے ترجمان عجاج صاحب قاہرہ جاکر شوکت صاحب سے مل آئے اور ان ہی کے ساتھ واپس آکر مجھ سے مل بھی گئے۔ قاہرہ جانے کی طاقت مجھ میں نہ تھی۔ البتہ تین دن بعد مالٹا اتر کر میں نے اس جگہ کو دیکھا۔ جہاں ہمارے مرد اد حضرت محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے رفیق مولانا حسین احمد صاحب اور عزیز گل صاحب وغیرہ مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ قید کر دیے گئے تھے۔ اس میں تکان ضرور محسوس ہوئی گو میں موٹر سے بالکل نہ اترا تھا اور صرف ایک گھنٹہ اس میں گھوما تھا۔ مارسیلز میں اکرم روحی بے اور ان کے ساتھ ہی حضرت محمد رشاد خلیفۃ المسلمین مرحوم کے صاحبزادہ جو اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ میں یہیں رہتے ہیں ملے۔ یہ شعیب صاحب سے ملنے آئے تھے۔ ہم اسی دن پیرس چلے گئے اور گو راستہ لمبا

اور راستہ بھر اپنی ٹوٹی پھوٹی کہا۔ دس بارہ لفظ فرانسیسی زبان میں اپنے کمرہ کے مسافر کو سمجھانا پڑا
کہ پہلے ہم گاندھی جی کے ساتھ مل کر کس طرح کام کرتے تھے اور اب کیوں مسلمانوں کی حق تلفی سے
پریشان ہو کر ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس تحریک سے علیحدہ ہیں۔ مگر ہندوستان کی آزادی
کے لیے آواز بلند کرنے لندن جا رہے ہیں۔ جس کے باعث مجھے کم آرام ملا، تاہم شام کو پونے گیارہ
بجے ہم بخیریت پیرس پہنچ گئے اور ڈاکٹر وہبی اور شوکت اللہ شاہ کو اسٹیشن پر پایا۔ رات کو آرام سے
سویا۔ صبح کو غسل کیا، ناشتہ کیا اور بی کے لیے چند ضروری چیزیں خریدنے بازار گیا۔ یہاں
White Away سے بیسیوں بڑی دوکانیں تین چار بے حد مشہور ہیں۔ اُن میں سے
ایک میں سب چیزیں مل گئیں، مگر مجھ پر یہ محنت سخت گزری اور بھوک سے بیتاب ہو گیا۔
ایشیائی کھانے کی تلاش میں ایک ارمنی کی دوکان میں گیا جہاں گوشت حلال ملتا ہے،
خدا نے تمھاری بی کو بے حلال کیے ہوئے گوشت سے اب تک بچایا ہے اور ان شاء اللہ ہم
لندن میں بھی اس سے محترز رہیں گے۔ اس دوکان میں پہلی جو چیز ملی وہ طولمہ (دولمہ) تھے مگر
مجھے پسند نہ آئے تاہم بھوک سے مجبور ہو کر کھائے پھر گوشت اور چاول ملے جو خوب لذیذ تھے
اور پیٹ بھر کر کھائے گئے۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس پر اکتفا نہ کیا گیا دہی میں ملے ہوئے سیخ پر
لگے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھی کھائے جو سب سے زیادہ مزیدار تھے اور ذرا سی کھیر بھی۔
اسقدر شکم سیر ہو کر کھانا ہزاروں مرتبہ کھایا تھا۔ مگر اب بیماری نے قوت ہضم نہیں چھوڑی تھی۔
ذرا سا ہوا کھا کر جو ہوٹل آیا تو سوء ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ پلنگ پر آتے ہی لیٹ گیا رات کو کچھ
نہ کھایا اور صبح بھی احتراز کیا البتہ غسل کر کے دوپہر کو ہوا خوری کے لیے بی کے ساتھ موٹر میں گیا
اور الموڑہ کے دوست بدری ناتھ پانڈے اور گووند بلبھ پنت جی سوراجی لیڈر نینی تال
کے داماد چندر دت پانڈے صاحب جو یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ساتھ تھے۔ واپسی میں

قے ہوئی اور پت نکلے۔ شب کو بخار بھی ہوگیا۔ یہ ۱۸ و ۱۹ اکتوبر کی سرگزشت ہے۔ اس کے بعد
چار پانچ دن سخت حالت خراب رہی۔ بالآخر (ڈاکٹر بوری) ماہر علاجِ قلب نے جلد سے
جلد جو دن علاج کے لیے نکال سکتے تھے ڈاکٹر دہبی کی دوستی کی وجہ سے دیا۔ اس سے پہلے
ایک دن ایک اور ماہر علاج قلب کے گھر جاکر قلب کی حرکت کا بجلی سے نقشہ کھچوایا اور قارورہ
کا امتحان کروایا لیکن جگر کی خرابی بیتاب کر دیا تھا۔ پت برابر بن رہے تھے اور چونکہ غذا ہو
نہیں رہی تھی اس سے خلو معدہ کے باعث اور بھی زیادتی تھی اور ان کے نکلنے میں آسانی نہ
تھی۔ مجبور ہو کر معدہ کے علاج کے ماہر کو بلایا۔ اس نے کہا چونکہ تم کل ڈاکٹر بوری کا علاج شروع
کرا رہے ہو اس لیے میری مداخلت بیکار ہوگی۔ تاہم شب کو سکون معدہ اور جگر کے لیے ڈاکٹر
کربیرلے افیون کا انجکشن دو چار دن دلوایا جس سے اب نیند آنے لگی۔ دوسرے ہی دن
سے ڈاکٹر بوری کا علاج شروع ہوا اور تین دن میں انھوں نے جگر کو درست کیا۔ قلب
کی حالت کسی قدر بہتر کی اور اب ان کا علاج باقاعدہ ہونے والا تھا کہ آغا خاں صاحب نے
اصرار کیا کہ میرے دوست پروفیسر واکیز کو بھی دکھاؤ۔

یہ ڈاکٹر بوری سے زیادہ مشہور ماہر علاج قلب ہیں مگر اب بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ایک
شفاخانہ ان کے سپرد ہے، وہیں روزانہ جاتے ہیں۔ مگر گھر پر کسی کا علاج نہیں کیا کرتے۔ یہاں
تک کہ ٹیلیفون کی کتاب میں سے اپنا نام نکلوا دیا ہے۔ اسی باعث ان سے رجوع نہیں کیا
گیا تھا۔ مگر آغا خاں نے اصرار کیا اور ان کو راضی کیا۔ مگر ان کے آنے کا چار پانچ دن انتظار
دیکھنا پڑا اس لیے کہ وہ پیرس سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مگر ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونیز دیلوجو
غالباً قریب کے رہنے والے ہیں آئے اور آکر دل، جگر، معدہ وغیرہ کی حالت دیکھ کر گئے۔ پیروں
پر ورم پڑ گیا تھا۔ پیشاب آور دوا لکھ کر دے گئے۔ اور اب چند دن صرف یہی علاج رہا۔ بالآخر

گزشتہ جمعہ کو بتاریخ ۲۱ر اکتوبر پروفیسر واکیبر نے خود یہاں آکر مجھے خوب غور سے دیکھا اور تجویز
کیا کہ چونکہ انھیں جلد کانفرنس میں شریک ہونا ہے اس لیے دل کی اصلاح بجائے منہ سے
لینے کے پچکاری سے رگوں میں لینا چاہیے تاکہ جلد از جلد اثر ہو۔ چنانچہ ۱ر نومبر کو اللہ کا نام لیکر
پچکاریاں کی گئیں اور کل ۵ر کو دے کر بند کر دی گئیں۔ اس عرصہ میں سب دوائیں بند کر دی
گئیں۔ البتہ شب کو سوتے وقت ایک یا ڈیڑھ چمچہ ایک خوش ذائقہ شربت دیا جانے لگا
تاکہ علی الصباح بلا تکلف ایک یا دو اجابتیں ہو جایا کریں اور روز صبح کو نمک کا بدمزہ
اور تکلیف دہ جلاب جو شملہ سے اس وقت تک روزانہ بلا ناغہ دیا جاتا رہا نہ دیا جایا کرے۔
واقعی یہ شربت بہت اچھا ثابت ہوا، اور تمھاری بی اور میں دونوں اسی کا استعمال کرتے
ہیں (بی کا قارورہ بھی امتحان کے لیے پرسوں بھیجا گیا ہے، تاکہ نقرس کا علاج تجویز کیا جاسکے)
چونکہ پیشاب آور دوا بھی بند کر دی گئی تھی اس لیے پیروں کا ورم اور بھی زیادہ ہو گیا۔ مگر
آج پچکاریاں بند کر دی گئیں اور وہ پھر جاری ہو گئی ہے۔ روز بروز حالت بہتر ہوتی
گئی مگر تین دن ہوئے۔ سورج خلاف معمول دو دن سے نکل رہا تھا میں بھی بی کے ساتھ
موٹر میں جنگل کی ہوا کھانے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ کس قدر کمزور ہو گیا ہوں۔ ۱۸ر اکتوبر سے
کمرہ میں بند تھا۔ اس سے پہلے پہلی بار ۳ر نومبر کو نکلا تو لفٹ ([illegible]) تک جانا دوبھر تھا
اور پھر وہیں پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ٹیکسی تک جانا مشکل تھا۔ خیر گھنٹہ بھر جنگل میں موٹر
دھوپ میں گھمائی، پھر ایک جگہ آکر بی کو دودھ کی برف کھلوائی اور دو ڈھائی گھنٹہ بعد پھر
ہوٹل آئے۔ ڈاکٹر وہیں صاحب اتفاق سے دیکھنے آئے اور نہ پایا تو سخت ناراض ہوئے اور
اسی وقت معلوم ہوا کہ پچکاریوں کے زمانہ میں بھی ان کا سخت پرہیز تھا۔ کھانے کا تو پرہیز تھا
ہی، سوائے دودھ ڈبل روٹی اور ترکاری کے سوپ (SOUP) سب کچھ بند تھا۔ البتہ

تین چار دن تمہاری ساتھ کی ہوئی مونگ کی دال خوب کام آئی۔ کھچڑی کھوائی جاتی تھی مگر آج تک کسی نے ایسی کھچڑی نہیں کھائی، کبھی دال نہیں گلی تو کبھی چاول نہیں گلے اور گلوائے گئے تو اسقدر پانی ڈالا گیا کہ کھچڑی کا کسی کو گمان نہ ہو سکتا تھا۔ دلیا معلوم ہوتی تھی۔ اس میں نمک کم کہ ورم نہ بڑھے اور چکنائی نداردکہ جگر نہ بڑھے، تاہم یہ سب کھانوں سے لذیذ تر معلوم ہوتی تھی، اس لیے کہ سوائے لانبے کدو کے سوپ کے کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی، البتہ آلو ابلے ہوئے میس کر دیے جاتے تھے جس میں لیموں اور زیتون کا تیل ڈال کر سلاد بنا دیا جاتا تھا خیر یہ بھی زمانہ جوں توں گزر گیا۔

آج صبح ۹ بجے آکر پروفیسر واکیز اور ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونیز ولیو نے پھر دیکھا اور کہا کہ الحمد للہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہو گئی ہیں۔ اور جب قرارداد سابق اب تم کل دس بجے لندن جا سکتے ہو۔ سوائے پیشاب اور دوا کے اور اجابت کے لیے شربت کے ۱۰ دن تک کوئی دوا استعمال نہ کرنا۔ اس کے بعد دل کی دوا جو منہ سے دی جاتی تھی وہ کھایا کرنا، اگر خدانخواستہ پھر کوئی سخت خرابی محسوس ہو تو پچکاریاں پھر شروع کر دینا۔ کانفرنس میں روزانہ شرکت کی غالباً ضرورت نہ پڑے، نہ ہر وقت حاضری کی، جتنا زیادہ آرام کر سکو کرنا۔ ہمیں امید ہے کہ کانفرنس میں وقتاً فوقتاً رائے بھی دے سکو گے جب ضرورت تقریر بھی کر سکو گے۔ جب اس سے فارغ ہو جاؤ تو پھر پیرس آکر ہمارا علاج کرانا انشاءاللہ ایک یا ڈیڑھ مہینہ کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائے گا کہ کبھی گویا یہ مرض ہوا ہی نہ تھا۔ دوا اور غذا کے متعلق مفصل ہدایات وہ اس وقت ارسال کر رہے ہیں تاکہ لندن جا کر ڈاکٹر عبدالرحمن ان پر خود بھی عمل کر سکیں اور مجھ سے بھی عمل کراتے رہیں ان کا انگریزی میں ڈاکٹر وہیں جا ترجمہ کر لیں گے۔ بیگم صاحبہ بھوپال کو راستہ میں انفلوئنزا ہو گیا اسی لیے عبدالرحمن

پیرس نہ رک سکے۔ اگر ان کی طبیعت درست ہو گئی ہو گی تو وہ شاید آج لندن سے یہاں آجائیں
تاکہ میرے ہمراہ سفر کریں۔ ورنہ فرانس کی حد پر یعنی کیلے کے بندرگاہ میں زاہد آجائیں گے اور
اپنے ہمراہ ہم دونوں کو لندن لے جائیں گے۔ آجکل کیلے سے ڈوور تک سمندر کا سفر تکلیف دہ
ہوتا ہے۔ جس دن شوکت صاحب لندن گئے اس دن سخت طوفان تھا۔ زاہد صاحب تو
یہاں سے ۲۶ اکتوبر ہی کو لندن روانہ ہو گئے تھے۔ شوکت صاحب ایک ہفتہ بعد یعنی ۲
نومبر کو گئے۔ یہاں ایرانی، افغانی اور ترکی سفراء سے ملاقات کی۔ رؤف بے حسب معمول
خود یہاں تشریف لائے اور گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ عدنان بے اور اُن کی بیگم صاحبہ
خالدہ ادیب خانم یہیں تھے، مگر اب لندن تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہاں ان سے ملاقات
ہو گی۔ فتحی بے صاحب یہاں ترکی کے سفیر تھے۔ مگر وہ ایک نئی سیاسی پارٹی کی صدارت
کے لیے انگورہ جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ میرے پرانے رفیق اور سچے مسلمان منیر بے صاحب
ترکی سفیر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے یہ سوئٹزرلینڈ میں تھے۔ ان سے میری دوستی ۱۹۲۰ء میں ہوئی
تھی، جبکہ توفیق پاشا کی سرکردگی میں پہلا ترکی وفد صلح کے لیے آیا تھا اور شرائط صلح کو سخت
تباہ کن پاکر واپس چلا گیا تھا۔ جب مجھے .... جاکر اس وفد سے ملنا ہوتا تھا تو نماز کے
لیے مصلیٰ ان ہی کے ہاں ملتا تھا۔ ان ہی کے ذریعہ سے ہم نے خفیہ طریقہ پر سلطان وحید الدین
کے پاس توفیق پاشا کی بہو اور سلطان کی لڑکی کی معرفت اپنے وفد کا خط بھجوایا تھا۔

افغانی سفیر یہاں ابتک وہی ہیں جو شاہ ولی خاں کے ہمراہ یورپ آئے تھے اور جنھیں
متھرا سے اپنے ساتھ بٹھا کر موٹر میں دہلی لایا تھا، تاکہ وہ اسی شام کو اپنے سسر کے ساتھ اپنی سا س
سے ملنے نینی تال جا سکیں۔ گول میز کانفرنس کا کام الحمدللہ جہاز پہ اچھی طرح ہوتا رہا، اور
مہاراجہ صاحب الور نے اس میں بڑی مدد کی۔ شوکت صاحب اسی لیے یہاں سے ۲ تاریخ

کو چلے گئے۔ آغا خاں صاحب دو دن پہلے جا چکے تھے۔ مجھ سے ان سے ٹیلیفون پر خوب باتیں ہوئیں اور ان کو متفق پایا۔ جو خبریں بعض امریکن اخبارات کے ذریعہ سے ملیں ان سے امید ہوتی ہے کہ ہندوستان کا مطالبہ غالباً متفق ہو "خدا ہم چنیں کند"۔ کامیابی ہر حالت میں سخت مشکل ہے۔ مگر اس کے بغیر ناممکن ہے۔ خدا کرے مہاسبھائی ذہنیت سمندر پار جا کر بدل جائے اور ہندوستان والوں کو اپنی غلامی کا صحیح احساس ہو جائے اور ایک دوسرے کو غلام بنانے کے خیال کو چھوڑ کر سب کو دوسروں کی غلامی سے نکالنے کی کوشش کریں۔ خدا ہندو مسلمان دونوں کی توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں اور غلامی سے اتنے بیزار ہوں کہ نہ دوسروں کی غلامی قبول کریں اور نہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کریں۔ آمین ثم آمین۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ اس خط کو سب عزیز و اقارب کو رامپور میں سنا کر فوراً عرفان صاحب کے پاس بھجوا دینا کہ اسی ہفتہ خلافت میں شائع ہو جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کی نقل دفتر خلافت کو بھجوا دی جائے۔ اصل تم اپنے پاس رکھو۔

یہی خط نواب اسماعیل خان اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے لیے ہے۔ سب کو سلام دعا پیار۔ طارق کو بالخصوص۔

تیرا دعاگو اور دعا کا طالب

محمد علی"

(۲)

سات ہفتہ بعد کا خط

"ہائڈ پارک ہوٹل

۲۶ ردسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ۔

خداوند کریم ہم سب کو جلد اور بامراد ملائے۔ خدا کو یونہی منظور تھا کہ میں آج تجھے اپنے ہاتھوں سے خط لکھوں۔ ورنہ گزشتہ جمعہ کو جو بڑا خط اپنے سکریٹری سے میں ٹائپ کراتا رہا ہوں، اس کے شب کو ختم کراتے ہی میری طبیعت اتنی بگڑی کہ میں نے خود ہی بڑے ڈاکٹروں یعنی ڈاکٹر امیر ونگر کے دوست ڈاکٹر رائل اور نلمنہ بی کے شوہر ڈاکٹر انکلینویا کو بلایا اور دونوں نے حالت اس قدر ابتر پائی کہ فوراً دو نرسوں کو بلوا بھیجا اور اگر اتنی جان بھی نہ ہوتی کہ پاس کے ہسپتال (St. Georages Hospital) تک جو سڑک کے کونے پر ہے بھیجا جا سکتا ہے تو ضرور بھیج دیا جاتا۔ ۹ر کی شب کو حرارت تو ضرور ۹۹ تھی مگر نبض ۱۳۵۔ ۲۰ر کو بالکل بے ہوش رہا۔ حرارت ۹۷ رہی مگر نبض ۱۰۰ تک گری پھر ۱۳۵ تک بڑھ گئی۔ ۲۱ر کو حرارت ۹۵ گر گئی۔ مگر جلاب کے باعث جس کا ہوش مجھے صرف اجابت آنے سے ہوتا تھا۔ نبض ۸۰ تک گر گئی۔ آنکھ کھلی تو ذرا بھی ہوش نہ تھا کہ میں دو دن سے موت کے منہ میں تھا۔ نہ اس کا ہوش تھا کہ دن ہے یا رات۔ رات کو دن سمجھ کر لارڈ سینکی لارڈ چانسلر کو جو وزراء میں سب سے معقول آدمی ہے، اس شب کے وقت حاضری کھانے پر بڑی منت سماجت نرس کی کر کے بلایا۔ کیونکہ ریکزسے میکڈانلڈ ہند و مسلم معاملات کو سلجھانے سے قاصر تھا اور مجھے دھن اسی کی تھی۔ نہ معلوم کس طرح نرس راضی ہو گئی۔ غالباً اتنا بڑا نام سنا تو ہیبت زدہ اور مرعوب ہو گئی۔

لارڈ ہیلی بڑا شریف انگریز ہے، سمجھ گیا اور سن چکا تھا کہ موت اور زیست کے بیچ میں ہوں
اس لیے دوسرے ہی دن صبح گیارہ بجے آنے کا وعدہ لکھا کر دیا۔ وہ آئے اور گو شوکت صاحب
نے بھی اسی وقت آنا چاہا اور میں گھبرایا کہ بات نہیں کرنے دینگے جس سے کسی قدر ناچاقی ہوئی۔
تاہم دس منٹ ہی میں میں نے اپنا مطلب ادا کر دیا اور کہہ دیا کہ سارے ہندوستان
کا ہند و مسلم (مسئلہ) ایک ہے۔ قومی ہے اور تاریخی ہے، صوبہ وار نہیں ہے۔ صرف اصول
پر ہر جگہ طے ہوگا اور وہ اصول یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو پوری قوت مسلمانوں
کو دو اور تتمہ ہنود کے لیے اس طرح لگا رہنے دو یعنی
Power of Mojority
خواہ ۵۱ یا ۶۰ کی ہو یا ۴۰۔ ۵۴ کی اور Protection of Minority خواہ ۴۵ کی ہو
یا ۴۰ کی۔ غضب یہ ہو رہا ہے کہ سکھوں اور انگریزوں کے بہانے سے پنجاب اور بنگال
میں مسلمانوں کی مجارٹی کو مینارٹی کیا جا رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کل آنکھ کھولتے ہی
بیگم شاہنواز کی تحریر اس مضمون کی پڑھی کہ پنجاب میں ایک دو مسلمان کم کر دیے جائیں
تو کیا ہرج ہے۔ یہ رحمدلی اور ملک پروری نہیں ہے، پاگل پن ہے۔ یہاں آئے ہی کیوں
تھے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ دو دن سے برابر ترقی ہے۔ کل ۱۳ تک ہسپتال
جا کر آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک رات کی ساری نیند اس مصیبت میں گئی کہ ۴ دسمبر
تک "خلافت" میں میری پوری تقریر کا ترجمہ نہیں شائع ہوا تھا۔ حالانکہ ۱۲ کی شب کو
دی تھی اور اسی شب کو اصلاح کر کے مسلم آؤٹ لُک لاہور کو ارسال کی تھی۔ تین
گھنٹے شب مصیبت میں کاٹے تھے وہ خدا ہی جانتا ہے (ایسے) "خلافت" والے تو دو ہفتے
میں لنڈن کے اخباروں سے بھی لے سکتے تھے۔ مگر فکر کسے اور عقل کس کو۔ دفتر میں عجیب
تونڈھار مچا رکھا تھا۔ خدا رحم کرے۔ اچھا اب رخصت۔ اس کی بہت معاف نقل کسی

سمجھ لو۔ اس شخص سے کہہ کے عرفان صاحب یا کسی اور کو بمبئی بھیج دو کہ بغیر سنسر کے دیر لگائے
ہوئے فوراً طبع ہو جائے۔ اصل ماجدہ، ذوالفقار بھائی اور معظم کو دکھاتے ہی اسمٰعیل خاں صاحب
کو بھیج دو۔ اور ان سے کہہ دو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو اسے ڈاک سے بھیج دیں۔ کہ
کسی ترکیب سے حیات کو بھی فوراً ہی پہنچ سکتا۔ مگر اب سکرٹری کی جگہ ایک چھوڑ دو نہیں ہیں
خدا معلوم مصارف کیسے ادا کروں گا۔ بی کے لیے مجبور ہو کر ایک علٰحدہ کمرہ لیا ہے جس میں
شوکت صاحب بھی آ کر سو جاتے ہیں۔ مظفر زاہد کے ساتھ ہے۔

طارق کو اور تجھے پیار۔ تمھارا

محمد علی"

باب (۴۴)

سنہ ۱۹۳۱ء

آہ ملت یتیم ہوگئی

دسمبر کے آخری ہفتہ کی ابتدا تھی کہ اپنی خانگی ضرورتوں سے حیدرآباد ڈیڑھ دو ہفتہ کے ارادہ سے جانا ہوا۔ محمد علی کے پرستاروں کی کہاں کمی تھی۔ یہاں بھی شیدائیوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ موجود تھا۔ کانفرنس کی تقریروں پہ ہر کان لگا ہوا۔ ہر زبان پر داد و تحسین، علالت سے تشویش و اضطراب ہر دل میں پیدا۔ خیریت و صحت کی دعائیں ہر لب پر۔ انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا ایک خط، اور ساتھ ہی وزیر اعظم برطانیہ کے نام ٹائپ شدہ محضر یہاں ملے۔ خط میرے نام تھا، اور سیاست و علالت دونوں کی دلآویز و موثر تفصیلات سے لبریز۔ دست بہ دست گشت ہونے لگا۔ اور پھر الٹ کر مجھے اس کا دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ ورنہ یہ ڈائری ہرگز اس سے محروم نہ رہتی۔ اپنی شدید 'خطرناک' اور (جیسا کہ چند ہی روز میں ثابت ہوگیا) مہلک بیماری، اور اس کے آلام و شدائد کو اپنے شگفتہ پیرایہ میں لکھنا، یہ محمد علی ہی کا حصہ تھا —— کون جانتا تھا کہ شمع اب بالکل بجھنے ہی کو ہے، اور یہ بہار اس کی آخری بھڑک اور آخری جھلملاہٹ کی ہے! بیماری کے دورے اب جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ اور عقلاً وقتِ آخر اب بالکل سامنے تھا۔ لیکن طبیعت کمبخت

غفلتوں میں مدہوش و سرشار۔ یہ باور کرنا ہی کب چاہتی تھی اپنے اور دوسروں کے بہلانے کو دل ہمیشہ یہ تاویل کر لیتا تھا کہ "نہیں، جس طرح پچھلے دورے جھیل لے گئے، اب کی بھی اللہ انھیں اچھا ہی کر دے گا۔" محمد علی کے بغیر دنیا کیسی سونی ہو جائے گی، امتِ اسلامیہ کا کیا حشر ہو گا، مسلمانانِ ہند کیسے یتیم اور بے سر دھرے کے ہو جائیں گے، نفس ان امکانات ہی کو تصور کے سامنے لاتا جھجکتا، اور ہر دفعہ ان کو اپنے سامنے لانے سے ٹال لے جاتا تھا!

بات کہتے ۱۹۳۱ء شروع ہو گیا۔ جنوری کی غالباً ۳ تھی، جب حیدر آباد سے براہ دہلی واپسی کی ٹھیری۔ شب میں خواب دیکھا کہ کوئی جنازہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ دن میں اداسی افسردگی اور خوف کا اثر قائم رہا۔ سہ پہر کو ٹرین روانہ ہوئی۔ راستہ میں ۵ کو تازہ اخبار نہ مل سکے۔ بڑے بڑے جنکشن جہاں تازے اخبارات مل سکتے تھے، اتفاق سے رات گئے پڑے ۶ کو صبح سویرے گاڑی دہلی پہنچی۔ اسٹیشن پر میرا بھتیجا ملا۔ جو طبیہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ایک ہی آدھ بات کے بعد اس نے کسی سلسلہ میں کہا "کل تو کالج بند تھا اور شہر میں ہڑتال تھی"۔ "کیوں؟" کا سوال قدرتی تھا۔ "مولانا کے انتقال کی خبر پر"۔ جواب بھی اسی لمحہ مل گیا۔ "کون مولانا؟" سوال کرنے کو تو بے دھڑک کر دیا۔ لیکن نہ پوچھیے کہ اس ایک آدھ سکنڈ کے قدرتی وقفہ میں دل پر کیا گزر گئی! بات بالکل موٹی اور صاف تھی۔ سوا ان مولانا کے اور ہو کون سکتا تھا؟ کون دوسرے مولانا بیمار تھے، جنکے انتقال پر شہر میں ہڑتال ہو جاتی؟ ابھی ریل سے مع پورے سامان کے اتر بھی نہیں پایا تھا کہ یہ سوال و جواب شروع ہو گئے تھے۔ اتر رہا تھا کہ یہ بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ جواب ملنے میں دیر ہی کیا لگتی۔ "مولانا محمد علی"! ـــــــ اُف! کیسی منحوس گھڑی تھی، جو یہ الفاظ کان کے پردوں سے ٹکرائے!

ہائے! کاش کبھی یہ خبر سننے کو نہ ملتی! جی تلملایا۔ جیسے کوئی نو گرفتار پرندہ قفس کے اندر تڑپ رہا ہو۔ نہ روتے بنتا تھا نہ کچھ کہتے سنتے۔ زبان پر ایک چیخ کے ساتھ "اناللہ" کے الفاظ آئے، اور پلیٹ فارم پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا! آنکھوں کے نیچے اندھیرا آرہا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا الٹ پلٹ ہوئی جا رہی ہے! دو چار منٹ بعد جب حواس ذرا قابو میں آئے، تو جھٹ جانماز بچھا پلیٹ فارم پر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اور چار رکعتیں پڑھ کر اس پاک و پاکیزہ روح کو ایصالِ ثواب کیا۔ اور دعا کے لیے جو ہاتھ اٹھائے تو اب رونا بھی دل کھول کر آیا۔ طبیعت بھری ہوئی تھی ہی۔ آنسو امنڈ امنڈ کر اب نکلنے شروع ہوئے۔ دعا و مناجات کے الفاظ اب کہاں یاد، لیکن عجب نہیں جو کچھ اس قسم کے ہوں:

"اے اللہ۔ تیری ذات ہر طرح بے نیاز ہے۔ لیکن ہم بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں۔ اتنا بڑا سردار اٹھ گیا۔ قوم کی قوم بے سری ہو گئی۔ ساری امت یتیم ہو گئی۔ اب کون ہماری صحیح رہنمائی کرے گا؟ انگریزوں کے، ہندوؤں کے، سارے غیر مسلموں کے مقابلہ میں کون ہم سب کی طرف سے سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے گا؟ یہ اخلاص، یہ فراست اب کہاں دیکھنے میں آئے گی؟ اے اللہ! محمد علی کو اٹھا کر آخر ہم لوگوں کو اب کس پر چھوڑا؟ کس کے دل میں یہ درد، کس کی عقل میں یہ رسائی ہے؟

اے اللہ! تو اپنے اس بندے کی خطاؤں سے، لغزشوں سے درگزر کر! وہ تیرے دین کا دیوانہ تھا۔ تیرے نام کا عاشق تھا، تیرے رسول کا پروانہ تھا۔ اپنی عزت، اپنی وجاہت، اپنی قابلیت، اپنی صحت وہ سب تیرے دین ہی کے لیے وقف کیے ہوئے تھا۔ انسان تھا بشر تھا، بشری کمزوریاں بھی یقیناً رکھتا تھا۔ غصہ ور تھا، مزاج اور زبان پر قابو نہ تھا۔ ان سب خطاؤں کو تو اپنی مغفرت بے حساب کے پانی سے دھو دے۔ اس نے تیری راہ میں کتنے

دکھ درد سہے۔ کتنے ظلم اٹھائے، اپنوں اور بیگانوں سب کے تیروں کا کیسا ہدف بنا رہا، تجھ پر یہ سب خوب روشن ہے۔ اس کی مظلومیت ہی کو اس کا شفیع بنا۔ اس کو جنت اور اپنے غفران و رضوان کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ میں جگہ دے! اس کا حشر اپنے اولیا و مقبولین اور اپنے بندگانِ متقین و صالحین کے ساتھ کر۔ اس کی تربت پر اپنی رحمت کے بیشمار پھول برسا۔ اور ہم سب کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو صبر عطا فرما۔ تیرے ہی کسی عارف نے تیری زبان سے ادا کیا ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

سو اس کا ظہور آج سے بڑھ کر اور کب ہوا ہوگا۔ تیرے بڑے سے بڑے دشمن اور نافرمان باغی بندے کیسے ہٹے کٹے گھوم رہے ہیں اور وہ جو تیرے پیچھے اپنے کو فنا کیے ہوئے، مٹائے ہوئے تھا۔ اسی کو تو نے اٹھا لیا!

رو دھو کر طبیعت جب ذرا ہلکی ہولی، تو تانگہ کر کے سیدھا ایڈیٹر روزنامۂ ملت، جعفری صاحب کے ہاں گیا۔ محمد جعفری (ہمدرد کے خوب جانے پہچانے ہوئے سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر) گو اب مولانا کی سیاست سے علیحدہ ہو چکے تھے، پھر بھی برسوں ان کی صحبت میں رہ چکے تھے، ان کے مرتبہ شناس تھے، اور اب بھی رشتۂ اخلاص ان سے جوڑے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر دل کی بھڑاس اور نکلی۔ رونا از سر نو آیا۔ اور اب تعزیت میں وہ بھی شریک تھے۔ عزا و ماتم کے موقع پر کسی مخلص و غمگسار کا مل جانا خود ایک بڑی نعمت ہے ــــ جعفری ہی بیچارہ نے جلے ہوئے دل کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ فلاں ادارہ کو

بھی بادلِ ناخواستہ اور شرماشرمی، رائے عامہ سے ڈر کر، مولاناؒ کے ماتم میں حصہ لینا پڑا۔ یہ بھی وہیں سننے میں آیا کہ کل شام کو تعزیت کا جو عظیم الشان جلسہ شہر میں ہوا تھا، اس کی صدارت فلاں عالم کو دی گئی تھی لیکن ان کی بےحسی اور بےدلی سے کی ہوئی تقریر سے کہیں زیادہ گرمجوشی، اخلاص اور اثر دیش بندھو گپتا (ایڈیٹر "تیج") کی تقریر میں تھا ——

آج دہلی کا شہر ہی میری نظر میں کچھ سے کچھ تھا۔ جعفری کے ہاں آنے جانے میں آخر دو مرتبہ ان ہی سڑکوں سے گزرنا پڑا۔ بظاہر سب چہل پہل اسی طرح کی تھی۔ اسٹیشن پر مسافروں کا وہی ہجوم، وہی ریل پیل، ٹراموے، بسوں، تانگوں کا وہی شور و غل، بازاروں کا وہی ہنگامہ لیکن اپنی نظر میں آج دلّی بالکل سونی ہی تھی، اس کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ کہاں سہاگن کا چہرہ اور کہاں بیوہ کا بشرہ! ایک محمد علی کی ذات سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر پُر رونق ہے۔ آج جب وہ نہیں تو رونق کی جگہ ہر چہار طرف اداسی ہی اداسی ہے

ہے تمہارے ہی دم سے یہ بزم طرب ابھی جاؤ نہ تم، نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ رہے

محمد علی کی کتاب زندگی ختم ہو گئی۔ ڈائری کے نام سے جو یہ کتاب ڈائری نویس نے اپنے ذاتی تاثرات کی ان سے متعلق گھسیٹ ڈالی، وہ بھی اب خاتمہ کے قریب آ گئی۔ صرف ایک باب آگے اور آتا ہے۔ جس میں ہم ایک عام اجمالی تبصرہ ان کی زندگی پر ہو گا۔ اور اس کے بعد چند ضمیمے ملیں گے۔ سچ میں ان کا ماتم ہفتوں نہیں، مہینوں بلکہ شاید برسوں ہوتا رہا۔ ان تعزیتی تحریروں، اور منثور و منظوم ماتموں میں اقبالؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی و حفیظ جالندھری کے افاداتِ قلم خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور مولانا

شوکت علی و حافظ ہدایت حسین بیرسٹر مرحوم کی تحریریں جو ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، وہ سب بہ طور ضمیمہ محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح اس نامہ سیاہ کی دوسری تحریریں بھی، جو کسی نہ کسی موقع پر حضرت مرحوم کے سلسلہ میں نکل چکی ہیں۔

لیکن سب سے بڑھ کر موثر اور بابرکت حضرت مولانا تھانویؒ کا میرے نام کا مختصر سہ سطری تعزیت نامہ ہے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان ایک عرصۂ دراز تک تو خاصی ناگواری رہ چکی تھی۔ اور پوری صفائی تو آخر تک بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر بھی جو خط حضرتؒ نے میرے خط کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا، وہ ظاہر کر رہا ہے کہ اولیا اللہ کا ظرف بھی کتنا بلند ہوتا ہے! ضمیمہ کا انتظار کیوں کیجیے۔ وہ خط یہیں اور ابھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

" محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں، اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اسی اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں[1]۔ اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے، اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔"

---

[1] دونوں نے ایک دوسرے کو غالباً ایک بار دور سے دیکھا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد میں۔ قریب سے تعارف اس وقت بھی نہ ہوا تھا۔ اور اس کو بھی ایک لمبی مدت ہو چکی تھی۔ غالباً ۱۹۱۲ء میں، جب محمد علی بجائے مولانا کے 'مسٹر' تھے۔

اس نامہ سیاہ نے دونوں بزرگوں کو ملانے اور یکجا کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کا ذکر حضرت تھانویؒ کے حالات کے سلسلہ میں کتاب "حکیم الامت: نقوش و تاثرات" میں ملے گا۔

اے ہلالِ ماخمِ ابروئے تو

شیخ احمد سنوسیؒ کو چھوڑ کر، جن کی عظمت و جلالت کا اثر مجھ پر گو بہت گہرا اثر رہا، لیکن ان سے کل صحبت ہی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی نصیب رہی، اور اس لیے اس نقش کو بھی زیادہ پائداری نصیب نہ ہوئی، مستقل، گہرا اور پائدار اثر میری زندگی پر سب سے زیادہ دو ہی شخصیتوں کا پڑا اور میری زندگی کے بہ قدر ظرف سنوارنے، اور سدھارنے میں سب سے زیادہ معین ہوا ——— اگر یہ ناکارہ زندگی اپنی نااہلی کے باعث کچھ بھی سنور اور سدھر سکی ہو! ——— اور ان دونوں میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے حقِ تقدم مولانا محمد علی کو حاصل ہے۔

ان کا نام اُس وقت سے سننے میں آنے لگا، جب اپنا بالکل بچپن تھا۔ اسکول کے کسی بالکل ابتدائی درجہ کا طالبعلم تھا، اور وہ کالج کے منتہی ہو چکے تھے۔ ماہنامہ علیگڈھ میگزین کے حصۂ انگریزی میں ان کا نام اور ان کے کارنامے بار بار آتے تھے، اور اپنے پڑھے لکھے عزیزوں سے یہ چیزیں سن سنا کر ان کی عظمت اسی وقت سے دل پر بیٹھ گئی پھر رفتہ رفتہ خود ان کی اردو اور انگریزی تحریریں مزے لے لے کر پڑھنے لگا، اور نقش عظمت روز بروز اور گہرا ہوتا گیا۔ کالج سے نکلا ہی تھا کہ پہلی بار ان کی زیارت ہوئی۔ اب وہ کامریڈ کے مشہور ایڈیٹر تھے اور تحریکِ علی گڈھ کے ایک نامور علمبردار، عظمت تو

پہلے سے قائم تھی ہی، محبت بھی پہلی نظر پڑتے ہی پیدا ہو گئی۔ "چوں تو افتدم نظر" کا معاملہ۔ باقاعدہ ملاقات اور تعارف کوئی دو سال بعد ہوا۔ محبت اس ساری مدت میں برابر بڑھتی ہی رہی اور یہ اپنی مذہبی بدعقیدگی کے باوجود۔ پھر ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں جب وہ جیل میں تھے، اور میں از سرِ نو مسلمان ہو چکا تھا۔ اُن کا عشقِ رسول دیکھ کر اور نعتیہ کلام پڑھ کر خود ان کی ذات کے ساتھ ایک عاشقانہ اور والہانہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ اور محبت اور علمی عظمت میں نئی آمیزش گہری مذہبی عقیدت کی بھی ہو گئی۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ جیل سے باہر آئے تو انھیں مرشد سمجھ کر پابوسی کے لیے لپکا، انھوں نے جھکنے سے روک کر دوستانہ مصافحہ اور معانقہ پر سنبھال لیا۔ اور مدۃ العمر اپنی طرف سے بہ طور دوست، رفیق اور عزیز کے رکھا ــــــ میری ان کی عمر میں ۱۴ سال کا فرق تھا۔ سن کی بڑائی چھوٹائی کا یہ فرق مرتبہ کے لحاظ سے بھی آخر تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی طرف سے ہزار بے تکلف کرنا اور بالکل مساوات کی سطح پر لے آنا چاہا۔ لیکن مجھے "ایاز قدرِ خود بشناس" کی پند سودمند یاد تھی۔ میں کبھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھا۔

ستمبر ۱۹۲۳ء سے وسط ۱۹۳۰ء تک بہ کثرت یکجائی رہی۔ سال میں کئی کئی بار میں دہلی جاتا (شروع میں جانا علی گڈھ ہوتا) اور اس سے زیادہ وہ لکھنؤ آتے رہتے۔ متعدد سفر ان کے ساتھ کیے، دہلی سے لکھنؤ تک، دہلی سے پانی پت تک، کانپور سے لکھنؤ تک وغیرہ، ایک ایک بار بھوپال اور کانپور اور بمبئی میں یکجائی رہی۔ ان کی پبلک زندگی کے علاوہ ان کی خانگی زندگی کا بھی کوئی گوشہ نظر سے مخفی نہ رہا۔ ان کی رنجشیں بھی ان کے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ دیکھیں۔ غرض یہ کہ انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا، اور ہر طرح سے جانچا، پرکھا، تولا۔ یہ کہنا کہ ان کی شخصیت ہر بشری کمزوری سے پاک تھی، حدِ مدح میں شاعرانہ

مبالغہ کرنا ہوگا۔ وہ نہ فرشتہ تھے اور نہ کوئی نبی مرسل۔ ہر معمولی انسان کی طرح گوشت و پوست سے بنے ہوئے اور جذبات و احساسات رکھنے والے ایک امتی تھے۔ مزاج کے تیز تھے اور گو پٹھان نہیں، لیکن بہرحال "رامپوری" تھے۔ اشتعال بہت جلد قبول کر لیتے۔ خصوصاً آخر کے چند سالوں میں کثرتِ آلام و امراض اور ہجومِ افکار کے باعث۔ اور بات بات میں غصہ میں آجاتے۔ زبان پر قابو باقی نہ رہا تھا۔ جوش میں خدا معلوم کیا کیا زبان پر آجاتا۔ اور خرچ بھی زبان ہی طرح قابو سے باہر تھا ——— لیجئے، بس بشری کمزوریوں کی فہرست ختم ہوگئی، مجھ جیسے گہرے اور قریبی تعلق رکھنے والے کے علم میں بھی ختم ہوگئی۔ رواج عام اس وقت اپنے اپنے اخبار متعلقہ میں طرح طرح کے القاب و خطابات کا چلا ہوا تھا۔ زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں "ظفر الملت والدین" تھے۔ تنظیم میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو "سیف الملت والدین" تھے۔ دغیرہا محمد علی نے کبھی اپنے کو "محمد الملت والدین" لکھوانے نہ دیا۔ اور تو اور "رئیس الاحرار" انھیں ایک دنیا لکھ رہی تھی۔ لیکن اپنے اخبار ہمدرد میں اس لفظ تک کے روادار نہ ہوئے۔ خرچ جیسا اپنی ذات پر کرتے، ویسا ہی پیسہ دوسروں کو کھلانے پلانے تحفہ تحائف پیش کرنے، اور دکھیاروں کو دینے لینے میں اٹھاتے۔ اور دو چیزوں کے تو کہنا چاہیے کہ بادشاہ تھے۔ ان دو صفات میں ان سے بڑھ کر کیا، ان کے ہم پلہ بھی اپنے علم و تجربہ میں کوئی دوسرا نہ ملا:-

(۱) ایک، اسلام اور امتِ اسلامی سے بے انتہا محبت۔ دنیا میں کہیں کسی مسلمان کو تکلیف پہنچے، اور ممکن نہ تھا کہ محمد علی کا قلب اس سے نہ دکھے ——— کانٹا افریقہ کے کسی مسلمان کے چبھا، اور اس کی چبھن محمد علی یہاں بیٹھے محسوس کر رہے ہیں۔

(۲) دوسرے، سچائی اور حق گوئی۔ پارٹی کی مصلحتوں سے متاثر ہوتے میں نے ہندوستان کے چیدہ سے چیدہ مسلم اور ہندو لیڈروں کو دیکھا، اور تحزب (جماعت بندی)

میں مبتلا بڑے بڑے علماء و مشائخ کو پایا ہے۔ بے لاگ اور بے دھڑک۔ دوست، عزیز، بزرگ کسی کی بھی پروا کیے بغیر دل کی بات زبان پر لے آنے والا، محمد علی کا سا کوئی دوسرا دیکھنے میں نہ آیا ——— سادگی، اخلاص، بے تکلفی، بے تصنعی یہ سب صفات اس ایک صفت کے لازمی برگ و بار تھے، اتنی خوبیوں اور ظرافت و کردار کی ان ملکوتی بلندیوں کے بعد، عجب کیا جو حق تعالےٰ حشر میں ان کے پیرو مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی، قدس اللہ سرہٗ (متوفی ۱۹۲۶ء) کے اس وجدانی حسن ظن کو صحیح ثابت کر دکھائے کہ اگر علی برادران عہد نبوی میں ہوتے تو ان کے جذباتِ ایمانی سے کیا بعید ہے کہ خود حضور ان ہی نام کے ساتھ جنت کی بشارت دے دیتے کہ محمد علی فی الجنۃ و شوکت علی فی الجنۃ ——— رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اور محمد علی کی محبت اور انتہاء محبوبیت کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ آج جب ان کا مسکراتا ہوا شگفتہ اور شاداب چہرہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے، تو ۲۰ سال گزر چکنے پر بھی، خدا جانتا ہے کہ ان کی وہ محبوبیت تازہ ہو جاتی ہے، اور دل بھر آتا ہے، ——— خسرو دہلوی نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کو مخاطب کر کے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کے مصرعہ اپنے لیے قال نہیں حال!

ترکِ من ایں ماہ غلام روئے تو!

اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ع — جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو!

اور اس سے بھی بڑھکر ع — انبساطِ عید دیدن روئے تو!

اور — اے ہلالِ ما خمِ ابروئے تو!

خدا معلوم آپ نے کسی خوش گلو مطرب کی زبان سے یہ غزل کبھی سنی ہے یا نہیں؛ اگر سنی ہے تو بس تصور اسی پرسوز محفل کا جما لیجئے! ۔ اپنی تو سب سے بڑی مسرت ایک دو دن نہیں برسوں یہی رہی کہ

اس روئے انور کی زیارت ہو جائے۔ اور اپنے کسی عمل کا سب سے بڑا صلہ یہی کہ اس کی داد محمد علی کی زبان سے مل جائے!

ہائے، کتنا محبوب و شاداب چہرہ اور کتنا دلکش و پُر بہار بشرہ تھا، جو صبح محشر کے طلوع تک کے لیے نظر سے مخفی ہو گیا! —— جی چاہتا تھا کہ بس دیکھے ہی چلے جایئے، اور باتوں میں وہ دلآویزی کہ بس سنتے ہی رہیے!

ضمیمہ (۱)

محمد علی[1]

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی کہ یہ شب، شب قیامت یا نمونۂ شب قیامت بھی بن سکتی ہے، مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اسے اٹھا لیا جائے گا، جس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت، اللہ کا نام جینے والوں کی موت، محمد کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے۔ اس پچھلے زمانہ میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لیے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا۔ ترکوں پہ "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لیے مرہم تھا۔ ہر تازہ صدمہ کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اس خیال سے کہ کچھ بھی چلا جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جب پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لیے یہ منادی

[1] سچ (مرحوم) ۱۶؍ جنوری ۱۹۳۱ء

کردی تھی کہ مَا محمد الا رَسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ اَفَاِن مَاتَ اوقتل انقلبتم علیٰ اعقابکم۔ اس کے فرشتوں نے بندوں تک محمدؐ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچا دی!

اے پاک پروردگار، اے سب کے جلانے اور سب کے اٹھانے والے مولا تیرا ارادہ بیشک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلاشبہہ، آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر قادر لیکن کیا ہم جیسے ناتوان و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمایش، اتنے بڑے ابتلاء، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمایشیں تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہیں، ہم کم ظرف اس لایق تھے کہ جس گھڑی تری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں عین اسی وقت ہماری سب سے بڑی زندہ دولت ہماری سب سے قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ اور دل چاہتا تھا، جس کی موت کی خبر کبھی سننی پڑے، اسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں! تیری جناب میں ادنی گستاخی کا تصور بھی نہیں لایا جا سکتا لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک، انصاف کر کہ تیرے حبیب و محبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب تاب نہ لا سکا تو تیرے اس حبیب پاکؐ کے ایک ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ آزمایش کا بھی تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمایش کے لیے دل و جگر کس سے مانگ کر لائیں۔

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں کہ ایک بڑا قومی لیڈر اٹھ گیا، نیشنل کانگریس کا سابق صدر چل بسا۔ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہو گیا، یہ سب کچھ صحیح ہو گا۔ لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا کہ اللہ کا بندہ اٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہو گیا! آج ماتم اس کا نہیں، کہ ایک جادو بیان مقرر اور بہترین انشا پرداز گم ہو گیا، ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہو گیا جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھ لی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لمحہ اور ہر آن اگر تڑپ تھی تو رسولؐ کی نصرت و خدمت کی! اس کی سچی آپ بیتی تو خود اسی کے ایک شعر میں سنیئے ؎

سب کھو کے تری راہ میں میں دولتِ دنیا

سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

بیشک اس نے دنیا اور دولتِ دنیا ساری کی ساری کھو کے رکھ دی اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا "پاتے" ہوئے اور "لیتے" ہوئے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی اور "کل" انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری شروع ہی سے حصہ میں آئی، علی گڈھ میں نام پیدا کیا، آکسفرڈ جا کر ناموری کہاں سے کہاں پہنچی "سول سروس" کی جانب لپکے الٹے پاؤں واپس کیے گئے، بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدرشناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلافِ کعبہ پکڑ کر ربِ کعبہ سے مانگی گئی تھی کہ میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم

بنا دے ساتھ نہ چھوڑا، جو نہ صرف "مسٹر" ملکہ مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا، چہرہ پر داڑھی، سر پہ ٹوپی، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز، دین کی تڑپ ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر، سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کامریڈ و ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک متنفس۔ لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں، اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی آویزش، جنگ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلماء سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، "بنگالی ٹولہ" سے جنگ، احناف سے جنگ، اہلحدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شروانی، مجید خواجہ، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ جہاں تک پہنچ چکی تھی کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اُسے کوئی کیا سمجھاتا، اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر اللہ کے لیے سب سے لڑا، اور خوب لڑا، شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا ہے کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے۔ نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دل شکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھنا ہے، کوئی کہتا کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، کامریڈ و ہمدرد کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟ کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور و غل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت اور وقت کو ضائع کیا، ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا تھا، یا تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی۔ اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی دیوانہ ہو چکا تھا، اسے جو کچھ دکھایا گیا تھا اس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہہ تھا؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد

مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے، محمد علی کو نیشنلسٹ بت ثابت کر دکھایا جائے، وہ "دیوانہ" عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی کے اس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے، نہ "کمیونلزم" وہاں مد نظر صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو اتنا اونچا ہو چکا، اسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اس کے لیے باعث فخر یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے بت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا، اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اس کی ہندوستانیت ماتحت تھی اس کی اسلامیت کے! وہ خدا، اور "وطن" دو کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف "خدا" کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض کر رکھی ہے اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے وابستہ کی گئی ہیں اور جب وہ امیدیں ان پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں، تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب خوب کیے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ قَالُوا یَا صَالِحُ قَدْ کُنتَ فِینَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِی شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَیْهِ مُرِیبٍ۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کا کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی تھی، کسی کے خاک اور خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا، اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔

محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبوبوں اور عاشقوں سوختہ جانوں اور دل فگاروں کے لیے یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکستِ نفس!

عشق معشوقاں نہان ست و ستیز — عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ — عشق عاشق جانِ او را سوختہ

محمد علی تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجہ شہادت رکھتی ہے۔ پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام

شاہد ہے وَالَّذِینَ اٰمَنُوا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ اُولٰئِکَ ھُمُ الصِّدِّیقُونَ وَالشُّھَدَاءُ عِندَ رَبِّھِم لَھُم اَجرُھُم وَنُورُھُم۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا نورانی روشن چہرہ لیے ہوئے عالم برزخ میں جنت کی سیر کر رہا ہے اور تیرے نیازمندوں کو اپنی جگہ یہ یقین ہے کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کرے گا۔ اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا۔ جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا۔ اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاءاللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیق خاص، غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ و ایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے، وہی شعر آج تجھے خود سنانے کو جی چاہتا ہے۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین	کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے	ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا	چند نعم البدل دیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی	کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ	ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بدنصیب قوم تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا۔ صبر کر، جس طرح غم زدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! اخفتہ بخت ملت تو آج یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔ شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی۔ صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے رہتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے، وہ ہر نیست کو ہست اور ہر ناممکن کو ممکن کر دکھا سکتا ہے۔ لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہہ اپنے دل کو سمجھائیں

اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں ؟ ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح

باز رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علی کی عمر کل ۵۲ سال کی ہوئی حضور انورؐ نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی کی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا، قبل اس کے کہ مخدوم کی زندگی میں مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کسی کس طرح نکل کر نہ رہیں گی۔

ضمیمہ (۲)

محمد علی کا مقام[1]

محمد علی کی موت، آپ نے دیکھا، کہاں ہوئی؟ وطن سے ہزارہا میل دور، ہندوستان کے کسی گوشہ میں نہیں، حجاز میں نہیں، عراق میں نہیں، مشرق کے کسی حصہ میں نہیں، خاص سرزمین انگلستان پر، فرنگیوں کے دیس میں، اہل کفر کے درمیان، وطن سے دوری، اکثر عزیزوں سے مہجوری، غریب الوطنی! محمد علی کو تو اپنا وطن نہایت عزیز تھا اور اپنے وطن سے بھی بڑھ کر اپنے آقا کا وطن عزیز و محبوب تھا یہ کیا ہوا کہ موت ایسے دار الکفر میں واقع ہوئی؟ ——— لیکن یہ بھی آپ نے دیکھا کہ مرنے کے بعد جگہ کہاں ملی؟ وہ جگہ، جو ہمارے آپ کے تصور سے بھی بالاتر تھی، بیت المقدس! سلیمانؑ و داؤدؑ کا قبلہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ اور خود نبی القبلتینؐ کا پہلا قبلہ! صدہا انبیاء کا مقام بیشمار پیمبروں کی سجدہ گاہ!

موت ہوتی کہاں ہے اور جگہ ملتی کہاں! حدیث کو چھوڑیے جس میں یہ ذکر ہے کہ بیت المقدس کی مسجد میں ایک نماز کا ثواب، ہزاروں نمازوں کے برابر ہے، خود قرآن مجید کو دیکھیے وہ کیا کہتا ہے! مسجد کا نام مسجد الاقصیٰ، دور والی مسجد، کہاں سے دور؟ کس سے دور؟ برائیوں سے دور، گندگیوں سے دور، پلیدیوں سے دور! اَلَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ تنہا وہ مسجد ہی نہیں، اس کا آس پاس، اس کا پردوامن اس کا گرد و نواح، برکتوں والا، برکتوں اور رحمتوں کا گنجینہ، بھلائیوں اور پاکیزگیوں کا خزینہ! ہاں وہ مقام جہاں اس کو لایا گیا تھا، اور انتہائی عروج کے وقت لایا گیا تھا، جو سب سرداروں کا

---

[1] سچ (مرحوم) ۲۳ جنوری ۱۹۳۱ء

سردار، اور سارے پاکوں سے بڑھ کر پاک ہوا ہے، سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصیٰ، سبحان اللہ! کتنی زندگیاں اس موت پر نثار جس کے بعد یہ درجہ نصیب ہوا! "جسم" جہاں سے جہاں پہنچایا گیا، سب نے دیکھا "روح" کہاں پہنچائی گئی ہوگی، اس کا اندازہ کون کرے! جسے آدمی کاندھوں پر لاد کر لے گئے، اسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے ہوں گے، اس کا درجہ و مرتبہ کون پہچانے؟

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت

مرگے، کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند!

لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا ایک بڑا سیاسی لیڈر اٹھ گیا، اور یہ کہہ کر گویا ماتم کا آخری لفظ ختم کر دیتے ہیں! اللہ کے بندو، یہ مرتبے کہیں محض قومی لیڈروں کو حاصل ہوا کرتے ہیں، کہیں محض ایڈیٹروں، انشا پردازوں خطیبوں کے نصیب میں آیا کرتے ہیں؟ سچی بات کسی کے منہ سے نہیں نکلتی کہ محمدؐ کا دیوانہ اٹھ گیا! ہاں وہ محمد علی اٹھ گیا، جو محمدؐ کے دین کا شیدائی، محمدؐ کے رب کا پرستار، محمدؐ کی امت کا عاشق، محمدؐ کے نام کا دیوانہ تھا، وہ محمد علی جس نے اپنے کو محمدؐ میں فنا کر دیا تھا، محمدؐ کے غلام کے مرتبے بھی اونچے نہ کیے جائیں گے تو اور کس کے کیے جائیں گے؟

ضمیمہ (۳)

"اسلام کا دیوانہ"

[فاضل اجل، شیخ وقت، علامہ مناظر احسن گیلانی بہاری، شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ کی تقریر، جو مولانا کے جلسۂ تعزیت منعقدہ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء میں شہر حیدر آباد دکن میں کی گئی]

مولانا محمد علی مرحوم جن کو اب میں حضرت مولانا شاہ حاجی حافظ محمد علی شہید نور اللہ ضریحہ واشرق بنور وجہہ روحہ کہتا ہوں۔ کے متعلق لوگوں کا کچھ ہی خیال ہو لیکن ان کے ایک نا دیدہ مخلص کے سامنے ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوچے کے ایک مجذوب فقیر تھے۔ کل ساڑھے بجے حیدر آباد کے مسلمانوں کا ایک عظیم جلسہ رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے جمع ہوا تھا۔ میں بھی اس میں شریک ہوا تھا، جلسہ سے کچھ دیر پیشتر دماغ میں چند مصرعے موجزن ہو گئے۔ قلمبند کر لیا چونکہ تعزیتی تجویز کے پیش کرنے کی سعادت میرے سپرد ہوئی تھی، اس لیے کھڑا ہوا اور بول نہیں سکتا تھا لیکن بولنے پر مجبور رہا۔ حمد و نعت کے بعد وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا وسیجزی الله الشکرین وما کان لنفس ان تموت الا باذن الله کتابا مؤجلا، ومن یرد ثواب الدنیا نؤته منها ومن یرد ثواب الاخرة نؤته منها وسنجزی الشاکرین۔ پھر حدیث الاعمال بالنیات ولکل امرء ما نوی تحدیث۔ پڑھی اور کہنے لگا کہ اپنی بے زوری میں زور پہنچانے

کیلیے میں نے پناہ اسی تاریخی آیت کی لی ہو جس کے نیچے دنیا کے سب سے بڑے انسان سے جدا ہو جانے کے بعد
دنیا کی سب سے بہترین جماعت کو تسلی ملی تھی۔ دیکھو رامپور کی ایک بیوہ جو ایمان و اسلام کے گھرانے کا روشن
چراغ تھی۔ اور عزم و یقین کا پہاڑ، اس سے کہا گیا کہ اپنے بچوں کو اس اسلامی مدرسہ میں بھیج دے، جس کا
نام مدرسۃ العلوم مسلمانان تھا۔ نیک بخت ضعیفہ نے اسلام ہی کیلیے غالباً اس نیت سے اس نے اپنے بچوں کو وہاں
داخل کیا۔ لیکن معاملہ دوسرا ہوا، اس نے اسلام کے آغوش میں پرورش پانے کیلیے لڑکوں کو اس مدرسہ میں
بھیجا تھا لیکن انکو ایسی گود میں ڈالدیا جس کی ہر شکن اسلامی تحریک کے لیے خطرناک ضرب تھی۔ لڑکے بیوہ کے ہاتھ سے
نکل گئے۔ اس نے انکو دین سے نزدیک ہونے کیلیے بھیجا تھا لیکن وہ دور ہوتے گئے اور اتنے دور کہ بالآخر ان
میں جو چھوٹا تھا اس کیلیے یہ بعد بھی کافی نہ ہوا اور وہ آکسفورڈ کے بلند میناروں پر چڑھ گیا، جہاں سے اسکی ماں کا
روشن ایمان نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بڑی کامیابیاں، بڑی اولوالعزمیاں تھیں، جو اس غیر اسلامی فضا
میں اسکے اردگرد جمع ہو آئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد کا وہ تیسرا ہونہار طالب العلم شمار کیا گیا۔ کرزن رانلڈ ماش
کے بعد اسکی تصویر سے آکسفورڈ کے معلموں نے اپنی نمایشی کمرہ کو سجایا۔ وہ ہندوستان واپس ہوا یہ جذبہ لیکر کہ دولت
کے کسی ڈھیر میں اپنا حصہ مقرر کر لے، اور عمدہ موٹریں، دلکش بنگلے، قسم قسم کے کھانے، طرح طرح کے لباس سے اندرونی لذت
ہوتے ہوئے ہمچشموں میں اپنے کو نمایاں کر لے۔ چند دنوں کیلیے وہ اس وادی میں چلا گیا، لیکن بڈھی ماں کی پاک نیت
غیب میں جا کر جاذبۂ الٰہیہ کی صورت میں مبدل ہوئی مسٹر محمد علی (آکسن) پر پالٹیکس کا جنون سوار ہوا، بڑودہ سے
روانہ ہو دیکھا گیا کہ چڑھی ہوئی مونچھوں، زرق برق سوٹوں کے درمیان ایک عالیشان کوٹھی کے اندر ٹائپ رائٹر لیے ہوئے
اس مسلمان بڈھی بیوہ کا لڑکا ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشہ تک اپنی ادبی زور، انشائی قوت، سیاسی مہارت کا غلغلہ
بلند کر رہا ہے، نہ صرف ہندی انگریزی داں بلکہ خالص اینگلوسیکسن نسل کے افراد جنہیں اس عہد کا وہ شخص بھی شریک تھا جو برِاعظم ہند
کا گورنر جنرل اور برٹش ایمپائر کے تاجدار کا نائب السلطنت سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کی بیوی ہفتہ کے اس دن کو نہایت
اضطراب میں گزارتی تھی جس دن کامریڈ پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔ سب سے پہلی کمند تھی جو پھینکی گئی تاکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک بھاگے ہوئے

غلام کو اسکے آستانے تک پہنچا دیا جائے۔ دُسری جنبش دنیا کے اس "حادثۂ عظمیٰ" سے شروع ہوئی جس نے مختلف دوروں سے گذرتے ہوئے بالآخر مسئلہ "خلافت" کے مستقل عنوان سے شہرت حاصل کی۔ "خلافت" کا دامن اگر ایک طرف عالمگیر سیاست عالم سے بندھا ہوا تھا، لیکن بہر حال اس کا دوسرا کنارہ اس سراپردۂ نبوت سے وابستہ تھا، جس کے گوشے قبۂ خضرا کے کنارے لٹک رہے تھے۔ سچ یہ ہے کہ محمد علی نے خلافت کو سیاست سمجھ کر پکڑا لیکن خلافت نے مسٹر محمد علی (آکسن) کو اس نیت کے ساتھ پکڑا جو اس کی ضعیفہ ماں کی آخری آرزو تھی۔ کچھ دن گذرے کہ آکسفورڈ کا مشہور و معروف علی گڈھ کالج کا فخر و ناز گھسیٹا جا رہا تھا کھینچا جا رہا تھا، اور ان جھٹکوں کے ساتھ گھسیٹا جا رہا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگا، وہ کھینچا گھنچا، اتنا کھنچا کہ بالآخر اس کی نگاہوں سے وہ سارا تماشا نابود ہو گیا جو اب تک اس کے سامنے تھا۔ اب اس کے آگے کچھ نہ تھا اور اگر کچھ تھا تو وہ صرف جمال جہاں آرا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہ اس میں غرق ہوا، ڈوبا اور ایسا ڈوبا کہ پھر کبھی نہ ابھرا، عشق کی وادی میں سیاست کے میدان سے آیا تھا، نادانوں نے آخر وقت تک اس کو لیڈر، قائد، انگریزی زبان کا منشی، اردو کا خطیب و شاعر سمجھا۔ حالانکہ محمد علی تو جانباز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور یوں " انما الاعمال بالنیات " کی تفسیر پھر ایک بار ایسی ہستی کے ذریعہ سے کرائی گئی جس کی عظمت و جلال کا سکہ ایشیا پر بھی جما ہوا تھا اور جس کے رعب و قابلیت کی دھاک یورپ کے قلوب پر بیٹھی ہوئی تھی، جس کا ذکر افریقہ کے صحراؤں میں بھی عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا، اور جسے وہ بھی جانتے تھے جو نئی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ حدیث بخاری کے پہلے صفحہ میں پڑھو اور اس کی شرح ایشیا کی وسعتوں، یورپ کی کشادگیوں، امریکہ کی پہنائیوں، افریقہ کے طول و عرض پر مطالعہ کرو۔

محمد علی کسی غلطی تھی ان لوگوں کی جو تجھے آخر میں بھی وہی سمجھتے تھے جو تو اول میں تھا،

اور اس سے صبر و قرار کی توقع کرتے تھے، حالانکہ وہ صرف   تھا، اور اس سے حزم و احتیاط کی امیدیں باندھتے تھے، حالانکہ اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ اس سے مصلحت دوزی و عاقبت اندیشی کا انتظار کرتے تھے، حالانکہ وہ مصلحت سوز تھا۔ ہاں! کبھی وہ مسٹر محمد علی (آکسن) تھے، لیکن کیا اب وہ علوی شجاعت کے اندر غرق ہو کر صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فانی ہونے والا انسان نہ تھا۔ یقیناً اس نے کبھی شیکسپیر اور ملٹن کے اشعار یاد کیے تھے لیکن اب اس کی زبان پر قرآن مجید کی ربانی آیتوں کے سوا اور بھی کچھ تھا، کیا عجیب انجام ہوا اس شخص کا جو شیطانی راہوں پر سلوک کرنے کے لیے نیت کی نہیں بلکہ تجویز کی غلطی سے پڑ گیا لیکن جذب کی قوت نے راہ کفر کے اس سالک کو اسلام کے میدان کا مجذوب بنا دیا، وہ آکسن اور مسٹر بن کر جوان ہوا تھا لیکن حاجی، حافظ، مولانا بن کر شہید ہوگیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

مولانا عبد الماجد صاحب! میں نے کن مشکلوں سے ان فقروں کو ادا کیا اور کس طرح اس وقت لکھ رہا ہوں بس کیا عرض کروں۔ میں نے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں دیکھا تھا، لیکن میری روح ان کو دیکھ رہی ہے، خدا جانے کیا مناسبت تھی۔ آپ کا بار بار یہ جملہ یاد آتا ہے کہ "تجھ سے اور ان سے بڑی مناسبت ہے"۔ بہر حال میں نے اور خدا جانے کیا کہا، کیا بکا، اس کے بعد وہی چند مصرعے جو موزوں ہوئے تھے شکستہ حال میں چیخ چیخ کر سنانے لگا۔ اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، جو کچھ میں ان کو پا رہا ہوں، ان مصرعوں میں شاید اُن کی تصویر کسی نہ کسی طرح اتر گئی ہے۔

بدینِ مصطفٰے دیوانہ بودی	فدائے ملتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ ما ئیِ عشقبازاں	بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی

به دل بودی فقیرے بینوائے	به قالب پیکرِ شاهانه بودی
سیاست را نقابِ چهره کردی	وگرنه عاشقِ مستانه بودی
چه دانستی کجا سوزم نه سوزم	تو شمعِ دین را پروانه بودی
سیاست تهمتے بر عشق پاکت	ز آئینِ خرد بیگانه بودی
با یمانها ز تو زورے و شورے	بجانها همتِ مردانه بودی
رسیدی از ره اغیار تا یار	عجب مستے عجب دیوانه بودی

چه آمد بر سرِ رندان که آں را
خم و خمخانهٔ و پیمانه بودی

ضمیمہ (۴)

"دیباچۂ سیرت محمد علی"[1]

[سیرت محمد علی، مصنفہ مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی، شائع شدہ ۱۹۳۲ء پر دیباچہ مولف ڈائری کے قلم سے]

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کیے، اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سر فہرست کس کو بنایا جائے، اور کون ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانحِ حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جا سکتا ہے، اور وہ نام امت کے محبوب ترین ناموں "محمد" اور "علی" کا مجموعہ ہوگا۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علمائے دین پیدا کیے لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی و گرامی مشائخِ طریقت پیدا کیے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا، بعض مشہور رفارمر پیدا کیے، لیکن ان کی اور ان کے "رفارم" دونوں کی شہرت، انگریزی تعلیم یافتہ گروہ سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب زبان آور پیدا کیے، لیکن انھیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا، یہ چیدہ مشاہیر اور اکابر کا حال ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر نکلیں اور ان سے بھی تنگ تر دائروں میں

---

[1] نوشتہ ۱۹۳۲ء

گونج گونج کر رہیں، ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، شہر کے مہذبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی، اور جیلخانے کی تنگ و تاریک کوٹھریوں نے بھی، راجوں اور مہاراجوں کے قصر و ایوانوں نے بھی۔ اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اس کا کلام سن سن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور سوفے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسے۔ اس کا پیام سن سن کر مسجد کے محراب و منبر نے بلبلا بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں، مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر، ویرانے، "قوم پروروں" کی کانگریس، اور "ملت پروروں" کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیۃ العلما اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقشِ قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے، یہ قبول خداداد اور مرجعیت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت زور بازو کا نتیجہ نہیں۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے، بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا، لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا ہو گیا تھا، اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے۔ محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا تھا، وعدۂ ربانی کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل

سیجعل لھم الرحمٰن ودّا۔ (مریم - ع ۹)

کرتے رہے ہیں، خدا، رحمٰن ان کے لیے (خلق کے دل میں) محبت پیدا کردے گا۔

کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت و پوست میں مجسّم محمد علی کی زندگی میں نظر آئی!

اس دل و دماغ کا، ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کی خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے، جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی ——— وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ ——— دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی! ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی، آئی اور گئی۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر مسلمان! انھوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیر خدا علی مرتضیٰؓ کی؟ خلیفۂ رسول عثمان غنیؓ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسینؓ کی؟ جب اپنی شوربختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم و ماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام، محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور اسے خواہ مخواہ شوربختی ہی کیوں قرار دیجیے؟ صانعِ کامل کی مصلحتوں کی تھاہ، اور حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا؟ کم تھے جنھوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے۔

ادب و سیاست، خطابت و صحافت، قیادت اور انشا پردازی طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہو گیا تھا، مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا، مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراستِ ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا، اور

جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا۔[1]

بہ دینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی — فدائے ملتِ جانانہ بودی

بہ بزمِ یارمیں عشق بازاں — بہ بزمِ دشمناں فرزانہ بودی

بہ دل بودی فقیرے بے نوائے — بہ قالب پیکرِ شاہانہ بودی

سیاست را نقابِ چہرہ کردی — وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

سیاست تہمتے بر حسنِ پاکت — ز آئینِ خرد بیگانہ بودی

چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم — تو شمعِ دین را پروانہ بودی

بایماہا ز تو زورے و شورے — بجا نہا ہمتِ مردانہ بودی

رسیدی از رہ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھنچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے۔ محمد علی جو کچھ بھی رہے ہوں۔ علی گڑھ کے ایک مشہور کھلنڈرے، آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشاپرداز، ایک بہترین ایڈیٹر، شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد، اتھیلو وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں؟ آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہو گئی تھیں، اور جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لیے مشہور تھا، وہ اپنے ضبط و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا لیکن دل سے صدا اٹھی تو بس یہی کہ آج "محمدؐ" کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں وہ محمدؐ کا شیدائی، دینِ مصطفیٰ کا دیوانہ، امتِ محمدی کا بندہ اور اصول کا غلام تھا۔

---

[1] آگے فارسی کا کلام مولانا مناظر احسن گیلانی کا ہے۔

ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور اس کی چبھن محمد علی کے ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی، اسلام پر، قانون اسلام پر، شعائر اسلام پر کہیں کوئی حملہ ہوا اور تڑپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، خود مسلمانوں سے ہو محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! ۲۶ء میں حج اور شرکت موتمر اسلامیہ کے لیے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی، تو ہمدرد میں اپنے قلم سے خود لکھا "اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی"۔

دن رات، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ، آخری سفر پر جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، تو اس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے۔ حق تھا کہ ایسے شخص کی موت جب آئے تو سارا عالم اسلام شرق سے لے کر غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا، پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے، خود بعض انبیائے کرام تک نے کی! سلیمانؑ اور داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی الثقلینؐ کا پہلا قبلہ!

خاکِ قدس اور ابہ آغوش تمنا در گرفت

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت (اقبال)

جسم کو جو عروج نصیب ہوا وہ سب نے دیکھا "روح" کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے، اسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجہ و مرتبہ کو کون پہچانے!

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیرِ ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلۂ خلافت پر آزادانہ تقریر کرسکتا ہو، جو عین ہیجانِ مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ اظہار خیال کرسکتا ہو؟ جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے ساڑوا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کرکر کے انھیں قائل و معقول کرسکتا ہو۔ کمرڈ میں سیاستِ حاضرہ اور مذہب پر دس دس، بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشاء کے ساتھ سپرد قلم کرسکتا ہو۔ انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ ان ہی میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگولے، اور سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جائیں۔ محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آجائے۔ مسئلہ قتل مرتد پر جب فقہی استدلال و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے اہل علم عش عش کر اٹھیں۔ آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے۔ نماز کا پابند اتنا کہ برطانوی ایوان پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے۔ اور اس خالص فرنگستانی عمارت میں بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے۔ دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے۔ سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے۔ ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد و عقیدت سے سرفراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی عامۃ الورود ہستی کی سوانح مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے، اس پچیس تیس سال

کے اندر اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند، اور عالم اسلامی میں، جو بھی تحریک کسی بھی ادارے میں ہوئی، محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کار فرما، اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ سہی، اس میں موجود، ایسے شخص کی سیرۃ نگاری ایک شخص کی سیرت لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کیے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے، اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیں، اور وہ بھی فی الفور نہیں، ایک عرصہ تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کر دیتی، لیکن حالات مساعد نہ ہوئے تھے نہ ہوئے۔ تفصیلات کو چھوڑ دیے، ان اسباب کی شرح اگر کیجائے تو خود ایک مستقل رسالہ "شرح اسباب" تیار ہو جائے۔ جمود و افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر، جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر و نوخیز ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لیے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا جس کے سنبھالنے کے لیے کئی کئی قوی الجثہ اور تنومند پہلوان کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے۔ آفرین در حمت اس کی ہمت پر، آفرین و رحمت جامعہ کی مستعدی و کارگذاری پر، جامعہ، ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ ——— وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا۔

منازلِ سفر کی دوریوں، اور راہ کی دشواریوں، زاد سفر کی بے سروسامانیوں اور

یارانِ طریقت کی کج ادائیوں کی حکایت کیا، اور کس سے کیجئے؛ اور کیجئے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے، خود جوہرسی کے الفاظ ہیں

خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہرکیف وبہرحال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق وعقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں، یہ "لختِ دل" ہیں۔ ان پر "مالِ تجارت" کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرما لیا جائے۔

صاحب سیرۃ کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گذری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرۃ دیانت کے ساتھ لکھی جائے۔ اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے، "خالدؓ جانباز" کے وقائع اور کارنامے کوئی "حافظ شیراز" کی زبان میں آخر کیوں کر بیان کرے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جابجا صدمہ یقیناً پہنچے گا۔ اس کے لیے شروع سے تیار رہنا چاہیے، مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰؓ کے سیرۃ نگار کے لیے جنگ صفین اور حسین ابنؓ علی کے سوانح نویس کیلیے میدانِ کربلا کا ذکر زبانِ قلم پر نہ لانا کیونکر ممکن ہے؟
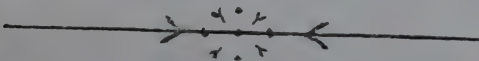
ضمیمہ (۵)

جوہر اور ان کی شاعری

[کلام جوہر (مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۵ء) پر مقدمہ، مؤلف ڈائری کے قلم سے]

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں، بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے، جن میں میرے ایک حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علیخاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے، گھر پہ بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پہ رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاراں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا اس لیے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پہ کہا تھا (ممکن ہو کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

لہ نوشتہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۵ء

داغ کی غزل یاد کیجیے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے، سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار رہا ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے، میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو اور فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا اب کسی کو یاد نہیں، ورنہ جب میری offical Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے یا سیرت بشیوا اے قوم ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنہ نے رجن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہوگیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار "چڑیا چڑ ونٹے" کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ "بھائی یہ تو چڑیا چڑ ونٹے کی کہانی اور مطلب بھی صاف

معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدردوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب دہی ہمارے سر پڑے۔" آپ نفسیات کے ماہر ہیں کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرت نگار باوجود نقاد سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے کہ گیارہ برس کی عمر میں علی گڈھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا، اٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے، اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔" مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی ہم نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے، انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرا باکمال نے

حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب اٹریبل (آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر)۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعد حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا جو چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا، ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں　　لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو "سبزہ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے۔ مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کبڑے بھاتے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ تشنج شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر سہی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور اور تغزل کا دور ہے۔ یہ اپنی تنگ آئی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی

بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے، چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ کر بھیجو۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں۔ (Touch stone) کی معشوقہ سے زیا قابلِ قدر نہیں۔ A poor Thing but mine own

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں........

(غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے عزیز ہیں کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی کے لیے ہیں"۔

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں کسی اخباری مضمون کا نہیں ایک خانگی مکتوب کا ہے۔ تاریخ اس پر ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۶ء کے شروع میں، اسی نظر بندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی، پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں۔ کسی والانامہ میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے۔ ذرا کچھ فرمایئے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا۔ آپ اوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ، اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کر کے، ٹھہر ٹھہر کر اور غور کر کے لکھے جاتے ہیں؟ ——— بیچارہ کو خیال تک نہ ہوگا کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر

اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی۔

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اول اول جانا تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علی گڈھ کے فدائی ہیں، قوم کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں، پرجوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے (یا کانگریسی اردو میں "چنے گئے")۔ لوٹ کر آئے۔ بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکلا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی۔ شیکسپیر کے فلاں ڈرامہ پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد نکالا۔ اب محمد علی ایڈیٹر تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر صحیح معنی میں لیڈر تھے۔ اب قوم ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی بے خودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علیؒ کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور بن نہ پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ترکی روانہ کر دیا۔ چندہ عثمانیوں کیلئے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آگیا۔ محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ——— اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے ساتھ مست تھے! ہاں مست الست!

ولایت گئے اور آئے، گرجے، چیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ

شروع ہو گئی، ——— خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ! آہ کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا ——— محمد علیؒ اب اپنے عالم میں کہاں تھے، قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منھ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے، نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں، اکھٹے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے، مظلوم کی زبان بنکر نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی کنکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظربند دعا بند نہیں ہیں ‏ ‏ اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں مہر ہی مہر، لیکن حقیقت مہر کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے، اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؎

عشقِ معشوقاں نہان است و ستیز ‏ ‏ عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر

محمد علیؒ اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے، سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظربندی تو نکلی رد سحر ‏ ‏ دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لیے نقد جان کا مطالبہ ہونا تھا ؎

مستحقِ دار کو حکمِ نظربندی ملا ‏ ‏ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسرے کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے، حصہ بقدر جثہ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سردار دیکھکر ۔۔۔ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے۔ یہ خاکسار عرض کرے گا کیا خوب اظہارِ حقیقت کر دیا ہے! اسی نظربندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا "ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی گھر گھر تبلیغِ اسلام کروں"!

نظربندی اور اس کے بعد جیل پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پیترے! ادھر ہندوستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع سنہ ۱۹۲۰ء تھا کہ محمد علیؒ دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں۔ وقت کی ضرورت ناگزیر کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہا لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی!

اذاں حرم میں کلیسا میں دیر میں ناقوس ۔۔۔ کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی بنا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڈھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء میں پکڑے گئے اور اگست سنہ ۲۳ء تک کچھ کم دو برس پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ سرکار والا تبار کے مہمان ——— اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت ۔۔۔ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن، مذہب سے عزیز تر، دنیا دین پر مقدم۔ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا! محمد علیؒ کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر! ——

وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لختِ جگر کے لیے یہ خبر سنکر کیسا کچھ پھڑپھڑایا ہوگا! دل پر کیا کچھ بیت کر رہی ہوگی! بیٹی سے عالمِ خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب بے حوصلہ والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو۔ وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا — جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ — اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مردہ دل کو جلا سکتا ہے، قرآن میں کیا — "تخرج الحی من المیت" مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اسے قبر میں بھی اتارا!

۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا ——
نہ پوچھیے کہ محمد علیؒ پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی خبر محمد علیؒ کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل وجگر سکڑ کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط ۲۴ء سے آغاز ۳۱ء تک زندہ ضرور رہے اور بہت سے زندوں سے بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے، سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔

۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد ۲۹ء میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا، ہمدرد نکالا مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریسی والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا، لیکن دل کی کلی جو الغائے خلافت سے مرجھا چکی تھی پھر نہ کھلنی تھی نہ کھلی۔ محمد علیؒ اب زندہ تھے کب؟ یوں کہیے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے وہ پورے کر رہے تھے! ——
اب وہ انسان نہ تھے۔ صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر دیکھنے میں لندن کا سفر تھا گول میز کانفرنس کے لیے، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"۔ مالک نے بندہ کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ ا رشعبان ۱۳۵۰ھ کی پندرہویں شب

میں عین اُس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! ——— شاید اس لیے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے! "آزادی" محمد علیؒ کے ملک کو کیا ملتی، محمد علیؒ کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں، قبلۂ اول ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل، اقبال نے کہا ذرا دیکھنا محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی محمد علیؒ جا کس راستہ سے رہا ہے ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر اس مدفن پر رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا دہلی یا کلکتہ یا بمبئی میں سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں تو آسانی سے نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے، اس کے لیے ضرورت نہ کسی تمہید کی۔ نہ دیباچہ کی نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجیے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی

طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہیے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو شاید راہ اور زیادہ سہولت اور خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علیؒ ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے۔ اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تیری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش
تھی رات یاس اور دلِ ناصبور تھا

میں تیرا گھر سمجھ کے سرِ راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دُور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں۔ انگریزی ۱۹۰۷ء ہے۔ علی گڈھ، محمد علی کے محبوب علی گڈھ میں لڑکوں نے انگریز استادوں کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے۔ کالج بند، خدایانِ کالج حیران و پریشان۔ بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں۔ مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں۔ اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے۔ اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری پیر پر مرتے لرزتے نہیں ناز کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں اپنے جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو | ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیرِ دعا میں شک ہے ہاتم کو | وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغولِ دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں | اور اس پر یہ تماشا کہ ہر طرف اور جا بجا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا | جو اسکی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو
تم ہی ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں | نمونہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علیؒ چھندواڑہ میں نظر بند ہیں، ایک بیک خبر پہنچی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علیؒ کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشا پرداز۔ کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سرِ شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسہ سے چلے آ رہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آ کر ٹکر دی اور یہ رونقِ صحافت و سیاست رخصت۔ محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نالہ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین | کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے | ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے | ابھی دو چار خم پیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی | کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ | ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے، شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی

اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح و ترمیم، بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے، یہی حال نثر کا ہے یہی حال نظم کا ہے۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظر بندی" کا تھا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت "نظر کشائی" کا قرار پایا۔ خوب خوب پتہ کی کہنے لگے ؎

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو　　ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اُسے　　اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنیے گا ؎

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے　　یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہیں جس کو خلق میں کہرام مچ گیا　　جو ہو وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد　　ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو　　باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

حنا کا قافیہ اس "طرح" میں آسانی سے آسکتا تھا لیکن ذرا دیکھئے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے　　میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل　　ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب　　بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہر حال ایک مسلم استاد تھے۔ جوہر ان کے مقابلے میں بلندی اور نو آموز محض

پھر بھی شعر کچھ ایسا بیٹا نہیں رہا ؂

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؂

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا ؂

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ کہنا تو محمد علی کی 'بی اماں' کا تھا۔ اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؂

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؑ کو خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے یا اپنی آٹو بیاگرفی (خود نوشت سوانح عمری) "آپ بیتی" قلم بند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے

کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لیے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے	ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعہ کو رکھا ع

ماتم یہ زمانہ میں بپا تیرے لیے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو۔ عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔ جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا۔ جوش سے یہ خود یہ قیدیِ گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی	منت لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلیے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا	تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا	ایک عرض اور بھی ہے اسی کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اسکے باب میں	کب ہو گی لا مکاں سے حفاظت مکین کی
تینوں حرم اسی کے ہیں جو ہے لا شریک لہ	نہ کیجیے درست بھی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رام پور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے بڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی کو یہ مستورں کی جلا وطنی بھگتنا پڑے جب قدر مظلوم بھی ٹھنڈی

سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے | ہم نہ تھے ان کے آستانے کے
ایک ایک کرکے سب تنکے | ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھیے اب یہ گردشِ تقدیر | کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھیے کیا ہو بود و باش کا حال | ہم ہیں باشندے جیلخانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجاپور کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں، سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا! راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درد خوانی پر آئی تو کچھ اتے پتے اس عالم کے بھی دیتی چلی گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں | اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے | ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے | ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت | اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں | بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہمنے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس قید پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانہ پر ہزار ہا آبادیاں! مشت خاک کا قضا راب عالم پاک میں تھا۔ لوہا جب تپ کر، دہک کر، لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جو ہر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کررہے تھے۔ ان کی شاعری الفاظ و حرف کی اب رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا دیوانہ جیسے ایک دوسرے دیوانے نے بلا کسی ظاہری تعارف و ملاقات کے خوب پہچانا اور خوب ہی کہہ ڈالا

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی | فدائے ملتِ جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی | دگر نہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشقِ پاکت | ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
رسیدی از رہِ اغیار تا یار | عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن)

زبان پر آئی ہوئی 'واہ' کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل سے نکلی ہوئی 'آہ' کی رسائی مالک کے عرش تک! رومی اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لیے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لیے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے، محاورات تبدیل ہو گئے۔ ترکیبیں نئی ہو گئیں، لیکن حی و قیوم کا نام جینے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جوہر نے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا۔ فنا کر دیا تھا۔ عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آ جائے!

ضمیمہ (نمبر ۶)

محمد علیؒ

مُبلّغ، مُفسِّر، مَناظِرؔ[1]

(۱)

"انگریزی ترجمۃ القرآن کے نسخوں کا پہنچنا میرے حق میں سرد و بہ مستاں یاد دہانیدن کا مضمون ہو گیا۔ جن کرم فرمانے یہ تحفہ عنایت کیا تھا، انھیں میں نے خط میں لکھا کہ" اس سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کون میرے لیے ہوگا کہ اس قید و بند سے رہائی پاتے ہی یورپ پہنچوں اور وہاں کے ہر شراب خانے سے نہ سہی تو کم از کم ہر ہر پارک، ہر ہر چوراہہ سے ان جنگ کے دیوانوں کو اُس دین کی تبلیغ کروں جو اسلام کی آشتی اور امن کے اندر قومی جنگ و جدل کے نعروں کو یکسر خاموش کر دیتا ہے۔ اسلام کی حکومت اس عصبیت و تنگ نظری کی دشمن ہے، جو قوم کو خلق کرتی رہتی ہے، اور انسان کا کام تمام کرتی رہتی ہے۔ ہمارا اللہ رب العٰلمین ہے۔ اس کے ہاں تفریق نہ عرب و عجم کی، نہ آریائی اور سیما طیقی نسلوں کی اور نہ اینگلو سیکسن اور ٹیوٹن قوموں کی" (ص ۱۲۱)

یہ الفاظ کس کے قلم سے نکل رہے ہیں؟ تبلیغ اسلام کی یہ تڑپ کس کے دل میں اٹھ

[1] یہ مضمون خلافت (بمبئی) کے محمد علی نمبر کیلئے لکھا گیا تھا، پھر صدق جلد اول نمبر ۳ دکم جون ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

رہی ہے؟ دعوتِ دین کے اس جوش و ولولہ سے کس کا سینہ شق ہوا جا رہا ہے؟——
کہیں مولوی محمد علی لاہوری نہ سمجھیے گا۔ یہ درد دل اس محمد علی کا ہے جو "کامریڈ" کا اڈیٹر
تھا اور ملک و ملت کا مشہور لیڈر، چھنڈواڑہ کا نظر بند، اور کراچی کا باغی، کانگریس کا صدر
اور احرار کا سردار، تحریک خلافت کی جان، اور تحریک ترک موالات کا روح رواں،
جسم اسیر فرنگ اور روح طوافِ کعبہ میں مشغول! ہاں وہی محمد علی، جو کبھی علیگ، اور آکسن تھا

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے!

"حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے" اور "معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے"
ان مصرعوں کو جی چاہے چھوڑتے جائیے۔ مگر کیا اس شعر پر بھی نہ رکیے گا؟

فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے!

شعر و قافیہ کی داد کا خیال بھی دل میں نہ لائیے۔ یہ اگر شاعری ہے تو آخر آپ بیتی کسے
کہا جائے گا؟

محمد علیؒ کو بے شمار انسانوں نے جانا، گنتی کے چند تھے جنھوں نے پہچانا۔ "تقریر" کی
گرج دلوں کو دہلا کر، ملک کے در و دیوار کو ہلا کر رہی۔ "تکبیر" کی بھنک بس خال ہی خال
کسی کے کان میں پڑی۔ بجلی کے لمپ کو جلتا اور چمکتا سب ہی دیکھتے ہیں۔ بجلی کا "کرنٹ" کس
خزانہ سے آتا ہے، اس کی خبر کسے ہوتی ہے؟ قوم کی لیڈری، سیاسیات کی رہبری، سب نے دیکھی
ان ساری سرفروشیوں، اور جانبازیوں کی تہ میں جو دین کی تڑپ تھی اس پر نظر بہت کم لوگوں

کی پڑی۔ ۱۹۱۴ء میں نظر بند ہوئے۔ مہرولی لینسڈاؤن ہوتے ہوئے، نومبر ۱۵ء میں چھنڈواڑہ پہنچے، اور نظر بندی کے کوئی چار برس یک لخت یہیں گزارے۔ قرآن مجید کی تلاوت، برکت اور ثواب کے خیال سے شروع سے کرتے چلے آئے تھے، معانی و مطالب کی سمجھ کے ساتھ اس کا مطالعہ زندگی میں پہلی بار اب شروع کیا، اسلام کی دردمندی پہلے سے موجود تھی۔ اب قرآن پاک نے اپنا اعجاز دکھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا دالہ وشیدا مست و دیوانہ بنالیا! ——— بارود اگر بچھی ہوئی ہو تو دیا سلائی دکھاتے ہی آگ پکڑ لینے میں دیر کیا لگے گی؟ ——— مسلمان محمد علی نے اب از سر نو اسلام قبول کیا۔ اب وہ مسلمان اس لیے نہیں تھا کہ مسلمان گھرانے میں پیدائش ہوئی تھی، اور باپ دادا کا مذہب اسلام چلا آتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی عقل نے اور تحقیق نے اس مذہب کو اختیار اور اسکے دل نے اور دماغ نے اس دین کو سب سے اچھا اور سب سے پکا اور سب سے ستھرا پایا۔

"نومسلم" کے جوش کا پوچھنا کیا۔ نومسلم محمد علی کی ذہنیت عام بشری ذہنیت سے انوکھی نہ تھی۔ بلا کا جوش تبلیغ پیدا ہوا۔ دل بے تاب کہ جو دولت اپنے کو نصیب ہوئی ہے، کھینچ کھینچ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر ایک عالم کو اس میں شریک کر لیا جائے۔ جلد سے جلد بھی اور زائد سے زائد بھی۔ اور طبیعت بے کل کہ دنیا جہان میں اللہ کا کوئی بندہ اس نعمت سے محروم نہ ہونے پائے،

لیکن سب سے بڑی دھن اس کی کہ کوئی اور آئے یا نہ آئے کم سے کم یورپ اور امریکہ تو ضرور ہی اسلام کی حلقہ بگوشی میں آجائیں۔ پانچ برس بعد ۱۹۲۳ء کے مئی جون میں جب بیجاپور جیل میں قید سخت کاٹ رہے تھے، اس وقت اسلام پر انگریزی زبان میں تصنیف کی سوجھی، نہ کتابوں کا کوئی بڑا ذخیرہ پاس، نہ بیٹھنے کے لیے کرسی اور میز، اور پھر ادھر دل کی

اور ہند کے قومی و ملی معاملات میں الجھا ہوا۔ ادھر ہوش، جوان بھتیجی لڑکی کے مرض الموت کی خبریں پاکر اڑے ہوئے۔ اس پر بھی ذوق و شوق نے اچھی خاصی ضخامت کا مسودہ تیار کرا دیا۔ ختم ہو جانے اور نظر ثانی کے بعد تو خدا جانے کیا کچھ اور کتنا کچھ ہو جاتا۔ موجودہ ناقص، ناتمام اور بالکل قلم برداشتہ ابتدائی مسودہ کی صورت میں وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں طوبار کاغذات کے اندر جو کچھ ملا وہ جامعہ ملیہ والوں کی ہمت سے ٹائپ ہو گیا ہے فلسکیپ کے ۲۶۳ صفحوں میں آیا ہے۔ اور اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خاکہ ذہن میں تھا مشکل سے اسکا نصف دائرہ تحریر میں آسکا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کتاب ایک طرح کی آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری (آٹو بیاگرفی) ہے۔ مضمون یہ ہے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا، آنکھ کھول کر اسلامی تعلیمات کے یہ یہ نشانات دیکھے۔ گھر میں یوں رسماً مذہبی تعلیم پائی۔ مکتب، اسکول، کالج میں مذہبی و روحانی حیثیت سے ماحول کی صورت یہ رہی۔ گرد و پیش بے دینی کے چلن یہ یہ دیکھے۔ جنگ بلقان، یورپ کی سیاسی بدیانتی کے ہولناک مظاہرے فلاں فلاں دیکھنے میں آئے۔ اور پھر جنگ عمومی نے یورپ کے روحانی واخلاقی افلاس کا پردہ بالکل ہی فاش کر دیا۔ حق گوئی نے نظر بند کر دیا ——

نظر بندی ۱۹۱۶ء - ۱۹۱۷ء کے زمانہ میں پہلی بار قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا موقع ملا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسلام کی حقیقت اب سمجھ میں آئی۔ عبدیت الٰہی اور خلافت فی الارض کے معنی اب روشن ہوئے۔ یورپ کے سارے درد کا درمان وحید اسلام ہی نظر آیا۔ اپنی ترقیوں پر مطمئن۔ نت نئے آلات کی ایجاد میں منہمک، سارا فرنگستان مہذب درندہ بنا ہوا۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا، اپنی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ ان غریبوں کو کیا خبر کہ دنیا کو

تسکین کی راہ دکھانے والا مذہب، اسلام کے نام سے موجود ہے۔ یہ بدنصیب تو اپنے مذہب کو مذہب سمجھے ہوئے ہیں۔ ان مروجہ مذاہب کی جو حقیقت ہے اس سے تو لامذہبی بھی کوئی ایسی بری چیز نہیں۔ گڑھی ہوئی انجیلیں، پولوس کی مشرکانہ تعلیمات، بھلا ایسے خرافات کے مجموعہ کو آسمانی مذہب حقانیت و روحانیت سے واسطہ کیا؟ ——— آگے خدا جانے کیا کیا ہوتا۔ ناتمام کتاب بس یہیں پہنچ کر تمام ہو جاتی ہے۔ کتاب کا نام "Islam or The Kingdom of God"

یعنی اسلام یا حکومت الٰہی ہے، اسم بامسمیٰ۔ اس لیے کہ تشریح کتاب بھر میں زمین پر نیابت الٰہی قائم کرنے اور دنیا کو عدل سے بھر دینے کی اور مرکزی نقطہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی تفسیر ہے۔ اسی کتاب کا جسے ابتک نہ کسی کمپوزیٹر نے کمپوز کیا، نہ کسی پریس نے چھاپا، نہ کسی دارالاشاعت نے شائع کیا، اقتباس شروع مضمون میں درج کیا گیا۔ محمد علی وہاں ذکر پانچ سال قبل ۱۹۱۸ء کی کیفیت کا کر رہے ہیں، لیکن کیفیت پانچ سال بعد ۱۹۲۳ء میں بھی جوں کی توں موجود ہے۔ (اور موجود تو ۱۹۳۱ء میں مرتے دم تک ہی)

ایک اقتباس آپ دیکھ چکے۔ اب دوسرا ملاحظہ ہو:۔

"اسٹریلیا یا افریقہ کے کسی وحشی کو جس نے اپنے وحشت زار سے زاید کچھ بھی نہ دیکھا ہو ذرا ایک بیک پکڑ کر کسی جہاز پر تو سوار کرا دیجئے اور وہ جہاز رکے آکر ساحل امریکہ پر جو آج دنیائے قدیم کے ہر متمدن سے متمدن خطہ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس وحشی کے لیے اس براعظم کا انکشاف کیا آج بھی ویسا ہی حیرت انگیز نہ ہوگا، جیسا کولمبس نے چار سو برس قبل کیا تھا؟ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس لیے کہ کولمبس کو تو خالی خولی ایک براعظم ہی ملا تھا اور اس وحشی سیاح کو اس کے ساتھ ساتھ ایک پورا تمدن بھی ملے گا۔ اسکی مسرت اور اسکی حیرت کا کیا کہنا؟ بس بھی

حال میرا بھی (قرآن پڑھ کر ہوا) مجھے بھی بیک وقت دوہری دوہری دولتیں نصیب ہوئیں۔ اللہ کو اور اللہ کے کلام کو تو سمجھا ہی، ساتھ ساتھ اپنی حقیقت بھی سمجھ میں آگئی"۔ (ص ۵۵)

لوگ کہتے ہیں کہ خود شناسی سے خدا شناسی تک پہنچو، یہاں الٹی خدا شناسی ہی خود شناسی کا بھی ذریعہ بن گئی۔ "من عرف نفسہ عرف ربہ" (جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو بھی پہچان لیا) مدت سے سنتے چلے آئے تھے، آج محمد علی کی زبان سے "من عرف ربہ عرف نفسہ" (جس نے اپنے رب کو پہچانا، اپنے آپ کو بھی پہچان لیا) بھی سن لیا!

نومسلم کے جوش تبلیغ کا اندازہ اسی نومسلم کی زبان سے کیجئے:-

"میں اپنی اس نئی دنیا کی دریافت کو کیا اپنے ہی تک سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا؟ نہیں، کہاں ممکن تھا؟ دوسرے معاملات میں میں کیسا ہی خود غرض سہی، اس حقیقت کبریٰ کا، اس حقیقت الحقائق کا انکشاف جس گھڑی میرے روبرو ہوا۔ میرا سارا وجود اس سے پر ہوگیا ہیں، اسے چھپانا چاہتا بھی، تو میرے سینے کے اندر اس کا چھپا رہنا کیونکر ممکن تھا؟ میری روح کا تو ریشہ ریشہ اس انکشاف سے پھٹنے لگا اور جی بے اختیار بیقرار ہو ہو کر یہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اور پکار پکار کر سب کو اس کی دعوت دینی شروع کر دوں ____ گھر کے بوڑھوں بچوں کو، نوکروں، چاکروں، کتے، بلی جانوروں کو، بیجان درختوں اور جھاڑیوں کو، سب کو یہی پیغام یہی بشارت (دیوانہ وار) پہنچانا شروع کر دوں"۔ (ص ۶۹)

کیا خبر تھی کہ حق کے اندر یہ بے پناہ قوت رکھ دی گئی ہے۔ مشہور فرنگی فاضل میکس مولر کا قول ہے کہ:

"حق کا نشہ ایمان والوں پر ایسا سوار رہتا ہے کہ جب تک وہ اپنے خیال میں قول اور عمل سے اس کا اظہار نہ کر ڈالیں۔ جب تک وہ اپنے پیام کی منادی روئے زمین کے چپہ چپہ پر نہ کر چکیں، ان کے دل کو چین اور قرار آہی نہیں سکتا۔"

محمد علیؒ اس مقولہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

"مدتیں گزریں جب میں نے اول اول اس عبارت کو پڑھا تھا، تو اس کے خطیبانہ انداز بیان کی خوب داد دی تھی۔ اب جب اپنے اوپر آ کر پڑی تو معلوم ہوا کہ حق و ایمان اندر ہی اندر جو عظیم الشان غیبی قوت پیدا کر دیتا ہے اس کے سامنے یہ عبارت خطیبانہ اور زور دار ہونا کیا معنی بالکل کمزور اور پھسپھسی سی ہے۔ مومن کا قلب تو ایک بم کا گولہ ہوتا ہے کہ اب پھٹا اور جب پھٹا۔" (ص ۹۶)

امتی کا ذہن یہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد معاً اپنے رسولؐ اور رسولوںؑ کے سردارؐ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے آقائے نامدارؐ کا بے پناہ جوش تبلیغ یاد پڑ جاتا ہے۔ وہ کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کو دعوت دینا، وہ ضیافت کے بعد اپنی برادری والوں کے سامنے اسلام کی روحانی ضیافت پیش کرنا۔ وہ سالہا سال مکہ میں اسی کے پیچھے ہر طرح کی سختی برداشت کرنا، وہ اپنے شہر والوں سے مایوس ہو کر طائف کا رخ کرنا اور وہاں کی آبادی کا انتہائی بیہودگی سے پیش آنا، لہولہان مکہ واپس تشریف لانا۔ پھر حج کے موقع پر مدینہ والوں سے آس لگانا، ناکام ادھر سے ادھر پھرنا، حاجیوں کے اس گروہ سے اٹھکر ابھی اس گروہ کے پاس جانا، ایک ایک کا دل ہاتھ میں لینا اور زبان کی موہنی، بہلانا، سمجھانا، پرچانا۔ غرض ایک اللہ کی منادی کے پیچھے خلق اللہ کی خفگی مول لینا، دنیا جہان کے جتن کر ڈالنا، یہ سارا سماں اس امتی کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اللہ اکبر اس رسولؐ کی ہمت،

استقلال کی، پامردی کی، ایثار کی، تحمل کی تھاہ کوئی بھی پا سکا ہے! اور پھر

"وہ حق ہی کیا جو اپنا مبلغ آپ ہی نہ ہو۔ "مشنری" اور "تنخواہ دار" کیا خوب! سچا "مشنری" (مبلغ) تو وہ ہے جو تبلیغ کی خاطر اپنی نقد جان تک حاضر کردے، چہ جائیکہ خدمات تبلیغ کا معاوضہ بصورت نقد وصول کرے۔" (ص ۹۸)

دل میں جذبۂ صادق موجود ہو تو میدان عمل کی تلاش کے لیے کیا کہیں باہر جانا ہے۔ موقع تو ہر جگہ موجود ہے۔ محمد علی نے تبلیغ بیتول جیل کی چہار دیواری کے اندر، یاران محبس کے درمیان ہی شروع کردی۔ ذرا یہ چھوٹی سی کہانی ان ہی کی زبانی سنتے چلیے:-

"توریت میں تو نہیں، البتہ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یوسفؑ نے توحید کا وعظ اور بہترین وعظ اپنے ساتھ کے دو قیدیوں کو سنانا شروع کردیا تھا، ان قیدیوں کو جو اب تک فرعون مصر کو اپنا خدا جانے اور مانے ہوئے تھے اور یوسفؑ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھ رہے تھے۔ میں نے بھی یہی وعظ جیل میں شروع کرکے اس سنت پیغمبری پر عمل کیا۔ اور میرا تجربہ تو ہندوستان کے اندر ایک سے زائد جیل سے متعلق بالفاظ شکسپیر یہ ہے کہ ہر شہر کے اندر خیر کا جلوہ ضرور ہوتا ہے۔" (ص ۱۸۱)

لیکن اصلی لگن یورپ جا کر اپنا پیام حق سنانے کی لگی ہوئی تھی، کچھ اس کا ذکر مضمون کے شروع ہی میں آپ سن چکے، کچھ اب سنیے:-

"ویلز (مشہور انگریز مصنف) کی یہ دونوں کتابیں پڑھ کر میں بے تاب ہوگیا کہ یورپ پہنچوں اور اسلام کا پیغام ان کافروں تک پہنچاؤں۔ جنھوں نے قوموں اور نسلوں اور حکومتوں کی پوجا کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ حالانکہ پرستش حق ہے صرف خدائے واحد کا۔

کٹی ہوئی اور ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی نہیں، بلکہ سارے عالم و مسلم کائنات انسانی کے پروردگار
عالم کا۔ بس ہماری طرف سے اس کی اطاعت ہو۔ اور اس کی طرف سے فضل و کرم"۔

"اس کے یہ معنی نہیں کہ تبلیغ کی ضرورت ہندوستان میں اور خود مسلمانوں کے اندر نہیں۔ یقیناً یہاں بھی بہت ضرورت ہو، اور خیرات کی طرح تبلیغ کو بھی اپنوں ہی سے شروع کرنا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے کیسے چشم پوشی کرلی جائے کہ بڑوں کا بگڑنا بہت ہی بڑی برائی ہو اور ایشیا و افریقہ کے مقابلہ میں اس وقت یورپ و امریکہ کی بڑائی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اپنی ساری ترقیوں کے ساتھ کاش یورپ و امریکہ اگر اپنے اندر وہ شے پیدا کرلیں، جس کے بغیر کوئی ترقی حقیقی ترقی کہی ہی نہیں جاسکتی۔ یعنی خدا دینداری تو یہ تو وہ کچھ کر سکتے ہیں جو ایشیا و افریقہ ابھی مدتوں کر سکنے کا دم نہیں رکھتے"۔ (ص ۱۲۶)

سنہ ۱۹۲۳ء میں پھر سنہ ۱۹۱۴ء کا ذکر:۔

"اگر مغرب کسی طرح ہمارے مذہب کا مطالعہ کرنے اور اس کے سمجھ لینے پر آمادہ ہو جاتا تو میں نے اس وقت خیال کیا کہ رنگ اور نسل کے پیدا کیے ہوئے سارے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور مغرب و مشرق دونوں بڑے نفع میں رہیں"۔ (ص ۱۳۴)

بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شفیق طبیب کو کہیں سے تریاق ہاتھ آگیا ہے اور وہ بیتاب ہے کہ کس طرح مار گزیدہ تک اڑ کر پہنچے اور اسے موت کے منہ سے جا کر نکال لائے۔

(۲)

قسمت میں نہ تھا۔ یورپ گئے، لندن اور پیرس دونوں جگہ خوب ہی تقریریں کیں لیکن حیثیت مبلغِ اسلام کی نہ تھی۔ رئیس وفد خلافت کی تھی۔ ان تفصیلات کی تلاش یہاں نہ کیجئے کہ کن مجبوریوں سے اور کیسے نازک حالات کے ماتحت قید سے چھوٹتے ہی کس طرح

یورپ روانہ ہو جانا پڑا۔ بہر حال ہوا یہی۔ ترکوں سے شرائط صلح درپیش، معاہدہ بالکل دستخط ہونے کو۔ ایسی حالت میں محمد علی اپنے دو تین رفیقوں کے ساتھ ہندوستان کی خلافت کمیٹی کی طرف سے یورپ پہنچتے ہیں، اور معاً ترکوں کی وکالت شروع کر دیتے ہیں۔ وفد سیاسی اور گفتگو کے مخاطبین آبادیاں اور قومیں نہیں بلکہ حکومتیں اور وزارتیں۔ تبلیغ اسلام اور مذاکرۂ دینی کا موقعہ تو ظاہر ہے کہاں نکل سکتا تھا۔ حسرت برسوں بعد تک رہی۔

"ہمارے وفد کی نوعیت بہت مقید ہو کر رہی۔ خطاب یہ تو نہیں کہ بجز حکومتوں کے...... اور کسی سے جائز نہ تھا، لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مخاطبت اصلی حکومتوں ہی سے تھی، تبلیغی آزادیاں اب کہاں باقی رہ سکتی تھیں" (ص ۱۴۷) —— اس پر بھی کیا محمد علی چوکنے والے تھے؟

"میری مذہبی دیوانگی دیکھ کر انگلستان میں متعدد دوستوں نے مشورہ دیا کہ مذہب کا نام بھی تقریروں میں زبان پر نہ لانا، لیکن اس مشورہ پر عمل بھلا کب ہو سکتا تھا؟ ہم بھی کیا کوئی ترکی قوم پرور تھے، جو اپنی قوم کی سرزمین کے لیے لڑ رہے تھے؟ ہم تو ترکی نہیں ہند کے رہنے والے تھے اور رعایا اس شاہ انگلستان کی جس سے ترکی برسر جنگ —— لیکن تھا کیا؟ تھا یہ کہ ہم مسلمان رعایا تھے، جنگی اطاعت مسیحی فرمانروا کے ساتھ مشروط۔ اس واضح اور صریح شرط کے ساتھ تھی کہ ہمارے جذبات دینی کا احترام کیا جائے گا۔ اور جذبۂ دینی ہی کا تو تقاضا تھا کہ ہم اس حکومت کی نصرت و تائید میں وفد لے کر آئے تھے جس کی بقا کا دامن خلافت عالم اسلامی سے وابستہ تھا۔ دول متحدہ نے جو ہماری سند نمایندگی تسلیم کی اور ہمیں کہنے سننے کا حقدار قرار دیا تو اسی بنیاد پر تو۔" (ص ۱۴۸) پھر آخر ترکوں

کے خلاف جو جس قدر تعصب پھیلا ہوا تھا اس کی آخری بنیاد کیا تھی ؟ وہی مذہب یعنی ترک چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے انھیں حاکم بنے رہنے کا کوئی حق ہی حاصل نہیں، کیونکہ خود اسلام کا تصور ان بدنصیبوں کے دلوں میں کیا تھا ؟ (نعوذ باللہ) مشرقی ظلم و استبداد، تقشف و تنگ نظری اور نفس پرستی کا مجموعہ، اور عقائد میں جابجا یہود اور مسیحیوں کی تعلیمات سے سرقہ ! معاذ اللہ جن لوگوں کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو چکی تھی، ان کے سامنے ترکوں کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے، جب تک یہ سارے پردے ایک ایک کر کے ہٹا نہ لیے جائیں —— محمد علی سے بڑھ کر ان نزاکتوں کو کون پہچان سکتا ؟ اور پہچاننے کے بعد کون ان سے بڑھ کر ان کی رعایت کرتا ؟ موقع بے موقع جب جب بس چل سکا، تقریریں، تحریریں، جہاں دیکھیے سیاسیات میں دینیات کا پیوند ! —— صورت پر جائیے تو ایک پُر شوکت تقریر، معنی کی جانب آئیے تو محض ایک نعرۂ تکبیر !

یورپ کی مشہور عالم گیر جنگ ابھی تازہ ہی ختم ہوئی تھی، محمد علی کی ہر تان اسی پر آکر ٹوٹتی تھی کہ یورپ ذرا اپنے کو دیکھے تو زخموں سے کیسا چور چور جسم ہے، گویا ایک مستقل گھرا ناسور ! ان سارے امراض کا مداوا اگر کہیں ہے تو صرف شفاخانۂ اسلام میں !

یورپ کی جان کا اصلی روگ اور تہذیب نو کا سب سے زبردست دیوتا "وطن" اور "قوم" ہے ع

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جس کو دیکھیے قوم اور وطن کے نعرہ میں سرشار، نسل و رنگ کے مرض میں گرفتار۔ تجارتی رقابت، معاشی کشمکش، قومی منافرت، بلوے، بغاوتیں، لوٹ کھسوٹ، کشت و خون، قتل و غارت، بم اور مشین گن،

ڈریڈناٹ اور تارپیڈو، تڑپتی ہوئی لاشیں اور خاک و خون میں لوٹتے ہوئے سر، لازمی نتائج!
ہولناک جنگ یورپ کے زمانہ اور قرب صلح کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :۔

"اب مجھے یہ آس بندھی کہ اِدھر صلح ہوئی اور اُدھر ٹھیک اسی گھڑی میں یورپ پہنچوں اور خوشامدیں کر کر کے ان کے دلوں میں اتاروں کہ اس دین پر ذرا تو غور کریں جو نسل و رنگ کی پیدا کی ہوئی دشمنی کے مٹانے میں ہر معیار سے ابتک کامیاب ہی ثابت ہوا ہے۔" (ص ۱۴۷)

"موجودہ مسیحیت نے خدا کے باپ ہونے پر اتنا زور دیا، لیکن انسان کے بھائی ہونے کا اسے خیال ہی نہ آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اتنی پیش گوئی تو کی ہی جا سکتی ہے کہ یورپ بعد جنگ بہرحال وہ نہ ہوگا جو یورپ قبل جنگ تھا۔ اور اس ہولناک جنگ کا بھوت اتر جانے بعد اُسے اس دین کی طرف بآسانی متوجہ کیا جا سکے گا۔ جس کی دعوت حکومتِ الٰہی نے دی ہے اور جس کی پکار یہ ہے کہ حکم و حکومت صرف خدائے واحد کی ہے۔ سب انسان یکساں اسی ایک بادشاہ کی رعایا ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ سوچ کے میں نے دل میں عہد کیا کہ جوں ہی جنگ ختم ہوئی اور ہم رہا ہوئے، میں یورپ اس جدید ترین شریعت کو لے کر پہنچوں گا جو ساتھ ہی قدیم ترین بھی ہے کہ خدا نے اسی کا مکلف انسانوں کو بنایا تھا۔" (ص ۱۳۷)

انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ زمین پر اپنے خالق کی طرف سے حکومت کرنے کو بھیجا گیا ہے۔ جس قانون کے مطابق اسے حکومت کرنا ہے، اُسی کا نام شریعت اسلامی ہے۔ روئے ارض پر عدل و امن کا اگر قیام منظور ہے تو بجز اسلام قبول کیے اور اسلام کے قانون پر عمل کیے چارۂ کار نہیں۔ یہی سبق ہے جو محمد علی دیتے ہیں۔ یہی سبق ہے جو اپنی اس کتاب میں جا بجا دیتے گئے ہیں۔ یہی سبق ہے جو رئیس وفد خلافت کی حیثیت سے جتنا بھی بن پڑا

محمد علی دے گئے۔

---

۲۴۱ اکراہ فی الدین کی متعدد تفسیریں نظر سے گزری ہونگی معروف و متداول تفسیر
تو یہ ہے کہ قبولِ اسلام پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے۔ مقصود اصلی غلبہ اسلام ہے، جو جزیہ کی صورت
میں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جب دین حق کا وضوح ہو چکا، اس کے
قبول کرانے کے لیے جو بھی طریقے استعمال کیے جائیں ان پر جبر و اکراہ کا اطلاق نہ ہوگا۔ وقس
علی ہٰذا۔ خلاصہ یہ کہ دین کے باب میں جبر نہیں۔ آج اس آیت کی تعبیر ایک اور سن لیجئے۔
"فی" کے معنی "اندر" کے بھی تو ہیں۔ اس لیے آیت سے یہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ "دین کے اندر آکر
کوئی جبر و اکراہ باقی نہیں رہ جاتا۔ جب حق کا کامل وضوح ایک بار ہو گیا جب عقیدہ
ایسے مالک پر جم گیا جو اپنے پرستاروں کی خبر گیری و دلدہی سے کسی آن غافل نہیں ہوتا
تو اب دین کا مطالبہ جو کچھ بھی ہو، فرمائش جس قسم کی بھی اطاعت و عبادت کی ہو مومن
کی طرف سے غفلت و تساہل ممکن کیونکر ہے۔ جبر و اکراہ کی گنجائش ہی اب کہاں باقی رہی!
بندۂ مومن تو ایسے محبوب آقا و پروردگار کی رضاجوئی کے لیے ہنسی خوشی دوڑ دوڑ کر اپنا سب کچھ
پیش کر دیگا، اپنے کو لٹا دیگا، اپنی جان تک نذر کر دیگا۔ جان ہے آخر کیا چیز؟ اسی کا عطیہ
اور اسی کی ملک، اس کی حکمت و مصلحت ہم سے جس وقت بھی اس کی واپسی کا تقاضا کرے
تو ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی کیا پس و پیش ہو سکتا ہے۔ اس دین کے اندر داخل ہو جانے
کے بعد سارا کاروبار تو رضاکارانہ رغبت و شوق اور والہانہ محبت و ذوق کا چلنے لگتا
ہے۔ جبر و زبردستی کا نشان ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے؟"
آیت کی یہ تفسیر ہو یا نہ ہو (اور زیر نظر کتاب کوئی تفسیر ہے بھی نہیں) لیکن کیا بطور ایک

لطیف صوفیانہ نکتہ کے بھی آپ اس کی داد نہ دیں گے؟ اور یہ تو محض ایک آیت نمونہ کے طور پر ہے جو نقل کر دی گئی، ورنہ اس طرح بیسیوں مضامین متعدد آیاتِ قرآنی سے استنباط و استخراج کیے ہوئے محمد علی کی کتاب اسلام میں درج ہیں۔

یورپ کے مبلغ اسلام کے لیے ایک ہی وقت میں جنگ کے تین تین محاذوں پر نظر رکھنی لازمی ہے۔ ایک طرف تو دہریت، مادیت اور الحاد کا زور ہے۔ قرآن مجید کو اس رنگ میں پیش کرنا ہے کہ ملحدوں اور لامذہبوں کے اعتراضات ازخود ساقط ہوتے جائیں۔ دوسری طرف مسیحیت کے پھندے بھی میدان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اور مسیحیت کو چونکہ عموماً حکومت کی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل ہے، اس لیے قدرۃً یہ فتنہ شدید تر ہے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ ساری حکومتیں خواہ برائے نام سہی، لیکن ہیں بہرحال ضابطہ سے اب تک مسیحی ہی۔ مبلغ اسلام جب یورپ کے علاقہ میں پیش قدمی کرے گا تو اس کو مذہب مسیحیت سے عظیم الشان مقابلہ کے لیے پوری طرح مسلح ہو جانا چاہیے۔ پھر مسیحیت بجائے خود کوئی مستقل مذہب نہیں۔ یہودیت ہی کی ایک شاخ ہے جس میں یونانی بت پرستوں کے شرک کی قلم لگی ہوئی ہے پس مسیحیت کے مقابلہ میں قدم اٹھانے والے کی نظر مسیحیت کے ان ماخذوں، یعنی مذہب یہود اور عقائد مشرکانہ یونان پر بھی خوب عمیق و وسیع رہنی چاہیے۔ ڈھائی پونے تین سو صفحہ کی کتاب میں (چھپنے پر ممکن ہے کہ صفحات کچھ بڑھ جائیں) بحمداللہ ان مباحث کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ خصوصاً مسیحیت پر تو ایسی زبردست تنقید کی ہے کہ جن لوگوں کی عمریں عیسائیوں سے مناظرہ اور گفتگو میں گزری ہیں وہ بھی اس کتاب سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں یا اصطلاح "Higher Criticism"

کی ہے۔ اردو میں اس کے مقابل کسی اصطلاح کا علم نہیں۔ لفظی معنی "تنقید اعلیٰ" کے ہیں۔ مراد اس سے یہود و نصاریٰ کی کتبِ مقدسہ کی تنقید ہے۔ یورپ میں یہ ایک باضابطہ اور مستقل فن بن چکا ہے (جیسے ہمارے ہاں فن اسماء الرجال) اور ستر اسّی سال کے اندر اس پر صدہا تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بائبل کی ایک ایک کتاب لے کر اس پر مفصل بحث ہوتی ہے کہ وہ کتاب کس زمانہ کی یا کن کن زمانوں کی تصنیف ہے؟ کس مصنف نے تنہا یا کن کن مصنفوں نے مل کر اسے تصنیف کیا ہے؟ جس شخص کی جانب منسوب ہے اس کی جانب انتساب کہاں تک صحیح ہے؟ جعلی و الحاقی عبارتیں کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں؟ وقس علیٰ ہذا۔ محمد علی کی سطر سطر سے ٹپکتا ہے کہ جیل کی فرصت کے زمانہ میں انھوں نے بائبل اور اس کی تنقیداتِ عالیہ کا خوب ہی مطالعہ کیا ہے اور اس سمندر میں گہرے غوطے لگا، خوب خوب موتی نکالے ہیں۔

صحابہ کرامؓ اور حواریانِ مسیحؑ کا تقابل، واقعۂ احد سے صحابۂ کرامؓ کی جان نثاری پر استدلال، حواریوں کے "اعمال نامے"، ان کے مقابلہ میں حضرات صحابۂ کرامؓ کے جیتے جاگتے معتبر و مستند واقعات، مسیحیت کی حقیقت، حضرت مسیحؑ کا اصلی مشن، مذہب یہود میں مشرکانہ خیالات کی آمیزش، فیلو (Philo) فلسفی کے اثر سے مسیحیت کا مسخ ہو کر پولوسیت بن جانا، پال (پولوس) کی سعی، مسیح کی مفصل پردہ دری، موجودہ مسیحیت میں شرکِ جلی کا امتزاج، اناجیل اربعہ خصوصاً انجیل یوحنا کی جعلی حیثیت، علوم نظری میں توغل کی ہجو، امام احمد بن حنبلؒ کی مدح و توصیف، امام پر سید امیر علی کی تعریض اور اس کا جواب، یہود کی مغضوبیت دورِ حاضرہ میں، سائنس اور مذہب کے حدود، ابتدائً ممانعتِ کتابتِ حدیث کے مصالح، تدریجی نزولِ قرآن کے مصالح (امت کے لیے، کفار کے لیے اور پیغمبرؐ کے لیے)

علم کلام کا بنیادی مسئلہ، مسیحیت پر یونانی فلسفہ کا اثر، مسیحیت پر ایران کے مذہب ثنویہ کا اثر، مسیحیت کی تاریخ، تحریف کتبِ سماوی سابقہ کا ثبوت، امیر علی اور سر سید نے اسلام پر دفاعی حیثیت سے جو کتابیں لکھی ہیں، ان پر محاکمہ۔ وغیرہ ان تمام عنوانات پر فاضلانہ تبصرہ دیکھنے کا اگر اشتیاق ہو تو اپنے اشتیاق کا عملی ثبوت بہم پہنچا کر جامعہ ملیہ سے کتاب شائع کرائیے۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک ایک مقام کی سیر اور کرتے چلیے:۔

"لیکن تفسیر و تعبیر کی اس ذاتی آزادی کے بعد جس کا میں پوری طرح قائل ہوں اور کسی آزادی کا قائل نہیں اور یہ معصیت تو میرے نزدیک اکبر الکبائر کا مرتبہ رکھتی ہے کہ کوئی بندۂ او بشر تفسیر و تعبیر کی آڑ پکڑ کر کلام الٰہی میں کچھ اپنی طرف سے بڑھا دے، یا گھٹا دے یا اسمیں کچھ اور رد و بدل کر دے! تنقید اعلیٰ نے خوب روشن کر دیا ہے کہ بائبل یعنی عہد قدیم و جدید دونوں کی کتنی کتابیں دوسروں کے نام سے لکھ دی گئی تھیں اور رفتہ رفتہ جو الحاقات ہوتے رہے ان کے لحاظ سے تو وہ کتابیں کیا ہیں گویا طبقات الارض کے مطابق مختلف ادوار کے اور وہ بھی تہ بہ تہ طبقے ہیں! اور ستم یہ کہ ان تمام تحریفات کے تسلیم ہو جانے کے بعد ہی یہ ماہرین فن اس تحریف پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں کرتے، بلکہ مجرموں کی طرف سے یہ صفائی پیش کرنے لگے ہیں کہ اخلاص، و صداقت کا معیار تو آخر ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف ہی رہا ہے بلکہ بعض نے تو کمال ہی کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ محرّف کی نیت تو نیک ہی ہوتی ہے! اور اس لیے وہ قابلِ الزام نہیں، بلکہ قابلِ عزت ہے۔ چنانچہ مسٹر جیڈ وک اپنی دی بائبل آف ٹو ڈے، میں لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں نے خود لکھ کر ان تصانیف کو اکابر (یعنی انبیاء و حواریین) کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ ان کے حق میں اتنا تو بہر حال کہا ہی جا سکتا ہے کہ انھیں

خود نمائی اور ذاتی شہرت مقصود نہیں تھی۔ اپنے کو انھوں نے مٹا دیا، اپنے کو گمنام و بے نشان کر دیا تاکہ کتب مقدسہ کی عظمت میں فرق نہ آنے پائے۔"

کیا خوب! اگر یہ استدلال صحیح ہے تو آخر اس میں کیا برائی ہے جو بت پرست قوموں میں بتوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہم پرست معتقدوں کے سوالات کے جوابات خود چھپے ہوئے بت کی زبان سے دیا کرتا ہے۔ گمنامی اور بے نشانی میں تو اس کی بھی مطلق شبہہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر دنیا میں جتنے بڑے بڑے جعلساز ہوئے ہیں، جنھوں نے مصنوعی سکے بنائے ہیں جعلی دستاویزیں تیار کی ہیں، جعلی نوٹ چلائے ہیں، یہ غریب کس خود نمائی اور ذاتی شہرت و نمود کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں؟ کیوں نہ اسی دلیل سے ان سب کو ہیرو قرار دے لیا جائے؟ افسوس ہے کہ خود بائبل کے اندر اس جعل و تلبیس کی سند جواز موجود ہے، ملاحظہ ہو پال کا مکتوب رومیوں کے نام باب ۳ آیت ۷۔

لیکن قرآن کریم کی تعلیم نے اس کے برعکس ایسے محرفین اور جعل سازوں کی شدید ملامت و مذمت کی ہے، فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ (البقرۃ ۹) اور حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا جعلساز اور کھوٹے سکے گھڑنے والا بھی اس مجرم کے جرم کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو بندہ اور بشر ہو کر اپنے کلام کو معاذ اللہ کلام الٰہی بنا کر پیش کر دے۔" (ص ۱۶۱-۱۶۲ ملخصاً)

کتاب مسودہ کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ مولانا کے شیدائیوں کی تعداد خدا کے فضل سے ہر طبقہ میں اچھی خاصی موجود ہے اور پھر یہ کام تو خالص دینی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے نصیب میں کتاب کے مراتب طبع و اشاعت کی تکمیل آ جائے۔[۱]

[۱] الحمد للہ! اس مقالہ کی تحریر کے چند سال بعد ۱۹۴۲ء میں کتاب ایک نئے نام My Life: A Fragment کے ساتھ محمد افضل اقبال ایم اے لاہوری کی مستعدی کے طفیل شیخ محمد اشرف تاجر کتب انگریزی لاہور کے ہاں سے ۲۷۳ صفحوں کی ضخامت سے شائع ہو گئی۔ ہندوستان میں مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی سے مل سکے گی۔ ۱۹۵۲ء

ضمیمہ نمبر (۷)

محمد علیؒ[1]

جواہر لال کے نقطۂ نظر سے

یا

"جوہر" میزانِ جواہر میں!

محمد علیؒ کو صدارت کانگرس (کوناڈا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء) کے بعد کانگرسی لیڈروں کے جو جو تلخ اور دردناک تجربات پیش آئے، خدا نہ کرے کسی اور کو پیش آئیں۔ لیکن اس کے باوجود گنتی کے جن دو چار لیڈروں سے وہ آخر تک خوش رہے یا یوں کہیے کہ زیادہ ناخوش نہیں ہوئے ان میں سے ایک جواہر لال نہرو بھی تھے۔ محمد علی جب صدر ہوئے تھے تو انھیں کانگرس کا جنرل سکریٹری مقرر کیا تھا۔ آج یہ خود صدر کانگرس ہیں، اور محض کانگرس ہی کے صدر نہیں کہنا چاہیے کہ ایک گاندھی جی کو مستثنیٰ کر کے ملک کے سب سے بڑے لیڈر بلکہ یہ ایک استثنا بھی کچھ زائد ہی سا ہے —— بہر حال آج ان کا نام بک رہا ہے، اور ان کے زبان اور قلم کا ایک ایک لفظ، یورپ میں بھی، اور ہند میں بھی جواہرات کا مول رکھتا ہے۔

ان کی تازہ آپ بیتی، یا خود نوشت سوانح عمری کو انگریزی میں نکلے ہوئے ابھی دن ہی

---

[1] صدق ۱۱ر جولائی ۱۹۳۶ء

گئے ہوئے، برسوں نہیں، مہینوں نہیں، کہنا چاہیے کہ ہفتوں کی بات ہے۔ اسی اپریل ہی میں تو پہلا ایڈیشن لنڈن میں نکلا۔ بس چھپنے کی دیر تھی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اسی مہینے کے اندر دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی، اور "آناً فاناً" وہ بھی ختم! —— اردو کے مصنفین اس داستان "طلسم ہوش ربا" پر کیسے یقین کریں؟ —— مئی کا مہینہ آنا تھا کہ نوبت تیسرے ایڈیشن کی آگئی! قیمت گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ اور بڑھی بھی تو کیسی، اضافہ پانچ فیصدی کا یا دس فیصدی کا نہیں، پچاس فیصدی سے زائد کا! (پہلے ہندوستان میں سات روپیہ کو آتی تھی، اب گیارہ روپیہ کو آنے لگی) انگریز پبلشر کیا کوئی ایسا نادان تھا کہ گھر میں سونا برسے اور وہ دوڑ دوڑ کر اسے سمیٹنے اور بٹورنے کی کوشش نہ کرے؟ —— ادھر دادِ فطرت کی اس ستم ظریفی کی دیکھیے کہ جواہر لال اٹھے تھے سوشلزم کی تبلیغ کو، سرمایہ داری کو مٹانے کو، اور بنے جا رہے ہیں دھڑا دھڑ رائلٹی سے خود بھی سرمایہ دار!

آپ بیتی کسی کی بھی ہو، بہر حال جی لگنے والی ہوتی ہے اور پھر یہ تو ایک مشاق صاحبِ قلم کے قلم سے ہے، دلکش کیوں نہ ہوتی؟ ضخامت چھ سو صفحے سے اوپر۔ اور وہ بھی اچھی بڑی تقطیع پر اور خاصی گنجان طباعت کے ساتھ۔ اس پر بھی آخر میں جی اکتا نہیں جاتا کہ اتنی طوالت کیوں کرتے چلے گئے، بلکہ کچھ جھنجلاہی کر رہتا ہے کہ ابھی کچھ اور لکھنا تھا، ختم کیوں کر دیا۔ مصنف کا نقطۂ نگاہ ظاہر ہے کہ کانگریسی اور "اشتراکی" ہے، اور اس نقطۂ نگاہ کو ظاہر ہے کہ آخر عمر کے محمد علیؒ سے ہمدردی ہو ہی کیا سکتی تھی۔ اور اس لیے محمد علی کے حالات و کمالات کی تلاش کے لیے کتاب کے اوراق کی الٹ پلٹ سودمند ہونے کی توقع ہی کب ہو سکتی تھی؟ پھر جواہر لال کی اس کتاب کے اقتباسات، دوسرے لیڈروں کے ساتھ محمد علی سے متعلق، ہندوؤں کے انگریزی اخبارات، اور پھر ان سے نقل ہو کر مسلمانوں کے اخبارات میں شائع بھی ہو چکے تھے ——

توقع اگر پہلے کچھ تھوڑی بہت تھی بھی، تو ان اقتباسات نے اسے زندہ کب رہنے دیا تھا؟

لیکن جواہر لال بہرحال جواہر لال ہیں اور ان کی سرگذشتِ حیات، ان کی شخصیت کی آئینہ بردار، ہند و نامہ نگاروں کی پستیوں سے بالاتر۔ ممکن نہ تھا کہ محمد علی اپنی زندگی میں، جواہر لال کی نگاہ میں کچھ اور ہوتے، اور وفات کے بعد جواہر لال کی کتاب میں کچھ اور ہو جاتے جواہر لال "دین" سے بے بہرہ سہی، "دیانت" سے تو ناآشنا نہیں۔ کسی کے وہ دشمن سہی، لیکن شریف دشمن۔ محمد علی ان کی اس بزم کاغذی میں، ایک دو بار نہیں، بار بار آتے ہیں۔ اور دو ایک ہی نہیں دیر تک، جواہر لال سے سابقہ اسی طرح رکھتے ہیں جس طرح واقعات کے عالم میں گوشت پوست کی دنیا میں رکھتے تھے۔ کبھی ہنستے ہیں، کبھی ڈانٹتے ہیں، کبھی محض مل ملا کر چلے جاتے ہیں۔ ہم آپ، اپنی اپنی محفلوں میں محمد علی کو بار بار دیکھ چکے ہیں۔ اب ذرا دیکھیے جواہر لال کی عینک سے وہ کیسے نظر آتے ہیں۔

محمد علی مسلمانوں کے لیڈر تو بہت مدت ہوئی ہو ہی چکے تھے۔ "آل انڈیا" لیڈر یعنی سارے ہندوستانیوں کے لیڈر کہنا چاہیے کہ تحریک خلافت کے وقت سے ہوئے۔ لیکن خود تحریکِ خلافت ہی کیا تھی؟ ایک دوسرا نام علی برادران کا، یا عام فہم و عام پسند لفظوں میں محمد علی شوکت علی کا! ۱۹۱۹ء ختم ہو رہا تھا۔ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں کہ علی برادران پہلی قید فرنگ سے چھوٹے، اور چھوٹتے ہی دھادا کرکے کانگرس کے اجلاس (امرتسر) میں پہنچے۔ آزادانہ کا نہ تھا۔ ملک کی تاریخ میں انقلاب کا، سیاسیات کی سرزمین پر ایک بھونچال کا آنا تھا۔ سات کروڑ مسلمانوں کی قوم کا مسلمہ مسلک اس وقت تک سرکار۔ وقت سے "وفاداری" کا تھا۔ مشیتِ الٰہی میں وقت آیا کہ سیلاب کا بند داب ٹوٹے اور پانی کا ریلا پورے زوروں کے ساتھ

آئے۔ محمد علیؒ کا پبلک تعارف جواہر لال سے اسی موقع پر ہوتا ہے:

"امرتسر کانگرس پہلی گاندھی کانگرس تھی.........علی برادران نظربندی سے ابھی ابھی رہا ہوئے تھے۔ معاً کانگرس میں آ شریک ہوئے۔ قومی تحریک میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی، ایک نئی روح دوڑ گئی۔ محمد علی چند ہی روز بعد، یورپ، وفد خلافت لے کر روانہ ہو گئے۔" (ص ۴۴ و ۴۵)

۱۹۳۰ء کے شروع میں، شاید مارچ کا مہینہ تھا، الٰہ آباد میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام سید رضا علی صاحب کی کوٹھی پر ہوا ——— یہ وہی سید رضا علی مراد آبادی ہیں، جو آج[۱] آنریبل اور سی، آئی، ای اور "سر" اور خدا جانے اور کیا کیا ہونے کے بعد افریقہ میں گورنر جنرل بہادر کے ایجنٹ ہیں، اس وقت الٰہ آباد میں وکیل اور زبردست "مسلم لیگیے" تھے ——— اتنا معرکۃ الآرا جلسہ اور محمد علی ہندوستان میں نہ موجود ہوں! شوکت علی غریب سے جو کچھ بن پڑا، کیا۔ لیکن محمد علی کی بات کوئی کہاں سے لاتا۔ جواہر لال اس 'خلا' کا صرف ذکر کر کے گزر جاتے ہیں۔ (ص ۴۶)

۱۹۲۱ء کا زمانہ بھی حکومت ہند کے لیے عجب پریشانی کا زمانہ تھا۔ اور پریشانی کیوں، سراسیمگی کہیے۔ وائسرائے بہادر سے لیکر ہر ہر ضلع کے بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے۔ بچوں کی سیٹی پر دشمن کے بگل کا گمان، بوڑھوں کی کھنکار پر "کانگرس کی جے" کا اشتباہ! اتفاق کی بات کہ ۱۰ مئی کو موتی لال جی کی صاحبزادی کی شادی کی تاریخ قرار پائی۔ کسی نے اڑا دی کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور و معروف ہنگامہ (غدر) بھی اسی تاریخ کو تو میرٹھ سے شروع ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ صاحب بہادروں کی جیبوں میں پستول، بڑے بڑے

---

[۱] یعنی وسط ۱۹۳۶ء میں

پرانے خیر خواہ، اور بیرے، خانساماں، سب مشتبہ۔ قلعہ میں تیاریاں کہ شاید شہر کی گوری آبادی کو پناہ یہیں لینی پڑے۔ پولیس، فوج سب الیس۔

یہ طول طویل داستان تو چھوڑیے مضمون سے اس کا تعلق بس اس قدر ہے کہ جشن شادی کی اس "وحشت ناک" تاریخ میں مدعو گاندھی جی کے ساتھ محمد علی شوکت علی بھی تھے (اضافہ)

وہشت، صرف گورنمنٹ ہی پر طاری نہ تھی۔ اس میں مبتلا خود جواہر لال جی بھی تھے۔ اُدھر ڈر یہ سمایا ہوا کہ یہ قانونِ سرکار کی خلاف ورزی اور توہین کس بے جگری سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ادھر دھڑکا یہ لگا ہوا کہ یہ تحریک خلافت کی روز افزوں ترقی کے ساتھ جذبۂ مذہبیت کو بھی ترقی کیسی ہوتی جا رہی ہے! بیرسٹر تصدق شروانی کے چہرے پر داڑھی! بیرسٹر مجید خواجہ کے چہرے پر داڑھی! اور سب سے بڑھ کر خوفناک وجود علی برادران کا!

"علی برادران خود ہی مذہبی خیال کے تھے، وہ اور اس آگ کو ہوا دیتے رہے" (اضافہ ۲)

سال کی آخری سہ ماہی تھی کہ کراچی کا مشہور مقدمہ چلا، اور علی برادران کو دو دو سال کی سزائیں ملیں۔ ہند جدید کا یہ روزنامچہ اس اندراج سے خالی رہ نہیں سکتا تھا۔

"علی برادران کو طویل سزائیں اس جرم میں ملیں کہ انھوں نے فوج میں بغاوت پھیلانی چاہی۔ جن الفاظ کی بنا پر ان پر مقدمہ چلا، ہندوستان کے سیکڑوں جلسوں میں ہزارہا اشخاص نے ان ہی کو دوہرایا۔" (ص ۷۸)

آج کے ہز مجسٹی ایڈورڈ ہشتم[۱] ۲۱ء و ۲۲ء میں شہزادۂ ویلز تھے، اور ہندوستان کے دورہ کو تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ کی بے بسی حد کمال کو پہنچ چکی تھی: فکر اس کی ہوئی کہ "باغیوں" سے کچھ تو صلح کی طرح ڈالی جائے۔ ایسا ہوا کہ

---

[۱] جو مناً بعد تخت و تاج سے دست بردار ہو کر ڈیوک آف ونڈسر رہ گئے۔

شہزادہ کے ورود کلکتہ کے وقت ساری نیکنامی، بدنامی میں تبدیل ہو کر رہے۔ خیال آیا، اور سلسلۂ جذبانی شروع ہوئی۔ مشہور لیڈر سی، آر، داس جیل میں تھے۔ نظران ہی پر پڑ گئی کہ گاندھی جی کو ہموار اگر کوئی کر سکتا ہے، تو وہی ہیں۔ رائے یہ قرار پائی کہ ایک مختصر سی کانفرنس، حکومت اور کانگرس کے درمیان ہو۔ اب سوال یہ پیش ہوا کہ اس میں شریک کون کون ہو؟ گاندھی جی نے کہا کہ اسیر کراچی، محمد علی کی شرکت تو بہر حال ضروری ہے۔ جواب ملا کہ یہ تو بہر حال ناممکن ہے۔ اور لیجیے، اسی پر معاملہ ختم!

"تجویز غالباً اس لیے گر گئی کہ گاندھی جی کا اصرار تھا کہ مولانا محمد علی، جو اس وقت کراچی جیل میں تھے، ضرور اس کانفرنس میں شریک ہوں، گورنمنٹ اسے نہ مانا۔" (ص ۸۴)

خود جوہر کا ایک شعر ہے ؎

ہیں یوں تو فدا ابرسیہ پر سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

گورنمنٹ کی اس ضد کے عالم آشکارا ہو جانے کے بعد کہ صلح کی گفتگو داس سے ہو سکتی ہے، گاندھی جی سے ہو سکتی ہے لیکن نہیں ہو سکتی تو ایک محمد علی سے، جوہر کی نظم اور جواہر کی نثر میں کس غضب کا توارد ہو کر رہتا ہے!

سنہ ۲۱ئہ میں ہندوستان کے جیل خانوں کی بارکیں جو سیاسی لیڈروں سے دھڑا دھڑ بھرنی شروع ہوئیں، تو اکثر لیڈروں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ لیکن محمد علی اس باب میں آزمودہ کار تھے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں، سنہ ۱۴ئہ میں، مولانا ابوالکلام کی طرح، طویل نظربندی اور جیل سے مشرف ہو چکے تھے (ص ۹۰) یاد ان کی ہر موقع پر آتی ہے، خاص طور پر وہ اس یاد آئے، جب خود کانگرس والوں کے سامنے کونسل کے قطعی مقاطعہ کا فرمان نافذ ہوا،

تو ایک نہیں کئی آوازیں اس رائے کی مخالف تھیں۔ ان لوگوں کے سامنے آئرلینڈ کی "سن فین" تحریک کی مثال تھی یعنی کونسلوں پر قبضہ تو کر لیا جائے، لیکن ان میں جا کر کام نہ کیا جائے۔ جواہر لال کی بھی یہی رائے تھی :۔

"محمد علی اس وقت بسلسلۂ وفد خلافت، یورپ میں تھے، جب واپس آئے تو کامل مقاطعہ کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا۔ وہ اسی "سن فین" طریقہ کو پسند کرنے والے تھے۔" (ص ۹۹)

تذکرۂ جواہر اس طرح ضمناً و تبعاً تو اس جواہر نامہ میں بہت جگہ آ گیا، مفصل اور مستقل تذکرہ اس موقع پر ہے، جب محمد علی کانگرس کے صدر ہیں، اور جواہر لال کانگرس کے سکریٹری۔ اتفاق و اختلاف، قرب و بعد کے منظر تفصیل سے یہیں دیکھنے میں آتے ہیں :۔

"۲۳ء کا دسمبر تھا کہ کانگرس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا (علاقۂ مدراس) میں منعقد ہوا۔ صدر مولانا محمد علی تھے اور اپنے حسب معمول خطبۂ صدارت بڑا ہی لمبا چوڑا پڑھا۔ لیکن اس طوالت کے باوجود تھا وہ دلچسپ ہی۔ مسلمانوں کا سیاسی اور فرقہ وارانہ نظارہ دکھا کر بتایا یہ تھا کہ وائسرائے کے پاس ۱۹۰۸ء میں جو مسلمانوں کا وفد سر آغا خاں کی قیادت میں گیا تھا، اور جس کے مطالبہ پر انتخاب جداگانہ کا سرکاری اعلان ہوا، وہ وفد خود سرکار ہی کی طلب پر مرتب ہوا تھا، اور سوال و جواب سرکاری ہی تھے۔

میں انکار کرتا رہا لیکن محمد علی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان کے زمانۂ صدارت بھر کے لیے، کانگرس کا جنرل سکریٹری ہو جاؤں۔ آئندہ کی روش جب تک صفائی سے پیش نظر نہ ہو، میں عہدہ قبول کرنے سے گریز کر رہا تھا لیکن محمد علی کے اصرار پر

غالب نہیں آسکتا تھا۔ اور یہ اپنی جگہ پر ہم دونوں کو محسوس ہو گیا تھا کہ میرے
سوا کوئی اور سکریٹری، صدر صاحب کے ساتھ پوری طرح نباہ کر بھی نہیں سکتا۔
محمد علی کی محبت بھی غضب کی تھی، اور غصہ بھی غضب کا۔ اور میری خوش قسمتی تھی
کہ میرا شمار محمد علی کے محبوبوں میں تھا۔ محبت باہمی اور ہم خیالی کا رشتہ ہم دونوں کو
جوڑے ہوئے تھا۔ ان کی مذہبیت بے پناہ تھی، اور میرے خیال میں حدود عقل و علم
سے متجاوز۔ اور میں مذہب سے کورا۔ لیکن میری کشش کی چیز تھی ان کی اخلاص مندی
ان کی زبردست قوت عمل، اور ان کی طباعی و ذہانت۔ وہ بڑے ظریف تھے،
لیکن ان کے چبھتے ہوئے فقرے دلآزاری کی حد تک پہنچ جاتے تھے، اور ان کے
کتنے دوست ان سے اسی سے روٹھ روٹھ گئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی فقرہ انھیں
سوجھ جائے اور زبان تک آئے بغیر دل ہی میں رہ جائے، پھر نتیجے جو کچھ بھی ہوں
ہوا کریں۔" (ص ۱۱۷)

محمد علی کی جو صورت ہماری آپ کی جانی پہچانی ہوئی تھی، اس سے یہ تصویر کچھ ایسی بہت
مختلف تو نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مصور جہاں کیمرا لیے کھڑا ہے، اس کی دھوپ چھاؤں
کا کچھ اثر تو تصویر کے رنگ پر بہرحال پڑے گا۔

"پورے سال بھر نباہ خوب ہوتا رہا، گو چھوٹے چھوٹے اختلافات بھی بہت
پیش آتے رہے۔ میں نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں آتے ہی یہ قاعدہ چلایا کہ سب
ممبروں کو صرف سادہ نام ہی لکھا جائے۔ باقی تعظیمی القاب الفاظ ہی کر دیے جائیں ہندوستان
میں یہ القاب ہی بھی کیسے بے گنتی۔ مہاتما اور مولانا، اور پنڈت اور شیخ اور سید اور منشی
اور مولوی اور ان پر تازہ اضافہ، شریمت اور شری کا! اور انگریزی کے مسٹر اور اسکوائر

تو موجود ہی تھے۔ اور پھر ان کا استعمال اس قدر اسراف کے ساتھ اور اس قدر کثرت کے ساتھ تھا کہ میں نے چاہا کہ ایک سنہ قائم کر دوں۔ لیکن میری چلنے نہ پائی۔ محمد علی نے واسطے دلا دلا کر، تار پہ بحیثیت صدر مجھے حکم دیا کہ ابھی پرانا دستور قائم رکھا جائے، اور خصوصاً گاندھی جی کو تو ضرور مہاتما رہنے دیا جائے۔" (ص ۱۱۷)

اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ محمد علی کو حفظ مراتب کس درجہ عزیز تھا۔ لیکن خیر، یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ اہمیت کی اصل شے اب ملاحظہ ہو:-

"جس موضوع پر ہمارے آپس میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی، وہ خدا تھا۔ محمد علی کو عجیب و غریب ملکہ حاصل تھا کہ خدا کا ذکر وہ کانگریس کے رزولیوشنوں تک میں لے آتے تھے! کہیں یہ کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے، کہیں یہ کہ خدا سے دعا کی جائے! میں ہمیشہ مخالفت کرتا۔ اور اس وقت محمد علی میرے الحاد پر برس پڑتے! لیکن یہ بات بھی عجیب تھی کہ اس کے بعد وہ مجھ سے یہ کہا کرتے کہ زبان سے تم کچھ بھی کہو، یا ظاہری عمل سے جو کچھ بھی دکھاؤ، اپنے باطن میں تم مذہبی شخص ہو ضرور۔ میں نے خود بارہا غور کیا کہ ان کا یہ مقولہ کہاں تک صحیح تھا۔ لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں مذہب اور مذہبی کے معنی ہی بہت کچھ مختلف ہیں۔"

محمد علی کے جوش مذہبی کے نظارے ہم آپ تو بہت سے دیکھ چکے ہیں، لیکن جواہر لال کی یہ شہادت، خود منکر اور بیگانۂ دین ہو کر، کسی دوسری شہادت سے کچھ کم وزن رکھتی ہے؟ عجب نہیں کہ حشر میں بھی ایک دستاویز محمد علی کے حق میں، اور سیکڑوں ہزاروں تحریروں سے بڑھ کر قیمتی نکل آئے، اور عقل و فرزانگی کی اسی ایک شہادت کے گزر جانے کے بعد پھر محمد علی کی دیوانگی و شوریدگی کے لیے کسی اور بیان کی، کسی اور دلیل و برہان کی

ضرورت ہی نہ باقی رہ جائے!

"میں محمد علی سے مذہبی بحث و مباحثہ کرنے کو ٹال ہی جاتا تھا، اس لیے کہ میں خوب سمجھتا تھا کہ اس سے فریقین کو بس غصہ ہی آ کر رہے گا، اور ممکن ہے انھیں میری کسی بات سے دکھ پہنچ جائے۔ مذہب کوئی سا بھی ہو، اس کے پختہ پیرووں سے مذہب کے موضوع پر گفتگو کرنا ہے نازک۔ اور مسلمانوں سے مخاطبت میں تو یہ نزاکت اور بڑھ جاتی ہے، اسلیے کہ انھیں تو دائرہ سے باہر ہونے کی اجازت ہوتی نہیں، عقائد کے لحاظ سے ان کا سیدھا راستہ تو ایک ہی ہے جو تنگ بھی ہے۔ اور مومن کو داہنے بائیں کسی طرف ذرا بھی ہٹنے کی اجازت نہیں۔ ہندوؤں کی حالت اس سے ذرا مختلف ہو گو ہمیشہ یہاں بھی نہیں"

جواہر لال جی نے ابھی ایک ہلکی سی چوٹ محمد علی کی طوالت پسندی پر کی تھی لیکن یہ مذہب اور لامذہبی اور ہندو ذہنیت پر ایک بھلا چنگا تبصرہ خود ہی کر ڈالا، جسے ہمارے موضوع سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اب اس کے بعد سنیے:۔

"تو اس لیے میرے اور محمد علی کے درمیان مذہبی گفتگو نہیں آنے پاتی تھی۔ لیکن بھلا وہ چپ رہنے والے کب تھے۔ کچھ ہی روز بعد (یہ شاید ۱۹۲۵ء ہو یا شروع ۱۹۲۶ء) ان کے لیے ضبط کرنا ناممکن ہو گیا۔ ایک دن وہ ابل ہی تو پڑے۔ دلی میں ان کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا، کہ انھوں نے گھیر گھار کر مذہب کے موضوع پر مجھے لانا چاہا۔ میں نے ٹالنا چاہا اور عرض کیا کہ ہمارے نقطۂ خیال اتنے مختلف ہیں، اور ایک دوسرے کو قائل کرنا مشکل ہی ہے۔ لیکن وہ بھلا کب ٹالے بالے میں آنے والے تھے۔ بولے "صاف صاف کہہ ڈالو۔ تمھارے خیال میں میں مذہب کے معاملہ میں کچھ دیوانہ سا ہوں، تو آج اسی کو خوب اچھی طرح صاف کر لو"۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ "میں نے مذہب کا مطالعہ کیا ہے"

اور مطالعہ بھی عمیق و وسیع۔ ادھر دیکھو۔ وہ سامنے الماریاں جو کتابوں سے بھری ہیں وہ مذہب ہی سے متعلق ہیں، خصوصاً اسلام اور مسیحیت سے متعلق اور ان میں جدید ترین کتابیں بھی ہیں، مثلاً ویلز کی God. The Invisible King۔ پھر دوران جنگ میں طویل نظربندی کی جو مہلت ملی، یہ وقت میں نے قرآن مجید کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اور تفسیریں اور ترجمے دیکھے۔ اور اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں ۹۷ فیصدی تو ایسی ہیں جو بالکل عقل میں آجاتی ہیں۔ اب رہیں ۳ فیصدی عقل بشری کی سرحد ماوراء امور سے متعلق ہیں، سو ظاہر ہے کہ جس کی ۹۷ فیصدی باتیں بالکل دلنشین ہو گئیں، اس کی بقیہ ۳ فی صدی پر ایمان لانے سے کون سا امر مانع ہو سکتا ہے؟"

یہ استدلال تو کچھ ایسا قوی نہ تھا، لیکن بحث و مباحثہ سے بہر حال میں بچنا چاہتا تھا۔ میرے لیے حیرت کی چیز وہ نہیں، جو میں نے اب تک کہی، بلکہ وہ ہے جو اب کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس کے بعد محمد علی نے کہا کہ "قرآن جو کوئی بھی انصاف اور بے تعصبی سے پڑھے گا وہ اس پر ایمان لے آئے گا۔ اور یہ میرے علم میں ہے کہ گاندھی جی اسے خوب پڑھ چکے ہیں، اس لیے دل ہی دل میں اسلام کی صداقت کے تو لامحالہ قائل ہو گئے ہوں گے۔ کبر نفس کی بنا پر اس کا اعلان نہ کریں تو اور بات ہے۔" (ص ۱۱۸ - ۱۱۹)

جواہر لال کا قلم جزئیات میں یقیناً کہیں کہیں بہک گیا ہے لیکن کلی اور اصولی حیثیت سے محمد علی کی ذہنیت کا جو نقشہ دکھا دیا ہے، وہ بالکل نقل مطابق اصل ہے۔

دنیا میں، کون بجز محمد علی کے ایسا سر پھرا تھا کہ دوسروں سے اس طرح لپٹ لپٹ کر تبلیغ کیے جاتا! مخاطب ہیں کہ سننے سے جی چرا رہے ہیں، پہلو بدل رہے ہیں، اور وہ ہیں کہ اپنی دھن

میں مست، سناتے چلے جاتے ہیں! ـــــــ دنیا ایسوں کو خرد باختہ و دیوانہ نہیں تو اور کیا کہیں عاقل و فرزانہ کہے گی؟

اس کے بعد تذکرہ کا رخ خالص سیاسی ہے۔

"سال صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگرس سے ہٹتے گئے، یا ان ہی کی زبان کے تتبع میں، کانگرس ان سے ہٹتی گئی۔ رفتار اختلاف بہت ہی تدریجی رہی، یعنی اس مدت میں، یعنی کئی سال تک محمد علی کانگرس میں، اور آل انڈیا کانگرس کے جلسوں میں نہ صرف برابر شریک ہوتے رہے، بلکہ سرگرم حصہ بھی لیتے رہے۔ لیکن دوری اور بیگانگی بہرصورت بڑھتی ہی گئی۔ اس صورت حال کی ذمہ داری فلاں فرد یا فلاں فلاں افراد پر ڈالنی تو شاید صحیح نہ ہو۔ اس لیے کہ واقعات ملک کی رفتار ہی نے اس نتیجہ کو ناگریز بنا رکھا تھا۔ تاہم یہ نتیجہ افسوس ناک ضرور تھا جس نے ہم میں سے بہتوں کے دل کو دکھ پہنچایا۔ اس لیے کہ اختلافات، فرقہ وارانہ مسئلہ پر جو کچھ بھی ممکن ہوں، لیکن سیاسی مسئلہ میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ محمد علی آزادی ہند کے دلدادہ تھے۔ اور جب یہ سیاسی مطمح نظر مشترک تھا، تو پھر فرقہ وارانہ مسئلہ میں بھی ہمیشہ ان سے سمجھوتہ کی گنجائش تھی۔ محمد علی کو ان رجعت پسندوں سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ جو فرقہ وارانہ مسائل کے علم بردار بنے گھوم رہے ہیں۔" (ص ۱۱۹-۱۲۰)

تقدیر نے ذرا یاوری کی ہوتی، تو حالات کیا سے کیا ہو گئے ہوتے! مشہور و معروف نہرو رپورٹ ستمبر ۲۸ء میں نکلی۔ محمد علی، بیمار و نزار، ذیابطیس کے شکار، کئی مہینہ قبل یورپ علاج کے لیے جا چکے تھے۔

"ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ محمد علی ۲۸ء کے موسم گرما میں یورپ جا چکے

تھے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی اس وقت ایک زبردست کوشش ہوئی، اور کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کاش محمد علی اس وقت ہوتے۔ بہت ممکن تھا کہ نتائج دوسرے نکلتے۔ لیکن جب تک وہ واپس آئیں آئیں، معاملات بہت دور تک پہنچ چکے تھے۔ اور حالات ناگزیر نے انھیں دوسرے فریق میں لا کھڑا کیا۔" (ص ۱۲۰)

یہ ذکر آج ملک کی آزادی کامل کے سب سے بڑے علم بردار اسی محمد علی کا ہو رہا ہے جو سنہ ۳۰ء میں خود اپنے بہت سے بھائی ہندوؤں کی زبان میں "ٹوڈی" تھا "غدار" تھا "قوم فروش" تھا، طالبِ جاہ کا پتلا اور نمایش کا متوالا تھا!

"دو سال بعد، سنہ ۱۹۳۰ء میں جب جیل بھرنے لگے، اور قانون شکنی کی زبردست تحریک پھر شروع ہوئی، محمد علی نے کانگرس کے فیصلہ کی خلاف ورزی کی، اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئے۔ مجھے ان کی شرکت سے دکھ پہنچا۔ میرے خیال میں وہ خود بھی اس سے خوش نہ تھے، چنانچہ لندن میں انھوں نے جو کچھ کیا، اس سے صاف یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے لیے اصل جگہ ہندوستان کا میدان جنگ ہے، نہ کہ لندن کا نفرنس کا بے ثمر کمرہ! اگر مقدر میں ان کا ہندوستان واپس آنا ہوتا تو مجھے اپنی جگہ پر یقین ہے کہ وہ دوبارہ شریک جنگ ہو کر رہتے۔ جسمانی حیثیت سے ان کی حالت یاس کو پہنچ چکی تھی، اور سالہا سال سے مرض کا تسلط ان پر جمتا چلا آ رہا تھا۔ لندن جب پہنچے، تو ضرورت انھیں آرام و سکون کی تھی، برعکس اس کے انھیں دھن اس کی سوار رہی کہ واقعی کوئی کارنامہ اپنے شایان شان انجام دے ڈالیں۔ بس اسی نے انھیں اور جلد ختم کر ڈالا۔ نینی جیل میں ان کی خبر وفات پا کر میں دھک سے رہ گیا۔" (ص ۱۲۰)

آخری وقت کا منظر آپ دیکھ چکے، تو اب اس زندگی میں آخری ملاقات کا نظارہ بھی کرتے چلیے۔ وہ بھی کچھ کم اثر انگیز نہیں:

"میری آخری ملاقات محمد علی سے دسمبر ۲۹ء میں لاہور کانگرس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبۂ صدارت کے بعض حصے انھیں ناپسند ہوئے تھے، اور ان پر وہ شدت سے نکتہ چینی کرتے رہے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ کانگرس آگے بڑھتی جا رہی ہے اور سیاسی اقدامات میں پیش پیش ہو رہی ہے اقدامات میں وہ خود سب سے پیش پیش رہنے والے تھے۔ اس لیے قدرتاً یہ دیکھ دیکھ کر بےچین ہو رہے تھے کہ انھیں پیچھے رہ جانا پڑے اور دوسرے آگے نکلتے چلے جائیں۔ مجھے انھوں نے خاص طور پر نصیحت فرمائی کہ "دیکھو جواہر لال! تمھیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ یہ جو آج تمھارے ساتھی بنے ہوئے ہیں، تمھارا ساتھ نہیں دینے کے۔ وقت پڑنے پر سب تم سے غداری کر جائیں گے۔ تمھیں پھانسی پر چڑھانے والے تمھارے ہی کانگریسی ہوں گے ——— ایک ہولناک پیش گوئی![1]" (ص ۱۲۰)

تین چار صفحے کا مفصل تذکرہ یہی تھا ——— لفظی ترجمہ کی سعی کسی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی ہے کوشش صرف یہی رہی ہے کہ جواہر لال اگر اردو میں لکھتے تو اس مفہوم کو کیونکر ادا کرتے ———

اس مستقل تذکرہ اور ابتدا کے ضمنی تذکروں کے علاوہ دو جگہ ذکر اور رہے۔ ہندو مسلم نزاعات اور "فرقہ وارانہ کشمکش" کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں بارہا کوششیں اس کی ہوئیں کہ گفت و شنود، بحث و مباحثہ کے ذریعہ سے کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو۔ ان جلسوں کا نام اتحاد کانفرنس ہوا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا کانفرنس وہ تھی جو ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی صدر کانگرس

[1] یہ ہولناک پیش گوئی اس صورت میں تو نہیں لیکن ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل کی صورت میں بہرحال پوری ہو کر رہی۔ (دسمبر ۱۹۶۲ء)

کی دعوت پر دہلی میں ہوئی تھی، اسوقت جبکہ گاندھی اپنا کیمپین کا شہود بت لکھے ہوئے تھے۔ (مصہ) [۱۳۹]

مسلمانوں میں احساس قومی و تحریک وطنی کے ارتقا کے سلسلہ میں لکھتے ہیں، اور یہ زمانہ ۱۹۱۴ء کا ہے کہ

"مسلمانوں کے طبقۂ اعلیٰ کا جو رجحان اب وطنیت کیجانب ناگزیر ہو چکا تھا، اسے نہ گورنمنٹ روک سکتی تھی، نہ آغا خاں۔ جنگ عظیم نے اس تحریک کی رفتار تیز کر دی اور ادھر نئے لیڈر پیدا ہوتے گئے، ادھر آغا خاں ہٹتے گئے۔ علی گڈھ کالج تک کو اپنا رنگ بدلنا پڑا، اور نئے لیڈروں میں سب سے زیادہ زبردست طاقت والے علی برادران ہی تھے، جو دونوں کے دونوں علی گڈھی تھے۔" (ص ۴۶۶)

غرض اسی طرح محمد علیؒ کی قوت کا، شخصیت کا، جوش کا، اخلاص ہندی کا، مذہب پرستی کا اعتراف جواہر لال کے حقیقت نگار قلم سے، موجود ہے، اتنی وضاحت و صراحت اور اتنی تکرار و تواتر کیساتھ کہ اس سے زیادہ کی توقع کسی طرح بھی نہیں قائم کی جا سکتی تھی۔ جواہر لال آخر اپنی ہی سرگزشت لکھ رہے تھے، کوئی "مناقب محمد علی" لکھنے تو بیٹھے نہ تھے ——— ہندو اخبارات نے کتاب کے جو اقتباسات شائع کیے تھے، ان میں اور اصل کتاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عوام کی زبان پر چڑھا ہوا ایک مصرع ہے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

دنیائے اسلام کے 'گوہر' نہ سہی، 'جوہر' کی قدر 'جوہری' نہ سہی، 'جواہر' کے ہاں تو پوری طرح موجود ہے!

ضمیمہ نمبر (۸)

محمد علیؔ اور تحریک ہجرتؔ

[جس زمانہ میں سچ کی اشاعت ملتوی تھی، اور صدق ابھی جاری ہوا نہ تھا[1]، سرتھیوڈر ماریسن کے ایک مضمون پر ذیل کا مراسلہ روزنامہ ملت (دہلی) میں شائع کرنا پڑا تھا۔ کوئی افسانہ کیسا ہی فرضی ہو، جب بار بار دہرایا جاتا ہے، تو خلقت کی نگاہ میں ایک مسلّم تاریخی حقیقت بنجاتا ہے۔ حال میں ایک اسلامی معاصر کے کالموں میں پھر اسی افسانہ کی بازگشت نظر پڑی، اس لیے مراسلۂ مذکور، خفیف لفظی تغیر کے بعد صدق میں شائع کیا جارہا ہے]

ایڈیٹر صاحب ملت۔ السلام علیکم

آپ کے روزنامہ میں سرتھیوڈر ماریسن کے ایک مبسوط مضمون کا ترجمہ مسلسل نکل رہا ہے، ماریسن صاحب مدتوں علی گڈھ میں، مسلمانوں کے ملازم رہ چکے ہیں، اور مسلمانوں کے ہمدرد مشہور ہیں۔ لیکن اسلامی سیاسیات پر ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے، حسب توقع خالص برطانوی امپیریلزم کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے۔

سارے مضمون کے مغالطوں اور غلط بیانیوں کی مفصل تردید کی نہ حاجت نہ مہلت۔ اس وقت صرف ایک مسئلہ کو تمثیلاً پیش کرنا ہے، اور وہ بھی مختصر لفظوں میں۔ ۹ مارچ کے

[1] صدق کیم ستمبر ۱۹۳۶ء [2] یعنی شروع جنوری ۳۴ء سے لیکر آخر اپریل ۳۵ء تک کا زمانہ۔

کے پرچہ میں سر موف فرماتے ہیں :۔

"مولانا محمد علی مرحوم، انگلستان ایک وفد لےکر آئے، اور انھوں نے مسٹر ایچ اے، ایل، فشر کے سامنے، جو وزیر ہند کی نیابت کر رہے تھے، یہ تشریح کی .... مگر مولانا محمد علی کو خالی ہاتھ ہندوستان واپس آنا پڑا، اور وہاں سے واپسی پر انھوں نے اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی نے اپنے ہم مذہبوں کو یہ تلقین شروع کر دی کہ حکومت نے اسلامی شریعت کو اپنے پانوں کے نیچے کچل ڈالا ہے۔ اور اس لیے ہندوستان اب دار الحرب ہے، اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر ایسے ممالک میں ہجرت کر جائیں، جہاں اسلام کی حرمت و عزت ابتک قائم ہے۔ اس آواز پر لبیک کہنے میں ہزاروں سیدھے سادے مسلمان تحریک ہجرت میں شریک ہو گئے۔"

اس کے آگے ان بدنصیب مہاجرین کے مصائب کی تفصیل ہے۔ اور پشاور اور کابل کے درمیان، بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کی قبریں بنجانے کا دردناک تذکرہ ہے۔ گویا علی برادران کی سیاہ فرد جرائم کا ایک اہم عنوان یہ بھی ہے کہ انھوں نے بے سمجھے بوجھے ہزار ہا مسلمانوں کو بے خانماں اور طرح طرح کے ناقابل بیان شدائد میں مبتلا کرا دیا!

یہ الزام حکومت کے ایجنٹوں کی زبان پر پہلی بار نہیں آیا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے ایک نامور "مستشرق" پروفیسر گب ہیں، آپ نے "ماہرین فن" کے قلم کا ایک مجموعۂ مضامین "ودہر اسلام" (Whither Islam) کے نام سے سال دو سال اُدھر شائع فرمایا ہے، اس کے صفحات میں بھی یہی مضمون شد و مد سے دہرایا گیا ہے، گو، علی برادران کے نام کی تصریح نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء کی تحریک ہجرت کے سلسلہ میں جو کچھ بھی بے عنوانیاں پیش آئیں ان کی ذمہ داری علی برادران، خصوصاً مولانا محمد علی پر ڈالدینا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے سر مائیکل اوڈوائر کے معروف و معلوم مظالم پنجاب کو سر تھیوڈر ماریسن سے منسوب کر دیا جائے! ماریسن صاحب تو تاریخ کے پروفیسر رہ چکے ہیں، اور ان کی تاریخ دانی مشہور ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں رہا کہ ہجرت کا زور تو ۱۹۲۰ء میں، جون، جولائی، اور اگست کے مہینوں میں رہا۔ جب محمد علی غریب، تحریک کی رہنمائی کرنا الگ رہا، ہندوستان سے اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، عین سر ماریسن کے وطن میں موجود، اور اپنے نہیں ان کے ہم وطنوں کے سامنے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کر رہا تھا! ——— ہندوستان کی سرزمین کو تو وہ مہینوں قبل غالباً فروری میں چھوڑ چکا تھا!

محمد علی کی ذات الگ رہی، محمد علی جس کمیٹی کے روح رواں تھے، یعنی مرکزی خلافت کمیٹی، خود اس کا بھی کوئی تعلق، تحریک ہجرت سے، اگست ۱۹۲۰ء تک مطلق نہ تھا، اور تحریک تمام تر دوسرے ہاتھوں میں رہی! سرکاری سالنامہ "انڈیا ۱۹۲۰ء میں" بہت کچھ جھوٹ کے باوجود، اتنا سچ بھی تحریر ہے کہ تحریک ہجرت کا آغاز صوبہ سندھ سے ہوا۔ اور تحریک، صوبۂ سرحدی میں، حیرت انگیز سرعت کے ساتھ "مقامی ملاؤں کے اثر سے" پھیلی۔ (ص ۶۲ کتاب مذکور)

بے خانماں مہاجرین کے جوش ہمدردی میں، کاش سر ماریسن کو برطانوی شرافت کا وہ یادگار واقعہ یاد آجاتا، جو مہذب و شایستہ گورے سپاہیوں کے ہاتھوں، کچاگڑھی ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا تھا! ایک بدمست گورا، شراب کے نشہ میں (اور شاید حکومت کے نشہ میں بھی) جھومتا ہوا، زنانہ درجہ میں گھسا، اسے دیکھ کر ایک غریب مہاجر حبیب اللہ، عورتوں کی عزت

آبرو بچانے کو آگے بڑھا۔ اور اسی جرم کی پاداش میں وہیں کھلے خزانے "دلیر و شجاع" فوجی گوروں کی ایک پوری جماعت کے ہاتھ سے شہید ہو کر رہا۔ —— جن حضرات کے پاس ینگ انڈیا بابت سنہ ۱۹۲۰ء کی فائل موجود ہو، وہ جولائی اور اگست کے پرچوں میں خود گاندھی جی کی تحریریں اسی موضوع پر، نیز چشم دید گواہوں کی باضابطہ شہادتیں ملاحظہ فرمالیں۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے تحریک ہجرت کا کام اپنے ہاتھ میں لینا ۱۰ اگست کے جلسہ میں منظور کیا۔ کارروائی پوری باقاعدگی اور نظم کے ساتھ کرنے کو مولانا شوکت علی نے سب سے پہلے سفیر افغانستان متعینہ دہلی سے معاملات طے کرنے ضروری خیال کیے۔ چنانچہ سفیر صاحب سے مراسلت ۱۱ اگست کو شروع کی۔ ۶، ۷ ہفتے گزر گئے اور محض ضابطہ کی مراسلت ہی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ تحریک ترک موالات، اپنی پوری تفصیل کے ساتھ بروے کار آگئی، اور معاً خلافت کمیٹی، تحریک ہجرت نہیں بلکہ ترک موالات کی جانب انہماک، جوش و قوت کے ساتھ متوجہ ہوگئی —— مولانا محمد علی اس وقت تک بھی ہندوستان نہیں آئے تھے۔ وہ تو کہیں شروع اکتوبر میں ہندوستان پہنچے ہیں۔ اگست اور جولائی اور جون کے واقعات کا ہفتوں اور مہینوں پیشتر کے گزرے ہوئے واقعات کا ذمہ دار اس مرحوم کو قرار دینا، یورپ ہی کے "مورخین محققین" کا کارنامہ ہو سکتا ہے!

ضمیمہ نمبر (۹)

محمد علیؒ

(ریڈیو اسٹیشن دہلی سے تقریر۔ ۱۸ مارچ ۴۰ء، وقت ۱۵ منٹ)

[ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اس کی تقریروں میں، خیال رکھ لینا چاہیے کہ نہ سیاسیات پر کچھ کہا جا سکتا ہے، اور نہ مذہب پر کھل کر گفتگو ہو سکتی ہے۔ محمد علیؒ پر بھی تقریر ان عام قواعد سے مستثنیٰ نہ تھی، احتیاط کے باوجود بعض الفاظ اور فقرے اصل تقریر کے وقت چھوڑ ہی دینے پڑے تھے]

۱۹۲۶

نومبر کا مہینہ ہے اور شروع کی تاریخیں، سنہ انیس سو چھبیس، سہ پہر کے وقت، کانپور اسٹیشن سے لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے کہ دو شخص، ندوہ کے سالانہ اجلاس سے موٹر پر بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں، اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لوا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیروں کی مدد سے پھینک پھانک سکنڈ کلاس کے ایک درجہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی سے بیٹھے چلے آ رہے تھے۔ نو وارد دونوں کے دونوں ٹھیٹھ ہندوستانی۔ کھدر پوش، عبا پوش، داڑھی باز۔ ایک وجیہ و جامہ زیب، دوسرا کریہ و بدقطع۔ صاحب بہادران نو واردوں کا کینڈا دیکھ کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ یہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ یا دہلی کے "بابو شاہی" روزمرہ میں "ود آؤٹ" (without) والے ہیں!

خوش قطع نو وارد نے اسی برتھ پر قبضہ جمایا، جس پر "صاحب" پہلے سے جمے ہوئے تھے۔ گاڑی چلی، اور گنگا کا پل بات کہتے آ گیا۔ ادھر پہیوں سے گھڑ گھڑ کی آواز آئی، ادھر صاحب بہادر ان دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ چھچھڑی کی ادا سے مسکرائے، اور منہ بنا کر بولے "So This is mother Ganges" یہی گنگا مائی ہے! طنز کا زور لفظ mother پر تھا۔ پاس کا کھدر پوش معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا، انگریزی زبان میں ٹھیک انگریز کے لب و لہجہ میں بولا "اچھا! تو آپ کے دریا سے یہ رشتہ ہے؟ مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی، اماں اور خالہ کہنا کیا معنیٰ؟" "صاحب" یہ تڑاق سا جواب پا، سناٹے میں آ گئے —— یہ منہ توڑ جواب دینے والا محمد علی، اور اس کا ساتھی کہیے یا "تابع مہمل" آپ کا یہ خادم!

صاحب بیچارہ کو بھی گمان نہ تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ہوئے اور جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائے کہ انگریزی میں جواب دے سکے۔ اور وہ بھی ایسی شستہ و برجستہ! کچھ دیر غوطہ میں رہے، پھر ادھر سے منہ پھیر کر گفتگو اپنے پرانے اور ہمجنس رفیق سفر سے کرنے لگے۔ اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکٹ۔ ولایت سے مشہور ٹیم ام، سی، سی۔ نئی نئی ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں یہ گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی ایسا ہے اور فلاں ویسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محمد علی سے نہ رہا گیا، بول اٹھے "دخل در معقولات معاف، آپ رائے زنی میں بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔" اور لگے تفصیل و تشریح کرنے کہ فلاں میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکٹ پر شروع ہو گیا اور بیان ہونے لگی گویا انگلستانی کرکٹ کی پوری تاریخ۔ بولنے والا اب گفتگو کیوں کر رہا تھا، یوں کہیے کہ کسی انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل کرکٹ پر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر فرط حیرت سے دم بخود کہ الٰہی یہ کس قیامت کا

انسان ہے کہ شکل ملاؤں کی سی، اور ماہرانہ معلومات اور فنی تنقید میں کرکٹ بازوں کا استاد!
آخر سنتے سنتے گھبرا کے ایک بار بولے "آپ کو بڑے ہی معلومات کرکٹ سے متعلق ہیں"! انھوں
نے کہا "ایسے معلومات ایک مجھی کو کیا، ہر علی گڈھ والے کو ہوتے ہیں"۔ وہ بولا "اچھا تو آپ
علی گڈھ کے پڑھے ہیں، کپتان رہے ہوں گے"۔ بولے "جی نہیں، کپتان تو بڑے بھائی
Big Brother تھے"۔ یہ شوکت صاحب کے لیے (Big Brother)
کی اصطلاح خود محمد علی کی چلائی ہوئی تھی، اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا
تھا۔ صاحب بہادر نے اپنے نزدیک گویا بڑی پہیلی بوجھی، اور بول اٹھے " You
Talk like Mohammad Ali یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں"!
یہ بولے I am Mohammad Ali زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں!
صاحب کی حیرت اب دیکھنے والی تھی۔ آنکھیں پھاڑے، اور نظر اس کھدر پوش
کے چہرہ پر گڑوئے ہوئے بولے Realy! one of The Two Ali brothers
کیا واقعی؟ وہی محمد علی، جو علی برادران میں سے ایک ہیں"! انھوں نے چمک کر جواب دیا
Yes, and The younger and more sharp Tongued of The Two
جی ہاں وہی بھائی، جو دونوں میں چھوٹا، اور زبان کا زیادہ تیز ہے"! صاحب کو ابھی اپنی حیرت
کو دور کرنے میں دیر سکنڈوں کی نہیں، منٹوں کی لگی۔ بے چین اور بیقرار، پہلو پہ پہلو بدل رہے ہیں
اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے جو یہ دیکھا تو صاحب بہادر کو اور
گڑبڑانا شروع کر دیا۔ بولے "یہ میرا نام سن کر آخر اتنی گھبراہٹ کیوں؟ کیا یہ خیال تھا کہ علی برادران
جہاں کہیں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں، بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں؟ تو اطمینان رکھیے اطمینان
دیکھ لیجیے! نہ (ہاتھ پھیلا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملے دہلے کا تو خیال بھی

دل میں نہ لائیے۔" صاحب کے ہاتھ میں وقت کا مشہور انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے بڑھا کر "اچھا۔ ان الزامات کا کیا جواب ہے، جو یہ روز آپ پر لگاتا رہتا ہے؟" محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں، بولے "اسے تو آپ ہی پڑھیے، میں پرچہ کو نہیں، پرچہ نویس کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ آکسفورڈ میں میرے زمانہ میں تھا، مجھ سے پیچھے۔ آتا جاتا اس کو اُس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ گلہ ہوا اور گلہ بان نہ ہو تو نہ سہی، لیکن یہ عجب تماشہ ہے کہ اس کا کوئی گلہ نہیں، اور کہتا اپنے کو گلہ بان ہے!" یہ سارا لطیفہ تھا ایڈیٹر صاحب کے نام Mr. Sheppard پر! —— داستان خاصی طویل ہوگئی۔ ایک ہی قصہ کو کہاں تک سنے جایئے گا۔ چھوڑیے یہیں اس قصہ ناتمام کو۔

۱۹۲۰ء ہے۔ محمد علی۔ وفد خلافت لیکر یورپ گئے ہوئے ہیں، کوئی سنتا نہیں ہے، چاہتا اور یہ ہیں کہ اپنی سنائے چلے جاتے ہیں۔ لندن میں ایک جلسہ میں تقریر کا موقع ڈھونڈھ نکالا۔ کن مشکلوں سے اجازت پانچ منٹ کی ملی۔ کہنے کھڑے ہوئے کہ "حضرات! یہ تو سن لیجیے کہ میں آرہا ہوں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے، اور ترجمانی مجھے کرنا ہے ۳۰ کروڑ انسانوں کے خیالات کی۔ اب آپ خود ہی حساب لگا لیجئے کہ فی منٹ نہیں، فی سکنڈ بھی نہیں، ہر سکنڈ کی کسر میں کتنوں کے خیالات و جذبات آپ تک پہنچاؤں گا۔" آوازیں آنے لگیں آپ کہے جایئے کہے جایئے، اور ہر پانچ منٹ کے بعد پانچ ہی پانچ منٹ اور بڑھتے رہے، یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہو گئے!

اسی سفر میں لندن کا ایک اور منظر۔ مولانا مخالفین کے مجمع میں تقریر یہ کر رہے ہیں کہ

"صلح کے وقت ہم استنبول کس طرح چھوڑ سکتے ہیں، تھریس ادرنہ سمرنا تو پھر غنیمت ہیں، لیکن استنبول سے ہماری تاریخ وابستہ ہے......." یہیں تک پہنچے تھے کہ ایک گوشہ سے آواز آئی کہ "یعنی یعنی؟ استنبول آخر کب سے آپ کے قبضہ میں ہے؟" جواب میں دیر کیا تھی، کھٹ سے ارشاد ہوا کہ "کوئی فاضلِ تاریخ مجھ سے سنہ دریافت کر رہے ہیں۔ اس وقت تو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے پاس ہندوستان ہے، اس کے تگنے زمانہ سے ہمارے پاس استنبول ہے"! جلسہ لوٹ لوٹ گیا۔ اور فاضلِ تاریخ کی آنکھیں پھر نہ اونچی ہوئیں!

مہاراجہ الور، جو ابھی کل تک زندہ تھے، ابھی تو بہت سے لوگ ان سے واقف ہونگے ۲۸ء میں ایک بار مہربان ہو، مولانا کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ انگریزی کے تو ماہر تھے ہی فارسی کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے شاعر تھے وحشی تخلص تھا۔ پہلی ملاقات میں اپنا دیوان مولانا کو پیش کیا۔ تو اس پر یہ الفاظ لکھ دیے "To my maulana from his Wahshi" اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کی طرف سے"! یہاں کیا دیر تھی۔ جیب سے جامعہ ملیہ کا نصف اپنا تیار کیا ہوا انگال، جٹ اس پر یہ سطر لکھ، سارا قرعنہ دم نقد چکا دیا۔ "From a Bogus maulana To a real Maharaja" ایک نام کے مولانا کی طرف سے ایک کام کے مہاراجہ کی خدمت میں"!

لطائف و ظرائف اس طرح کے کوئی دو چار، دس بیس ہوں تو کہے جائیں۔ یہاں تو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، معمول یہی تھا ——— کہاں تک سنیئے گا؟ اور کوئی کہاں تک سنائے گا؟ سننا اور سنانا الگ رہا، کسی کو یاد ہی کب رہ سکتے ہیں؟ اور یاد کو بھی چھوڑیئے، یہی کیونکر ممکن تھا کہ کوئی سال کے ہر دن، اور ہر دن کے چوبیسوں گھنٹے، ہمزاد بنا، ساتھ ہی ساتھ

بسا اور چہکار رہے ہیں؟ ہا! جس قبر میں قوم و ملت کی بے شمار آرزوئیں اور ولولے مدفون ہیں، وہیں آج ہزار ہا ہزار ادبی لطیفے اور چٹکلے بھی زیر خاک ہیں۔

مناسبت لفظی کے بادشاہ تھے۔ قوتِ حافظہ بلا کی تھی، برجستگی اور حاضر جوابی تو کہنا چاہیے کہ ان پر ختم تھی۔ چاہے کسی والیِ ملک کے دربار میں ہوں، جامع مسجد کے منبر پر ہوں، عدالت کے کٹہرے میں مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوں کہیں اور کسی حال میں ہوں، اپنی آمد طبع سے نہ چوکتے۔ حد یہ ہے کہ شدید غصہ کی حالت میں بھی ذہانت کند نہ ہو جاتی اور اس پر جلا ہوتی۔ ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں حکیم صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے۔ محمد علی بیمار و معذور لیٹے ہوئے ہیں۔ مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر ہیں۔ یہ بھی ایک روزنامہ کے مالک ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کے نفس ناطقہ روزنامہ کے اڈیٹر صاحب بھی ہیں، اور صاحبزادہ بھی۔ بحث نے طول پکڑا، گرماگرمی نے زبانوں پر چھالے ڈال دیے۔ سوال وجواب کی تلخیوں نے منہ کے مزے خراب کر کر دیے۔ آخر وہ تینوں صاحب ناخوش ہو، جلسہ پر لعنت بھیج اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اُدھر وہ اٹھے، اور ادھر محمد علی نے پکار کر کہا "غضب ہو گیا۔ باپ بیٹے، روح القدس تینوں کے تینوں خفا ہو گئے!"

ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔ محمد علی شاعر بھی تھے، اور شاعری کی دنیا میں نام تھا جوہر۔ بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت، بے تخلص رہے جاتے ہیں، ان کے لیے تجویز کرتا ہوں اسی وزن و قافیہ میں شوہر ——— بیشک عروس سخن کو ایسا شوہر کبھی کیوں ملنے لگا تھا!

شیفتہ کی مشہور غزل ہے "پشیمانیوں میں ہم" "نادانیوں میں ہم" اس پر غزل کہنے بیٹھے

تومطلع ارشاد ہوتا ہے:

کیوں شہر چھوڑ جا بسیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

علی گڈھ کے مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔ اس کے ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم:

خود بیجاپور جیل میں تھے۔ بڑے بھائی، لحیم و شحیم،، راجکوٹ جیل میں پڑے پڑے دبلے ہو گئے تھے، ان کی زبان سے ادا کیا ہے ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی نوجوان ہی تھے کہ علی گڈھ کالج میں زبردست اسٹرائک ہوئی، اور کل کچھ ایسی بگڑی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کالج ہی کا دم واپسیں آپہنچا، سرسید کی برسی کا دن آیا، اور عین اسی دن اولڈ بوائز نے اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں، اور ایک منظوم عرضداشت سرسید کی روح کی خدمت میں، اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا پیش کرتے ہیں۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقائد مذہبی ملحوظ خاطر رہیں ؎

یہاں ڈانا کہ تاثیر دعا میں شک ہے یا تم کو — وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اسکی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو

ردیف دال میں یہ غزل کیسی چل گئی ہے، اور ہر شعر کیسا بولتا ہوا ہے ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ جیل کے باہر تھا۔ جیل کے اندر خود محمد علی کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو — خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا — سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ تھی آپ بیتی کا ٹکڑا تھا۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے محمد علی کو دور سے، سردار قوم کی حیثیت سے جانا، پیشوائے ملت کی حیثیت سے پہچانا، خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے قریب سے دیکھا، بہ حیثیت دوست کے

عزیز کے۔ انسان کے۔ ان دیکھنے والوں نے کیا کچھ دیکھ لیا، کیا کچھ پالیا۔ ایک صداقت مجسّم، پیکرِ اخلاص، جرائت، ہمت وبے خوفی کا مجسمہ! پاس والے جتنا قریب سے دیکھتے گئے، جوہر کے یہی جوہر اور زیادہ کھلتے گئے، ابھرتے گئے، نکھرتے گئے۔ کہتے ہیں کہ اہلِ سیاست وہ ہوتے ہیں، جو کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو محمد علی قطعاً سیاسی نہ تھے، ایک بار نہ بھی، ہزار بار نہ تھے۔ محبت کے پتلے تھے، مہر والفت کے بندے۔ بیوی بچوں، دوستوں رفیقوں کے عاشقِ زار، عزیزوں کے جان نثار، اجنبیوں تک کے مونس وغمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے، میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ عالمِ اسلام کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم، افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے، اور اس کی چبھن محمد علی دہلی میں بیٹھے محسوس کریں۔ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کسی کے حق میں شاعری ہوگی، ان کے حق میں واقعہ۔ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص۔ خود اپنے گھر میں مفلسی ونا داری، مہمان اور دوسروں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے ہیں، اور زبردستی کھانا کھلا رہے ہیں!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار۔ ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی۔ سنہ ۲۳ء میں ابھی جیل میں تھے، کہ منجھلی لڑکی، جوان، شادی شدہ، دق میں مبتلا ہوگئی، اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور اور محصور، صدہا میل دور، باپ پر کیا گزر رہی ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا ہے، وہ اپنی نازوں کی پالی نورِ نظر کے واسطے کیسا کچھ بلبلایا ہوگا، تلملایا ہوگا، پھڑپھڑایا ہوگا۔ کچھ اور زور نہ چلا تو عالمِ خیال میں بیٹی سے کہنے لگا ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے دل کو یوں سنبھالنے لگے ؎

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی تو کیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ — اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر عرض کرتے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا — تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت سے نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تقدیر کا نوشتہ کسی علاج و تدبیر سے مٹ نہیں سکتا، شعر کہنے سے پہلے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیتے ہیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

ایک نہیں، دو دو، جوان، پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اٹھایا، قبر میں اتارا، سلایا۔ دل ذاتی صدموں کی تاب کہاں تک لاتا۔ قومی صدمے اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلافت نہیں توڑی، محمد علی کا جگر پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ جئے اس کے بعد بھی برسوں، اور بہتوں سے زندوں سے بڑھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ ہنسے بھی، بولے بھی، گرجے بھی، لیکن اندر ہی اندر برابر گھلتے رہے، گھلتے رہے، سلگتے رہے۔

پروردگار سے اتنا ربط و تعلق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھنے بیٹھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جہاں یہ مضمون آجاتا کہ ڈرنے کی چیز بندے نہیں، اللہ ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے، اور ان آیتوں کو بار بار پڑھتے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ تو گویا تکیۂ کلام تھا۔ سورۂ یوسف کی آیت ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ کو فرمائش کر کر کے سنتے اور

وجد کرتے۔ ایک مشہور مفکر نے شہادت دی ہے کہ کانگریس کا رزولیوشن ہو، تقریر ہو، کچھ ہو، کمال تھا محمد علی کو کہ ہیر پھیر کر خدا کا نام ضرور لے آتے تھے۔ آخر آخر دل سب کی طرف سے ٹوٹ گیا تھا، اور خود اپنے مصرع کی تفسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ ع

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

جنوری ۱۹۳۱ئہ کی ۴ اور ۵ کی درمیانی شب مسلمانوں کے ہاں پندرھویں شعبان کی مبارک شب، اور روے زمین کے مسلمان، ذوق وشوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا کی اور آخرت کی، دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ اس برکت والی رات میں مشیتِ الٰہی نے اپنی یونعمت ان سے واپس طلب کرلی۔ شاید اس لیے کہ محمد علی کے اہل وطن واہل ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان، لندن میں جاں آفریں کے سپرد کی، اور آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں نصیب ہوئی؟ قبلہ اول میں ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ سے متصل! اقبالؒ کو الہام ہوا ع

سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

ماتم وشیون کی صدائیں ملک کے ایک ایک گوشہ سے، ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ، ایک ایک گانوں سے، اور ہندوستان ہی نہیں، سارے عالم اسلامی میں اس زور وشور سے اٹھیں، اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ "ماتم یہ زلزلہ میں بپا میرے لیے ہے" ان ہی کا مصرع ہے اور یہ بھی تو خود ہی فرماتے ہیں ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ضمیمہ نمبر ۱۰

محمد علیؒ کے خطوط[1]

[شروع سال ۱۹۴۱ء سے دہلی ریڈیو اسٹیشن نے اپنے ہاں سے مشاہیر کے خطوط پر تقریروں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا تھا۔ سلسلہ کا عنوان تھا "سمندر پار سے خطوط" اور اس میں وہی خطوط جگہ پا سکتے تھے، جو ہندوستان کے باہر سے لکھے گئے ہوں۔ اپریل میں باری محمد علیؒ کے خطوط کی بھی آئی۔ اور اس وقت مدیر صدق نے ذیل کی تقریر نشر کی۔ ریڈیو البتہ ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اس کی پابندیوں کو ناظرین تقریر پڑھتے وقت ذہن میں رکھیں۔ تقریر کا وقت ۱۵ منٹ کا تھا]

نوجوانی سے لیکر اپنے قبل از وقت بڑھاپے تک محمد علی یورپ سمندر پار چھ بار گئے۔ اور خط ہر دفعہ وہاں سے بہت سے لکھے لیکن شروع میں ان خطوط کو کون محفوظ رکھتا؟ اس وقت کسے خبر تھی کہ گودوں کا کھلایا ہوا لڑکا، ساتھ کا کھیلا ہوا نوجوان ایک روز شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا؟ آخر کے خطوط بے شک بہت سے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس۔ لیکن وہ زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز۔ انھیں کوئی ریڈیو پر کیسے لائے۔ خاص و عام کو کیسے سنائے؟ اس ذخیرہ کے علاوہ بھی جتنے ہیں

---

[1] صدق یکم دسمبر ۱۹۴۱ء

اتنے زائد ہیں کہ کوئی انھیں پھیلانے پر آئے تو آج کا سارا پروگرام اسی ایک عنوان کی نذر ہو جائے داستان گو تھک جائے اور داستان ختم نہ ہو پائے۔

محمد علی، مولانا تو بہت بعد کو ہوئے۔ شروع میں تو مدتوں مسٹر رہے، مسٹر ہی کہلائے پہلا سفر ۱۸۹۸ء میں کیا۔ جب پرانی صدی کے ختم ہونے کے بعد دو سال رہ گئے تھے۔ سن اس وقت بیس سال کا تھا۔ دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں کیا، جب نئی صدی کو شروع ہوئے بھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ سن اس وقت ۲۴ سال کا۔ دونوں سفر طالب علمی ہی کے سلسلہ میں تھے۔ زیادہ تر آکسفورڈ اور لندن میں۔ مشغلے اسی سن و سال کے لائق اور مراسلے ان ہی مشغلوں کے مناسب حال۔ انگریزی میں لکھے ہوئے بڑے بڑے طویل مراسلے علی گڑھ منتھلی میں "Oxford Idling" کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ ذکر ان میں زیادہ تر ہوتا کالج کے کھیل کود کا، ہمجولیوں کی رنگ رلیوں کا، اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا اس دور سے یقیناً آپ کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔

تیسری بار انگلستان جانا ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ اب محمد علی ملک کے ممتاز جرنلسٹ اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز تھے۔ کامریڈ عرصہ سے نکل رہا تھا۔ اور اب ہمدرد بھی نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ کانپور کی ایک نئی نکلنے والی سڑک کی زد میں ایک مسجد کا گوشہ آرہا تھا۔ اس پر قدرۃً ایک سخت ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اور معاملہ شہر بلکہ صوبہ کے حدود سے نکل کر "آل انڈیا" بن چکا تھا محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری کو ساتھ لے، چپ چپاتے ولایت روانہ ہو گئے کہ وہاں جا کر اس معاملہ، اور ایک یہی کیا، ملک کے بہت سے معاملات پر لوگوں سے ملیں ملائیں، دلوں کو گرمائیں، طبیعتوں کو نرمائیں، تقریر سے، تحریر سے، قلم سے زبان سے۔ غرض وہاں پہنچ کر ہندوستان خط بہت سے لکھے، عموماً انگریزی میں۔ اکثر کامریڈ میں چھپ بھی گئے۔ انھیں پڑھ کر نقشہ نظر کے

سامنے پھر جاتا ہے، اس وقت کے ہندوستان کا، اس وقت کے ہندی مسلمان کا، اس وقت کے انگلستان کی شان وشوکت کا۔ ناکامیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں۔ ہمت پست نہ ہوئی۔ دعوتیں اور ضیافتیں محمد علی کی بکثرت ہوئیں لندن میں بھی اور اڈنبرا، نیوکاسل وغیرہ میں بھی۔ ان جلسوں اور صحبتوں میں شریک انگلستان کے مشاہیر بہت سے ہوئے۔ مثلاً اہل قلم واہل صحافت میں ایچ، جی، ویلز۔ جی، کے، چسٹرٹن۔ اے، جی، گارڈنر۔ سی، پی، اسکاٹ۔ جے، اے، اسپینڈر ولینٹائن ولیمس اور آئرلینڈ کے مشہور شاعر ڈبلو، بی، ایٹس۔ اہل سیاست میں ریمزے مکڈانلڈ، کیرہارڈی، جان ڈلن۔ آنرے ہربرٹ، ڈاکٹر رودرفرڈ، مسٹر نیونسن وغیرہم۔ کچھ ایسے مشاہیر بھی تھے جو عین وقت پر خود آنے سے معذور ہو گئے اور اپنے بجائے اپنے معذرت نامے بھیجدیے مثلاً برنارڈ شا، مسٹر بلنٹ وغیرہم۔ محمد علی ان جلسوں سے خوب کام نکالتے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ان ہی موقعوں پر کہہ ڈالتے۔ طویل مراسلے، ان کے ٹائمز میں تو بار نہ پاتے، البتہ دوسرے مشہور اخبارات میں ان کے بیانات نکلتے رہتے۔ لارڈ ہیڈلے اس زمانہ میں نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور لیڈی ایولین کوبولڈ تو ان سے قبل ہی اسلام قبول کر چکی تھیں، ان راستوں سے بھی محمد علی نے انگلستان کی سوسائٹی کے اندر خوب گھس پیٹھ پیدا کی۔ اور اپنے مشن میں کچھ ایسے زیادہ ناکام نہ رہے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں جو مراسلہ نکلا ہے، اس میں اپنے اس سفر پر گویا تبصرہ کرتے ہیں۔ "۲۷ نومبر کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے رہے ہیں۔ اس لنچ کی حیثیت سیاسی اور نزاعی نہ ہوگی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم ہندوستان اور انگلستان، اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے سکیں۔ اور تاکہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزنوں دونوں کو بتا دیں کہ وہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب سے

ایسے بے تعلق تو نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکے ہیں، بلکہ ہمارا عزم اور ہمارے مقصد اور گلے شکوے خود ہماری زبان سے سن لیں۔ مشہور افسانہ نگار ایچ، جی، ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے۔ بلکہ اب کی جمعہ کو تو ان میاں بیوی نے اپنے ہاں رات کو کھانے پر مدعو کر دیا ہے۔ اور وقت بھی سوا آٹھ کا رکھا ہے کہ میں اس وقت تک ہندوستان کی ڈاک سے فارغ ہو جاؤں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ہندوستان اور اسلام کے معاملہ میں ان لوگوں کی بےخبری اور جمود دور کرنے اور انھیں بار بار چونکاتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگ ہندوستان سے بار بار آتے اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں میں بہ حیثیت مجموعی مایوس نہیں ہوں"

محمد علی اب ملک و ملت یعنی ہندوستان اور اسلام دونوں کے سفیر تھے، اور یہ دوسرا نقطۂ نظر قائم ہو چکا تھا۔ چوتھا سفر انگلستان اور فرانس کا ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے کیا۔ اب ان کا شمار ملک کے مسلّم لیڈروں میں تھا۔ اور مسلمانوں میں تو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی کہ باید و شاید۔ اب ان کی حیثیت سفیر سے زیادہ مجاہد کی تھی۔ انگلستان خصوصاً شہر لندن میں بہت سی تقریریں کیں۔ اسیکس ہال، کیگسٹن ہال وغیرہ میں، اور کچھ فرانس میں بھی۔ موضوعِ تقریر اسلام اور ہندوستان دونوں کی ترجمانی اور پرجوش ترجمانی ہی رہتا تھا۔ تقریروں اور پبلک تحریروں کے انہماک میں ہندوستان خطوط لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے۔ اور جو کچھ لکھے ہیں ان کی اشاعت کی نوبت اور بھی کم آئی کہ کوئی اخبار اس وقت اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، نہ اردو کا نہ انگریزی کا۔

پانچویں بار۔ بیمار اور زار و نزار ایک قدر دان؛ جوہر شناس ہندو رئیس کے خرچ پر ۱۹۲۸ء میں اپنے علاج کے لیے یورپ پار دراز ہوئے۔ ذیابیطس کا علاج فاقوں کے ذریعہ سے کرنا تھا، اور اس طریقِ علاج کے ماہرین فرانس میں تھے۔ اس لیے قدرۃً اب کی زیادہ تر

قیام فرانس ہی میں رہا۔ اور ڈاکٹروں کی شدید تاکید پر سیاسیات وغیرہ سے ایک بڑی حد تک الگ تھلگ رہنا پڑا۔ اس سفر میں راستہ سے جو مفصّل خط لکھا ہے قابل بلاحظہ ہے۔ اقتباس ذرا طویل ضرور ہوگا لیکن اس سے ایک طرف تو اس سفر اور چوتھے سفر دونوں کے مقاصد روشنی میں آجائیں گے۔ اور دوسری طرف مولانا کا مجلسی اور معاشی نقطۂ نظر بھی کسی قدر واضح ہوجائے گا۔ خط ولایتی جہاز میڈ دنیا سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ ۶ر جون ۲۸ئہ کی پڑی ہے۔ اور اب جامعہ والوں نے خطوط محمد علی کے مجموعہ میں چھاپ بھی دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

"چوتھا سفر ۱۹۲۰ئہ میں کیا گیا۔ اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کیجائے......

گذشتہ تجربوں کی بناپر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا۔ مگر

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا، اس سفر کے بعد توبہ کرلی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں گے۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی...... آج مسٹر واٹسن پولیٹیکل سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے جہاز پر ملاقات ہوئی تو ان کی اس غلط فہمی کو دور کردیا کہ ٹبلر کمیٹی[۱] کے سلسلہ میں انگلستان جارہا ہوں۔ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے متمول ملک کی طرف، ایک فاقہ مست بصرفِ کثیر اس لیے سفر کررہا ہے کہ وہاں جاکر فاقہ کرکے اپنا علاج کرائے۔

[۱] ایک سرکاری کمیٹی۔ اس کے سامنے اظہار دینے بہت سے ہندوستانی ولایت گئے تھے۔

ہندوستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں لیکن سوائے مسز اینی بسینٹ کے اخبار نیو انڈیا[1] کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف میں ہی ایشائی لباس میں ملبوس ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج صبح سے تموج میں بہت کمی ہو گئی ہے اور آج شب کو ۸ ½ سے جب سے یہ خط شروع کیا گیا ہے۔ جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈیک پر میرے قریب ہی ایک خوش رو، وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر لیٹے رہا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول دیا کرتے تھے۔ آج ایک بچی سے میری دیر تک گفتگو رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر وغیرہ کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سنکر اور کچھ دلچسپ پا کر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی۔ اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے، مگر پر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی، جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد بھی دی، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ برگیڈیر جنرل ہیں۔"

دوسرا خط فرانس کے قیام کے بعد لندن سے ۱۹ اگست کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے طویل اقتباسات بھی نہ لطف سے خالی ہوں گے نہ فائدے سے۔ اس لیے اور بھی کہ اس میں ذکر ایک مشہور بزرگ قوم کی وفات کا ہے۔ جن سے محمد علی سے خاصی چشمک رہ چکی تھی۔ اپنی صحت اور بد پرہیزی کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:-

"جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کیا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا۔ اسی وقت سید امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے، تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جب سے امیر علی صاحب

[1] مدراس کا مشہور انگریزی روزنامہ کئی سال تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔

کا انتقال ہوا ہے لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے۔ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک نہ ہو سکا۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا، اس لیے کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی .... ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا چکے تھے۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں۔ اور اس شہر خموشاں کا نام بھی Necropolis ہے۔ ریل کی پٹری اس کے اندر تک آئی ہے۔ نہایت وسیع میدان میں باغ لگایا گیا ہے۔ جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں، روشیں چلنے پھرنے والوں کے لیے بنا دی گئی ہیں۔ اس شہر خموشاں کے اندر اچھی خاصی رسٹوران بھی موجود تھی، جہاں لنچ کھایا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں کے لیے بھی ہے۔ یوں تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کر لیا تھا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر غلط تھا لیکن الحمدللہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے جن میں لارڈ ہیڈلے اور پنجاب کے سابق لفٹننٹ گورنر سر لوئی ڈین تھے، سر لوئی ڈین نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت کیا اور فرمایا۔ کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمدللہ کہکر اور ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا .... مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے، اُن سب کو میں نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون صفیہ احمد فارسی کی ہے۔

یہ خط بھی جامعہ کی چھپی ہوئی تازہ کتاب خطوط محمد علی میں درج ہو چکا ہے۔ آگے چل کر اسی خط میں بمبئی، حیدرآباد، جہلم، راندیر اور مصر کی متعدد میتوں کی قبروں کا ذکر ہے، اسکے بعد فوجیوں کی قبروں کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے۔ اس سے کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ محمد علی

سیاسیات کے علاوہ بھی انگلستان میں کیا کیا دیکھتے تھے اور کس نظر سے۔

"اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی اور سے ہو سکتا ہے نہ کوئی کرتا ہے۔ بااثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں ٹیلیفون پر رات دن باتیں ہوا کرتی ہیں۔ خواہ ٹائمز کا فارن ایڈیٹر خواہ برنرڈ شا...... وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ آنے پر یہاں اعتراف کیا۔ اس طرح گھنٹہ بھر گفتگو کی۔ اور مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ نہ عجیب و غریب ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے، آج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسپکٹیٹر کے ایڈیٹر سے دو گھنٹے باتیں ہوا کیں، اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اسی طرح ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے ۱۰½ سے ۱۲ تک ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ خود ہی اس نے ملنے کی خواہش کی۔ سوا گھنٹہ اس سے ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا۔"

یہ وقت تھا جب اسی محمد علی نے، جو اب نہ مسٹر تھا نہ مولانا بلکہ صرف دیوانہ، راؤنڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس کے بھرے مجمع میں اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندوستان کا ساحل آخری بار چھوڑتے وقت بھی تو جب ایک مخلص نے بڑھ کر پوچھا تھا کہ "آخر آپ اس حالت میں جا کس لیے رہے ہیں؟" تو دیوانہ کی زبان سے پھٹ سے یہی نکلا تھا کہ "مرنے کے لیے" سچے کی بات اللہ نے سچ بھی کیسی کر دکھائی!

ضمیمہ نمبر (۱۱)

محمد علی: بانی جامعہ

(جوہر کے جوبلی نمبر کے لیے لکھا گیا)

محمد علی اپنی زندگی بھر کچھ نہ کرتے صرف جامعہ ہی کی بنیاد ڈال جاتے تو بھی ایک کارنامہ سرمایۂ عمر ہونے کے لیے کافی تھا ——— اللہ کا وہ شیر تو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر دھر کے دنیا سے اٹھا۔

ہائے کیا زمانہ وہ ۱۹۲۰ء کے آخر اور ۱۹۲۱ء کے نصف اول کا تھا! کتنا جوش و خروش! اخلاص تھا کہ سینوں سے ابلتا ہوا، امنڈتا ہوا۔ ایثار تھا کہ عہد صحابہ کا نمونہ دنیا کو ایک بار پھر دکھا رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچے، مرد، عورت سب اپنے اپنے رنگ میں مست! کل کی فکر میں آج کو تجے ہوئے "آجل" کے خیال میں "عاجل" کو بھولے ہوئے، چھوڑے ہوئے ——— محمد علی ان دیوانوں، سرفروشوں کے لشکر کا سردار۔

"تلقین یہ شروع کی کہ ایسی خدا فراموش و مذہب دشمن حکومت جو خلافت اسلامیہ سے برسرِ پیکار ہو، اس کے اور اس کے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں۔ اس کے عہدے، اس کے منصب، سب بحکم "عطائے تو بہ لقائے تو" اس کی طرف

ا؎ صدق ج ۱۲ نمبر ۴۰ (۷ فروری ۱۹۴۷ء)

قابل واپسی۔ پھر سرکاری اور نیم سرکاری تعلیم جو ان سارے تعلقات کے لیے سنگِ بنیاد ہے وہ بدرجۂ اولیٰ قابلِ ترک ولائقِ احتراز۔ تو اب مسلمانوں کے بچے کیا کریں؟ کریں یہ کہ

"ایں سررشتۂ تعلیم او دستِ ما باشد"

اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں —— نصاب اپنا ہو، استاد اپنے ہوں، تعلیمی ماحول اپنا ہو۔

پیام لے کر رخ پہلے علی گڈھ کا کیا کہ وہیں کے یہ ساختہ پرداختہ تھے اور وہیں ان کا سب سے بڑا امید گاہ تھا۔ پیام سہل اور معمولی نہ تھا۔ ایک مستقل انقلاب کی دعوت تھی۔ اور انقلاب کا رجز کن کانوں کو خوش گوار معلوم ہوا ہے؟ لڑکوں میں چند سعید روحوں نے بڑھکر لبیک کہا، باقی ہر طرف سے انکار و ملامت ہی کے آوازے بلند ہوئے —— جس سے پولیس کے ڈنڈوں اور سنگینوں کے سائے میں نکالے گئے۔

داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لیے اس وقت کے اخبارات کے فائلوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ علی گڈھ متضاد تاروں سے روزناموں کے کالم لبریز ہوتے تھے۔ کم کوئی مصیبت تھی جو محمد علی اور ان کے جواں ہمت رفیقوں کو جھیلنی نہ پڑی ہو۔ رسم افتتاح کے لیے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا وجود مقدس ہاتھ آگیا، اور بے سروسامانی کے اسی عالم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوگئی۔ وہی جامعہ جس نے ایک فرزند رشید ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صورت میں پیدا کر دیا۔

کلاسیں درختوں کے چھاؤں میں ہونے لگیں۔ لڑکوں کے رہنے سہنے کے لیے خیمے نصب ہوگئے۔ محمد علی سب ہی کچھ تھے۔ چندہ بھی لائیں۔ پرنسپلی کے فرائض بھی ادا کریں، استادوں کا انتخاب بھی کریں۔ نصابِ درس بھی ہر مضمون کا شروع سے لیکر بی اے تک کا

مرتب کریں! ——— عین اس عالم میں جب ذرا سے بھی سکون سے سانس لینے کی نوبت آئی، اس نیاز کیش کو جس کی شہرت چند روز قبل تک پورے ملحد ہونے کی تھی۔ اور بجا تھی۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں خط لکھا کہ فلسفہ کی پروفیسری کی جگہ تمہارے لیے روکے ہوئے ہوں، لیکن مذہب علم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی طرف سے اطمینان دلا دو تو بے تکلف چلے آؤ۔ خط کی اصل عبارت مکتوباتِ محمد علی وغیرہ کے سلسلہ میں بار بار چھپ چکی ہے۔ یہ محض خلاصہ درج ہوا۔

اس غرض سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ محمد علی کو مذہب کس درجہ عزیز تھا۔ اور وہ ہر معاملہ کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھنے کے کس قدر عادی تھے۔ حقیقتاً وہ مذہبی دیوانے تھے۔ انہیں غلط سمجھا اس نے جس نے انھیں سیاسی فرزانہ خیال کیا۔ جامعہ قائم کرنے سے ان کی پہلی غرض یہ تھی کہ یہاں سے دین وملت کے سنجیدہ خدمت گزار پیدا ہوں اور ضمناً ملک و وطن کی خدمت بھی ہو جائے۔

پائنیر نے جو اس وقت تک تمام تر انگریزی ہاتھوں میں تھا، مولانا کی زندگی ہی میں ایک مضمون ان پر لکھا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ ہندوستان کا وہ ذہین اور طباع شخص ہے جو کوئی تعمیری کام اپنی یادگار نہیں چھوڑے جا رہا ہے ——— اس خیال کی تردید کے لیے جامعہ ملیہ کا وجود کافی ہے۔ جو ایسی سعید اولاد چھوڑ جائے، اسے یہ کہنا کہ وہ لاولد اٹھ گیا، کیسی صریح زیادتی اور ظلم ہے!

ضمیمہ (نمبر ۱۲)

محمد علی کی یاد[1]

محمد علی کا انتقال شروع ۳۱ء میں ہوا۔ کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو اب تک خدا جانے ان کی کتنی سوانح عمریاں تیار ہو چکی ہوتیں اور ان کی تقریروں اور تحریروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان پر تبصروں اور تحشیوں کا کتنا بڑا انبار لگ چکا ہوتا! یہاں یہی غنیمت ہے کہ جس طرح بھی بن پڑا "سیرت محمد علی" جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام شائع ہو گئی۔ اس کے بعد سے سناٹا تھا۔ یہاں تک کہ اس خادم ملت کی تقریروں اور تحریروں کے بھی ضبط کا کوئی اہتمام نہیں! شکر، اور صد شکر کہ بعد مدت جامعہ والوں میں احساس فرض بیدار ہوا —— وہی جامعہ، جو محمد علی کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے ع

بعد مدت کے ترے مستوں کو پھر آیا ہے ہوش!

مضامین محمد علی، درسی کتابوں کی چھوٹی تقطیع پر ۵۹۰ صفحوں کی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ مرتب، ایک جامعی فاضل، محمد سرور صاحب بی، اے استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں۔ کتاب مجلد، مع تصاویر محمد علی۔ قیمت عمر۔ دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ (امین الدولہ پارک)

[1] صدق یکم مئی ۱۹۳۶ء

ہر جگہ مکتبۂ جامعہ سے مل جائے گی۔ شروع میں فہرست مضامین، اور مرتب کے قلم سے چند صفحوں کا مقدمہ۔ نام سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کل مضامین کا مجموعہ ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ مضامین صرف ہمدرد کے درج ہیں۔ اور ہمدرد کے بھی دور اول (سنہ ۱۹۱۲ء۔ سنہ ۱۹۱۴ء) کے نہیں، صرف دور ثانی (نومبر سنہ ۱۹۲۴ء تا مارچ سنہ ۱۹۲۹ء) کے۔ پھر اس دور کے بھی سارے مضامین نہیں، انتخاب سے کام لے کر ایک بڑا حصہ اس دور کے مقالات کا یکجا کر دیا گیا ہے۔ دیباچہ میں ان ضروری تصریحات میں سے ایک چیز بھی درج نہیں۔ اور یہ بڑی فروگزاشت ہے۔ کل مضامین ایک جلد میں سما بھی کہاں سکتے تھے۔ متعدد جلدیں ان کے سمیٹنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ یہ محض جلد اول ہے۔ اس لیے قیاس یہی ہوتا ہے کہ ناشرین نے اسی ایک مجموعہ پر اپنی ہمت کو ختم کر دیا۔ خدا کرے یہ قیاس غلط نکلے۔ اور اگر ناشرین یہ ارادہ بھی کر چکے ہوں، تو محمد علی کے قدردان اپنی قدردانی کا عملی ثبوت اس زور و شور سے بہم پہنچائیں اور ناشرین کی ایسی ہمت افزائی کریں کہ انھیں خواہ مخواہ اپنا ارادہ بدلنا، اور اس مجموعہ کو محض جلد اول قرار دینا پڑے۔

محمد علی کو کوسنے والے، گالی دینے والے بے تعداد تھے۔ ماننے والے، داد دینے والے شاید ان سے بھی زاید۔ کم ایسے تھے جو محمد علی کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔ فاضل مرتب کا شمار ان ہی چند خوش نصیبوں میں ہے۔ انھیں بہت ممکن ہے کہ محمد علی کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ زیادہ نہ ملا ہو۔ لیکن ہر حال وہ اس شہید ملت کی شخصیت کو سمجھ خوب گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"وہ مخالفتوں اور مصیبتوں میں ہمت ہارنے کو گناہ سمجھتا تھا۔ اپنوں سے لڑا، بیگانوں کو ان کی ناحق دوستی پر ڈانٹتا رہا۔ اپنے بگڑ گئے اور بیگانوں نے بدنام کرنا شروع

کر دیا۔ لیکن اس باہمت اور جوانمرد کے چہرے پر شکن تک نہ آئی، اور اپنوں اور بیگانوں کا آخر دم تک نہایت پامردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ محمد علی اسوۂ حسینی کو اپنے لیے آرام جاں سمجھتا تھا، اور اسی پر وہ تمام عمر عامل رہا۔ وہ شہید ملت ہے، اور اس کی گفتار، کردار، اسکی جانکاہیاں بیناںبیاں، دوستوں سے محبت، اور پھر ان سے عداوت، دشمنوں سے نفرت، اور پھر ان سے محبت، عزیزوں سے مخالفت، دل سوزوں سے بُعد، خون دل پلا پلا کر کسی نخل کو برومند کرنا اور اس کے پھل کو تلخ پا کر اس سے ہاتھ کھینچ لینا، کسی بات کو اپنی طبیعت حق شناس کے خلاف پا کر اسس کی مخالفت کے درپے ہونا، خواہ اس کی مخالفت میں اس کے عزیز سے عزیز جذبات کا خون ہی کیوں نہ ہو، بظاہر اس کا مجموعۂ اضداد ہونا اسی اسوۂ حسینی کی جلوہ فرمائیاں ہیں۔"

"کتاب کی غرض، اسی "خانماں خراب" لیکن دراصل متاع حاصل کی حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ محمد علی کا دماغ بڑا تھا، اور دل اس سے بھی بڑا۔ اردگرد کے نامساعد حالات، زمانہ کے تغیرات، ملک و وطن کے متضاد مظاہر، اور اسلام اور جہانِ اسلام کے انقلابات نے محمد علی کے دل و دماغ کو کچھ اس طرح متاثر رکھا کہ اس کی شعلہ نوائیاں ہر اُس خرمن کو، جو اسے باطل نظر آتا، جلا کر بھسم کرنے پر تل جائیں۔ اس قسم کی خاشاک سوز آگ کو پردوں میں سجا کر دوسروں کو دکھانے کی کوشش بہت مشکل ہے۔ مرتب نے اپنے بس بھر اس امر کی سعی کی ہے کہ قارئین ...... اس آگ کی حقیقت کو سمجھیں۔"

"اندیشہ قوی اسکا تھا کہ "ملیت" (یا صحیح طور پر "وطنیت") کی موجودہ رَو جو ملی بلکہ بہت سے دینی اداروں تک کی اسلامیت کو بہائے لیے جا رہی ہے، کہیں اسی لپیٹ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یہ معلم بھی نہ آ جائیں، اور محمد علی کی تصویر ان کے قلم سے ناقص، ادھوری، اور مسخ شدہ نکلے۔

لیکن یہ اندیشہ باطل ثابت ہوا۔ انھوں نے توازن قائم رکھا، اور تصویر بڑی حد تک صورت کے
مطابق ہی کھینچی۔

نومبر ۲۴ء سے مارچ ۲۹ء تک کا زمانہ، محمد علی کی زندگی کا ایک بہت مختصر اور محدود
حصہ ہے۔ اور پھر جب اس دور کے بھی کل مضامین یکجا نہ ہوں، تو یہ دور اور بھی سکڑ جاتا ہے لیکن
ایک اعتبار سے یہ دور ان کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ محمد علی جب اگست ۲۳ء میں قید سے
رہا ہوئے، تو معاً ان کی خدمت میں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی۔ دسمبر ۲۳ء سے دسمبر ۲۴ء
تک وہ صدر کانگریس رہے۔ اور اسی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں دورہ کرتے رہے۔
ٹھیٹھ اسلامیت کے باوجود، اس وقت وہ انتہائی قومیت کے بھی علمبردار تھے۔ یہاں تک کہ
بیگانوں نے تو خیر، اپنوں نے بھی انھیں ہندو پرست کہنا شروع کر دیا۔ اور ۲۶ء کے مرکزی
خلافت کمیٹی کے ایک اجلاس میں، جو دہلی ہی میں، اور غالباً دفتر ہمدرد ہی میں منعقد ہوا تھا،
ایک بہت مشہور عالم نے کھلے الفاظ میں محمد علی کو اسی کے طعنے دیے۔ ۳۰ء میں محمد علی
کھلم کھلا کانگریس سے الگ ہو گئے۔ لیکن اس کی ابتدا، آخر ۲۸ء ہی سے ہو چکی تھی۔ مضامین
کے پیش نظر جلد میں دونوں مسلکوں کی جھلک موجود ہے۔ کانگریسی رنگ کی گہری اور مسلم
کانفرنسی رنگ کی ہلکی ــــــ حالانکہ جب محمد علی سر تا پا کانگریس میں غرق تھے جب بھی
ان کی اسلامیت کب ہلکی پڑنے پائی تھی؟ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔

مضامین کی ترتیب بلحاظ تاریخ نہیں، بلحاظ موضوع ہے۔ تاریخی الٹ پلٹ اس لیے ناگزیر
ہے۔ بہت سے پچھلے مضامین شروع میں آ گئے ہیں، اور بہت سے پہلے مضامین نے جگہ آخر میں پائی ہے۔
شروع میں دو دعائیہ مضامین کا مقدمہ ہے۔ پھر "آپ بیتی" جس کے اندر ۳۰ مضامین ہیں۔ پھر

"مسائل ملی" جو ۱۲ مضامین کا جامع ہے۔ پھر "مسلمان اور متحدہ قومیت ہند" جس کے تحت میں کل دو مضامین "شخصیات" پر۔ پھر "مسلمان اور آزادی" مع چھ مضامین کے۔ آخری عنوان "بادشاہت اور جمہوریت" کا جس میں پانچ مضامین ہیں۔ یہ ترتیب عنوانات، اگرچہ نہ جامع ہے نہ مانع، لیکن بہرحال جیسی کچھ بھی ہے غنیمت ہے، اور پڑھنے والے کی رہنمائی کے لیے خاصی حد تک کافی۔ پڑھنے والے کو فرط اشتیاق میں دقائق تالیف و ترتیب پر غور کرنے کا ہوش ہی کب باقی رہے گا؟

گائے اور باجہ جس طرح آج اتحاد وطنی کی راہ میں حائل ہیں، محمد علی کے وقت میں بھی تھے، محمد علی نے دہلی کی یونٹی کانفرنس کے موقع پر آخر ۲۴ء میں جواہر لال نہرو اور چند اور ہم خیال ہندوؤں مسلمانوں کی اتفاق رائے سے یہ چاہا تھا کہ

"گائے ذبح کرنے اور باجہ وغیرہ کے تمام مسائل اسی طرح طے کر دیئے جائیں کہ تمام ملتوں کو صاف اور صریح طور پر مذہبی آزادی دیدی جائے لیکن اسی کے ساتھ اس توقع کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ یہ کانفرنس امید کرتی ہے کہ اس آزادی کا استعمال اس طرح نہ کیا جائے گا کہ دوسروں کی دلآزاری ہو، مگر لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن مالوی نے اس کو گوارا نہ کیا، اور جو تجاویز منظور ہوئیں، ان میں اس مذہبی آزادی کو مقامی رواج کی شرائط و حدود کے ساتھ مشروط و محدود کر دیا گیا۔" (ص ۱۹۵)

سو اب، اس دل جلے کے الفاظ میں

"یہ مسئلہ اس وقت طے ہوگا جب یا تو سڑکوں کو آیندہ ورود کے واسطے چھوڑا جائے

اور اسے اور ہر کام کے لیے بند کر دیا جائے اور یا پھر ان کو بالکل کھول دیا جائے۔ ہندو آزاد ہوں کہ جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں، اور جب تک چاہیں، ڈھول اور تاشے پیٹا کریں اور سنکھ اور قرنا پھونکا کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان آزاد ہوں کہ جتنی گائیں جس طرح سجا کر جس سڑک سے جہاں چاہیں لے جائیں، اور ان کا گوشت چاہے ڈھکا لے جائیں چاہے کھلا لے جائیں، کوئی کسی کا مزاحم نہ ہو۔ چند دن میں آپ ہی دونوں ملتیں، ایک دوسرے کی ضد پر اپنے فرائض ادا کرنا چھوڑ دیں گی، اور شرافت اور بھلمنسی کی طرف عود کریں گی اور حقیقی رواداری کو اپنا شعار بنائیں گی۔" (ص ۱۹۶)

پھر آگے چل کر مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ

"اسلام کسی مسلمان کو اس کا حکم نہیں دیتا کہ وہ مسجد کے سامنے مجرد باجہ کے ساتھ ایک جلوس کے نکلنے پر کسی کا مقابلہ کرے، اور اس سے جنگ وجدال کرے۔ باجہ کو زبردستی روکنا میرے نزدیک مناسب نہیں ہے لیکن اگر کوئی ملت مسلمانوں کی عبادت میں خلل انداز ہو اور اس پر اصرار کرے کہ نہیں ہم تو تمہاری عبادت کے وقت ضرور شور مچائیں گے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو حسب استطاعت اس خلل اندازی کو بند کرنا چاہیے، اس بارے میں پھر وہی احکامِ شریعت متعلق سمجھے جانے چاہئیں، جو فرائضِ مذہبی کی ادائگی کی بندش کے متعلق ہیں۔"

اور سب سے آخر میں:۔

"ہندو مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو۔ اور حکومت اس تماشہ کو دیکھ رہی ہے، اور کسی سے آج مرعوب نہیں، اور دونوں کو مرعوب کیے ہوئے ہے، یہ ایک سیاسی جنگ ہے۔ اور میں نہ اسی کو گوارا کر سکتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں سے مرعوب ہو جائیں اور نہ اسی کو چاہ سکتا ہوں کہ ہندو مظلوم ہیں۔" (ص ۱۹۰)

تازگی اور زندگی کلام جوہر کا خاص جوہر ہیں۔ بارہ بارہ پندرہ پندرہ برس کے لکھے ہوئے مضامین معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کے لکھے ہوئے ہیں۔ تشریح طلب واقعات و تلمیحات پر مرتب کو حواشی دینے ضرور تھے۔ اور یہ ایک بڑی کمی ہے، جو تہذیب کتاب کے سلسلہ میں رہ گئی۔ لیکن اس پر بھی کوئی نمایاں بے لطفی کتاب پڑھنے میں معلوم نہیں ہوتی۔

جنوری ۲۷ء میں "نئی دہلی" میں مرکزی اسمبلی کے نئے اسمبلی ہال کا افتتاح وائسرائے بہادر کے ہاتھوں، بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ امیدوں کے سبز باغ نے کتنوں کے غنچۂ دل کھلا رکھے تھے۔ محمد علیؒ بہ قول خود "حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکے تھے۔" تاہم اردو کے قلیل الاشاعت لیکن سب سے زیادہ معزز و باثر روزنامہ کے اڈیٹر تو بہرحال تھے۔ تماشہ میں شریک ہوتے ہیں، اور دوسرے دن اپنے ناظرین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں:-

"..... کتنے سادہ لوح ہوں گے، جو اپنے دلوں میں اس آرزو کو چھپائے ہوئے امید و بیم کی حالت میں ہوں گے، کتنے اور ہوں گے جن کا اصولِ زندگی عشاق کی طرح یہی ہے کہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یہ نام کے عاشق اسی میں مگن ہیں کہ اصلاحات کی توسیع کے لیے شاہی کمیشن مقرر ہو یا نہ ہو نائب شہنشاہ کا درشن تو نصیب ہوگا۔ اسی سے بھاگ کھلیں گے۔ ملک کی وارث خالق کے حکم سے تو خلق ہی تھی، مگر اس نے بادشاہت اور شہنشاہیت کے فریب میں آکر اپنی آزادی کیا ملکہ ملکیت کو غلامی کے عوض کب کا بیچ دیا، اور وہ حقیقت شناس ہستیاں بھی جن سے توقع کی جاسکتی تھی کہ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیفَۃً کے ترکہ کو کبھی کسی کے فریب میں

آکر نہ چھوڑیں گی، وہ بھی بظاہر دولت و ثروت سے محروم ہو کر اس فریب پر مجبور تھیں کہ بادشاہوں کو دیکھ کر قصیدوں میں لکھیں ؎

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریب طغرل و سنجر کھلا

...... کاش طغرل و سنجر کے فریب کی طرح قیصر ہند اور نائب قیصر کا فریب کھل جاتا اور کوئی ان تماشائیوں سے کہتا کہ ؎

اے تماشا گاہ عالم روے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

۳۲ کرور خدا کی مخلوق، یعنی نسلِ انسانی کا ایک خمس مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے، جو سات ہزار میل کے فاصلہ سے سات سمندر پار آکر ان پر حکومت کرتے ہیں، عجوبۂ روزگار یہ چیز ہے، اور پانچ براعظموں کے تماشائی دور دراز مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ اور دلی کا لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں، لیکن آج یہ مخلوق خود دوسروں کی تماشائی ہے! ......

ہر ملت اور ہر طبقہ کے لوگ تھے، اور سب سے زیادہ نمایاں وہ وارثان تاج و تخت تھے جو نائب السلطنت کے سید ھے ہاتھ پر جلوہ کناں تھے جن میں سورج بنسی بھی تھے اور چندر بنسی بھی۔ مگر آج جن کا جگمگاتا لباس اور زنانہ زیوران کو اس چمکتے ہوئے ذرہ سے ہرگز زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ جن پر حکومت کا مہر عالمتاب چمکتا ہو اور ان کو بھی چمکا رہا ہو

میں اگر فقط نامہ نگار ہوتا، تو مجلس کی ترتیب، شرکائے جلسہ کا لباس یا آج کل کے فیشن کے مطابق، بعض کی بے لباسی نہیں تو کم لباسی، اور فوج کی صف آرائی اور جلوس کے طمطراق کا حال لکھتا، مگر کیا کروں۔ یہ میرا حقیقی شعار نہیں۔ ملک و ملت کے عشق میں قلم کو بھی ایک آلہ کی حیثیت سے اٹھا لیا گیا ہے ....

لاؤڈ اسپیکر نے ایک ایک حرف یعنی کھانسی، کھنکار، سوادی گرگوش مژدہ ہوش سا ای تقریر میں ایک حرف مطلب بھی نہ سن سکا۔ سارے ملک میں سرکار والا تبار کے قدوم میمنت لزوم نے تفریق وانتشار پھیلا رکھا ہے، لیکن لاٹ صاحب بہادر نے فرمایا کہ یہ قانون سازی کا گول گھر اتحاد کی علامت ہے!...... اور کیوں نہ ہو، ہمارے تعلیم یافتہ ہمیشہ ہمیش اسی چکر میں رہیں گے اور یہ دائرۃ السوء اسی طرح تا قیامت باقی رہے گا......... خیال تھا کہ کم سے کم شاہی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوگا، مگر تقریر کا خاتمہ صرف دعا پر ہوا۔ دوا کا نام بھی نہ تھا۔ لاٹ صاحب نے دعا فرمائی کہ خدا اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل و عدل کی توفیق دے۔ ہم سوا آمین کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدایا اگر ان کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں کو عقل دے کر اس فریب عدل سے نجات پائیں۔" (ص ۳۰۲ تا ص ۳۰۷)

اب تو کسے یاد رہ گیا ہوگا لیکن بات کچھ ایسے بہت دنوں کی نہیں، وسط ۲۶ء کی ہے کہ وطنیت کے بعض علمبرداروں نے "فرقہ واریت" سے تنگ آکر ایک نئے نظام کی طرح "انڈین نیشنل یونین" کے نام سے، صدائے طبل و دہل کے ساتھ نہیں، صدائے نا قوس کے ساتھ ڈالنی چاہی تھی، پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کے دستخط سے جو دستور العمل اس نئی مجلس کا شائع ہوا، اس کی رو سے ہر ممبر کو سب سے پہلے یہ اقرار کرنا تھا کہ "ہندوستان کی ترقی اور آزادی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتیں ایک مشترکہ اور متحدہ ہندوستانی قومیت پیدا کریں۔" اور اقرار نامہ کی سب سے آخری دفعہ یہ تھی کہ "میں کسی ایسے فرقہ وارانہ نظام کا جسے یونین نے قومیت ہند کو نقصان پہنچانے والا قرار دیا، نہ ممبر ہوں اور نہ ممبر ہوں گا۔"

محمد علی کا قلم اس پر ایک طویل تبصرہ کے دوران میں رواں ہوتا ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک مقصد اور حصول مقصد کے لیے وسائل کا تعلق ہے، اس نئی تحریک میں کوئی ندرت نہیں، اور جس خطرے کا ذکر خود ان حضرات نے اپنے بیان میں کیا کہ کہیں یہ مجلس بھی صرف یہی نہ کرے کہ موجودہ سیکڑوں مجالس میں ایک اور اضافہ کرے، اس سے بچنا اس مجلس کے لیے آسان نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان میں مذہب سازی اور مجلس سازی کا ایک مہلک مرض پیدا ہو گیا ہے، اور بجائے اس کے کہ ہم موجودہ مذاہب میں سے کسی کے احکام کی پابندی کریں، یا پرانی مجالس میں سے کسی کے مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں، ایک نئے مذہب اور نئی مجلس کے بانی ہونے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر مذہب اپنے معتقدین پر کچھ نہ کچھ ذمہ داری عائد کرتا ہے، اور ہر مجلس اپنے اراکین کو کسی نہ کسی قدر ضرور پابند کرتی ہے، اس ذمہ داری کا شعور و احساس کو ہم میں پیدا نہیں ہوتا، اور ان پابندیوں سے تو ہم اکتا جاتے ہیں، مگر نئے نئے مذاہب اور نئے نئے مجالس کی بنیاد ڈالنے کے لیے ہمارے ہاتھ کھجلاتے رہتے ہیں۔ ایک ندرت البتہ اس نئی مجلس کے بانیوں نے رکھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کے اراکین تمام مجالس ملی سے علٰحدہ ہو جائیں۔ مگر یہ ندرت ایسی زبردست تھی کہ اسی کے باعث یہ نئی مجلس عجوبۂ روزگار بنی جاتی تھی .... اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازہ پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو امید کو باہر چھوڑ آئے۔ پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنا چاہی تھی جس کے دروازہ پر کندہ ہو کہ جو اس میں داخل ہونا چاہے وہ ملت و مذہب کو باہر چھوڑ آئے ...... یقیناً"

ایک مختلف الاجزاء، مگر متحدہ اور مشترکہ قومیت ...... کو ترتیب اور نشو و نما دینا ہر محب وطن اور ...... وطن پرور ہندوستانی کا فرض ہے۔ لیکن بے سوچے سمجھے کمال تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ کمیونلزم یا ملیت، نیشنلزم یا قومیت کے منافی ہے۔ اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری یا ملت پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ اور خاندان کی پرورش اور ان کی تنظیم سے منع کرتا پھرے ......

قومیت کو منتہائے نظر بنانا یورپ کی تقلید جامد ہے، اور وطنیت خود وثنیت یا بت پرستی ہے۔ اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں۔" (ص ۲۵۹ تا ۲۶۲)

"ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم"۔ سارے مجموعہ میں چھوڑنے کے قابل کون سا مضمون ہے، سب ہی مضامین اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہیں۔ لیکن بعض مضامین پھر بھی خصوصیت کے ساتھ، اور ایک سے زائد بار پڑھنے کے قابل ہیں، اگر کسی اور غرض سے نہیں، تو کم از کم مضمون نگار کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے۔ اور محمد علی کے دماغ اور دل دونوں کا عکس دیکھنے کے لیے۔ اور ان ہی میں ایک وہ مضمون ہے، جو وسط کتاب میں مسودۂ قانون توہین انبیاء و بزرگان دین پر ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آج سے چند سال قبل ادھر تعزیرات ہند میں کوئی دفعہ انبیاء و ہادیانِ مذہب کی توہین کو جرم قرار دینے والی تھی ہی نہیں! اور اس سے بعض خبیث طبع لوگوں کو گندہ دہنی کے خوب موقع مل جاتے تھے۔ چنانچہ ۲۷ء میں اس قسم کا ایک سخت مسلم آزار واقعہ لاہور میں پیش آیا۔ ہائیکورٹ سے ملزم بری ہوگیا۔ سارے اسلامی ہند میں ایک تہلکہ مچ گیا سب نے نا انصاف جج پر دھاوا بول دیا۔ حواس صرف محمد علی کے درست رہے، پر زور رائے عامہ کے خلاف ہمدرد میں لکھا کہ "قصور قاضی کا نہیں، قانون کا ہے"۔ (افسوس اور حیرت ہے کہ یہ مضمون لائق مرتب کی نگاہِ انتخاب سے کیسے رہ گیا؟) اور پھر خود ہی ایک مسودۂ قانون

اس مضمون کا پیش کیا، جو بالآخر اسمبلی میں پاس ہو کر دفعہ ۲۹۵-الف کے نام سے تعزیراتِ ہند کا جزو بنا۔

اس مسودہ کو مسلمان ارکان اسمبلی کی خدمت میں پیش کر کے لکھتے ہیں کہ "مجھ جیسے عطائی نے ایک مسودۂ قانون تیار کیا ہے، جسے آج اطبائے حاذق کے سامنے نہایت ادب و عجز و انکسار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔" باقی

"جہاں تک خود میرا تعلق ہے مجھے نہ قانون کی ضرورت ہے نہ عدالتوں کی حاجت اگر کوئی ہندوستانی بھائی اس قدر شقی القلب ہے کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس منوا کر اس سے متمتع ہونے کے حق سے میری دست برداری کی طالب ہے لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہیں، ان میں سب سے اشرف نبی سرورِ کونین اور باعثِ تکوینِ عالم کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اس کا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اس برگزیدہ ہستی کی توہین کر کے میرے قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے۔ تو ہندوستان کو اس غلامی سے نکالنے کے لیے جس میں آج وہ مبتلا ہے، اور جو گاؤ پرست ہندوؤں کے وجود سے کہیں زیادہ، ہمارے اور ہماری ملت کی بے حرمتی کا سبب ہی، مجھ سے جہاں تک صبر ہو سکے گا، صبر کروں گا اور جب صبر کا جام لبریز ہو جائے گا تو اٹھوں گا اور یا تو اس گندہ دل، گندہ دماغ، گندہ دہن کافر کی جان خود لے لوں گا، یا اپنی جان اس کوشش میں کھو دوں گا۔" (ص ۳۴۵)

انگریزی حکومت کے طرز کار پر دوسروں نے کیا کچھ کہہ ڈالا، اور کتنا کچھ کہہ ڈالا ہے محمد علی کو دیکھئے، ان کی ساری ذہنیت کا عطر دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

"انگریز کسی کو ہرگز اس وقت تک کچھ نہیں دیتے جب تک انھیں اس کا یقین

نہ ہو جائے کہ اگر آج اتنا بھی نہ دیا گیا تو کل کو اس سے دوگنا اور تگنا دینا پڑیگا"۔ (صفحہ ۳۵۰)

جامعہ ملیہ کے خصوصیات کی تفصیل میں رسالہ کے رسالے اور کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر دیکھیے خود بانی جامعہ کس حیرت انگیز اعجاز کے ساتھ اس کی خصوصیات، چشم زدن میں گنا جاتا ہے:

"خدا پرستی - ملت پروری - وطن دوستی" (صفحہ ۱۴)

ایسی کتاب جو اسلامی جوش، سیاسی معلومات، تاریخ سیاسیات ہند، اور ایک نہیں بیسیوں مسائل حاضرہ کے اعتبار سے قابل قدر ہو، اور دلچسپ زبان اور دلکش حسن بیان کے ساتھ، باوجود تقریباً ۶۰۰ کی ضخامت اور خوشنما جلد و طباعت کے کل ع۱۲ میں ہاتھ آجائے اس کے مطالعہ سے اپنے کو محروم رکھنا (اگر شدید تنگدستی ہی مانع ہو، جب تو مجبوری ہے ورنہ اور کسی عذر کی بنا پر تو) خود اپنے ذوق سلیم پر ظلم کرنا ہے!

ضمیمہ نمبر (۱۳)

زندگی کی آخری شب

(مولانا شوکت علی صاحب کا مکتوب روزانہ خلافت میں)

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لندن ۳۱-۱-۹

عزیزم جعفر صاحب۔ السلام علیکم۔ میں نے دفتر کے تمام کارکنوں کے نام خطوط لکھے تھے، تاکہ کسی کو شکایت باقی نہ رہے، آپ کا نمبر آج آیا ہے، اور یہ خط میں خون جگر سے لکھ رہا ہوں۔ تم کو سلام کیا لکھتا۔ ہر ہفتہ تمھارا خط آتا تھا، اور حالات معلوم ہوتے تھے۔ اوروں کو سلام لکھتا یا اس کو جو دفتر میں بہت سے کاموں کا ذمہ دار تھا۔ آج کے خط سے تمھاری شکایت دور ہو جائے گی۔ مگر میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ میں جب خلافت کے لیے خط لکھتا ہوں تو وہ خط سب خلافت کے حامیوں کے لیے ہوتا ہے۔ اب چند خطوط میرے اور آئیں گے، اس کے بعد میں خود بمبئی اور ہندوستان میں ہوں گا۔ اور کولھو کا بیل پھر کام میں لگ جائے گا۔ اور اب انشاء اللہ پہلے سے زیادہ طاقت اور کامیابی کے ساتھ کیونکہ خدا بہت سے نئے کام کرنے والے پیدا کر رہا ہے۔ آج محمد علی کا جنازہ پانچ دن

کفن دوزوں کے مکان پر آرام کر کے ٹلبری بندرگاہ کو گیا اور ۳ بجے جہاز "نرکنڈہ" اس کو لے کر بیت المقدس کو روانہ ہو گیا۔ ۱۶ جنوری کو بیگم محمد علی، زاہد اور میں اسی جہاز پر مارسیلز سے روانہ ہوں گے اور ۲۱ کی صبح کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ جہاں مصر، شام، فلسطین اور عراق کے عرب بھائی اس کو مسجد اقصیٰ میں دفن کریں گے۔ میرا بھائی کہو، بیٹا کہو، مرد ار کہو، غلام کہو، عاشق کہو یا معشوق، مجھ سے رخصت ہو گیا اور اب میں اکیلا رہ گیا۔ بے دست و پا ہوں، مگر خدا پر بھروسہ ہے۔ اور وہ ایک محمد علی کی جگہ دین مقدس کی خدمت کے لیے ہزار محمد علی پیدا کر دے گا۔ میں تم سے دور ہوں پھر بھی خوب جانتا ہوں کہ اس موت سے مسلمان بجائے کمزور ہونے کے کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ خیر جو کچھ ہو اسلام کا یہ مخلص سپاہی میدان جنگ میں ایک زبردست ڈنکے کی چوٹ مار کر سپاہی کی موت مر گیا۔ اور اسلام کا نام کر گیا۔ ہنستا اور کھیلتا دنیا سے اٹھ گیا۔ آج دل میں صدمہ ہے۔ ہاتھ حالات لکھتے ہوئے کانپتا ہے، پورا قصہ بمبئی میں آکر سناؤں گا۔ اس وقت تک دل پر قابو پا جاؤں گا۔ آج عبارت آرائی کو دل قبول نہیں کرتا۔ پھر بھی جبر کر کے ضروری حالات لکھتا ہوں۔

محمد علی کا علاج صرف احتیاط، سکون اور پرہیز تھا۔ سب سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کہاں نصیب ہوتی مسلمانوں کی موت اور زیست کا سوال تھا کس طرح خاموش رہتا۔ عمر بھر کبھی احتیاط کام کے وقت کی نہ تھی۔ اب کیا کرتا۔ اور پرہیز کون عمر بھر کرتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوت ۱۰ برس معمولی احتیاط کی زندگی بسر کرنے میں کام کرتی اس کو دس مہینے میں خرچ کر دیا۔ اور بی اماں مرحومہ کی طرح یہ طاقت خرچ کر کے میٹھی نیند سو گیا۔ آخری دورہ تقریباً ۲۰ دسمبر کو پڑا تھا۔ میں ۲۳ دسمبر کو آئرلینڈ ۴ دن کے لیے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے

ملتوی کر دیا، نرسوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اور ہم سب شب و روز ہائڈ پارک ہوٹل میں موجود رہتے تھے۔ اور میں تو وہیں سوتا تھا۔ ۴۸ گھنٹہ کی کشاکش کے بعد خدا نے خطرہ سے باہر کر دیا اور اب امید پڑی تھی کہ وہ کام سے باز آئیں گے اور خدا ان کو صحت دے گا اور وہ ہندوستان مع الخیر واپس جائیں گے۔ طبیعت اس قدر درست ہو گئی تھی کہ ۳۱ر دسمبر کو گلنار بانو کی سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے بہت سے احباب کو ہندوستانی شفیع ہوٹل کے طیار کیے ہوئے کھانے کی دعوت دی۔ آج تک کبھی کسی اولاد کی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ جب میں نے منع کیا تو کہا کہ "مت روکو، میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ وہ بچی خوش ہو جائے گی۔" میں اسی دن آئرلینڈ چلا گیا کیونکہ محمد علی کی صحت اچھی تھی۔ اور وہاں جانا ضروری تھا تاکہ مقررہ ملاقاتیں ہو جائیں، اور آئرلینڈ کے حالات سے واقف ہو جاؤں۔ چار دن رہ کر واپس آیا۔ اور اتوار کی صبح کو ۶ بجے لندن واپس آگیا۔ مگر گاڑی ہی میں ۸ ½ بجے تک رہا۔ بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی، اور کیسے ملتی۔ ہفتہ کے دن صبح کو ایک گھنٹہ بھر نواب عبدالقیوم سے سرحد کے معاملہ پر مفصل گفتگو کی۔ وہ خود سرحد کی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اور چاہتے تھے کہ سرحد کے معاملہ میں مسلمان نہایت سختی کے ساتھ کھڑے ہوں اور مطالبات میں کمی نہ کریں۔ اس کے بعد ۱ ½ گھنٹہ سندھ کے بارہ میں سر شاہ نواز بھٹو سے گفتگو کی۔ تیسرے پہر کو بیگم عبدالعزیز صاحب لاہور سے ۲ گھنٹے مسلمان عورتوں اور اسلامی حقوق کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ دو دن قبل تین گھنٹے متواتر سر جوفرے کاربٹ کے سامنے سنارٹ ہینڈ والے کو ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے اور دوسرے دن ۲ ½ گھنٹے خود اس کے پروف صحیح کیے۔ ۵ بجے شام کو ہفتہ کے دن ڈاکٹر سے کہا کہ میں تھک گیا ہوں، ذرا آرام کر لوں۔ دو گھنٹے آرام کیا۔ جب ۷ بجے غفلت سے ہوشیار ہوئے تو دماغ درست تھا مگر زبان بند ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر رائلز کو ڈاکٹر انکلشریہ نے بلایا اور انھوں نے کہا کہ

دماغ میں خون کی رگیں پھٹ گئی ہیں اور اب کوئی امید نہیں ہے۔ یہ واقعہ قریب ۱۱ بجے شب کا تھا۔ سب کو پہچانتے تھے۔ سیدھی ٹانگ، سیدھے ہاتھ اور سارے جسم پر سیدھی طرف اثر تھا فالج کا سا۔ ۲ بجے سے بالکل غافل تھے۔ اور ۹ ½ بجے دن کو نہایت سکون کے حالت میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عبدالرحمٰن صدیقی صرف علاوہ نرس کے کمرہ میں تھے۔ انھوں نے سب کو پکارا، اور اور لوگ بھی آ گئے۔ میں انتقال کے ۱۵ منٹ بعد پہنچا، اور گلنار بانو تھوڑی دیر قبل۔ جن لوگوں نے ہفتہ کے روز ملاقات کی تھی ان کو اس طرح گزر جانے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ساری قوت صرف کر دی تھی اور دماغ اس قدر اسراف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں جب اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو اسی وقت صاحب خانہ نے اطلاع دی اور میں سیدھا ہوٹل آیا۔ بیگم محمد علی کی خدمات اور ہمت کا تذکرہ کرنا بیکار ہے، شب و روز خدمت کی مظفر علی دیانا سے ملنے کو آ گئے تھے، وہ اور زاہد بھی حاضر رہتے تھے۔ شعیب صاحب کو جب کام سے فرصت ملتی تھی تو وہ بھی دن میں تین چار پھیرے کرتے تھے۔ ہز ہائینس مہاراجہ الور تو اس رات بالکل نہیں سوئے۔ پانچ یا چھ مرتبہ کمرے میں دیکھنے آئے اور بعض اوقات سونے کے کپڑوں میں اور ننگے پاؤں۔ ان کو اس قدر صدمہ ہے کہ جب مجھ کو دیکھتے ہیں رنج کی وجہ سے سلام کر کے منہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔

عزیزی میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے محمد علی کا چہرہ اس قدر خوبصورت کبھی نہیں دیکھا، میٹھی نیند، اطمینان سے جیسے کوئی سوتا ہوتا ہے۔ آخری وقت میں ذرا تکلیف نہ تھی بسکون تھا۔ مسلمان تھا مسلمان کی موت اس کفرستان میں مرا، اور تمام ملک والوں سے خراج تحسین

وصول کیا۔ خبر ہوتے ہی ہر طرف سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ یہاں کے ہوٹلوں سے میت صرف رات کے ۱۲ بجے کے بعد باہر نکالی جاتی ہے، لندن کے تقریباً سب ہندو اور مسلمان آنے والے آتے تھے اور زیارت کر کر کے چلے جاتے تھے۔ گول میز کے سب ارکان باری باری آتے تھے۔ سفید چادر چہرہ پر پڑی تھی، جب ہٹا کر منہ کھول کر میں دیکھتا اور دکھاتا تھا تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص آرام سے سو رہا ہے، آنکھ یا چہرہ پر تکلیف کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا۔ شام ہی کو ہوٹل کے منیجر نے مشہور کفن تیار کرنے والے کارخانہ ملس کو بلایا جس کی منتظمہ ایک معقول عورت تھی۔ زاہد جا کر سب جگہ دیکھ آئے۔ رات کے ۱۲ بجے موٹر کر کے اور اسٹریچر بھی اور بہت ہوشیار اٹھانے والے احتیاط سے میت کو اٹھا کر لفٹ سے نیچے لائے اور موٹر میں رکھا۔ میں اسی موٹر میں سوار رہا۔ نئے مکان میں رکھا جہاں رات ہی کو دوا کا انجکشن دے کر نعش کو ایسا کر دیا گیا کہ دس برس تک بھی خراب نہ ہو۔ میں اور دو مسلمان عزیز طالبعلم اس مکان میں زمین پر سوئے۔ صبح کو عبدالرحمن صدیقی، مظفر اور میں نے غسل میت دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، زبان پر کلمہ طیبہ اور قرآن مجید تھا اور محبت والے ہاتھ آخری خدمت کرتے تھے۔ زاہد ٹیلیفون پر بیٹھے سب کو اطلاع دیتے تھے۔ نماز جنازہ شام کو ۶ بجے پیڈنگٹن ٹون ہال میں ہو گی جہاں ۴۰۰ یا ۵۰۰ آدمیوں کی گنجایش تھی۔ عالیشان جگہ تھی۔ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ۵ بجے سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ مہاراجہ کشمیر، نواب صاحب بھوپال، مہاراجہ بیکانیر اور تمام ارکان اور وزراء معہ وزیر ہند موجود تھے، جب جنازہ کی موٹر آئی تو ہز ہائی نس شاہ ولی خان سفیر افغانستان، عفیفی پاشا سفیر مصر، نوری اسفندیاری صاحب سفیر ایران، شیخ حافظ وہبہ صاحب سفیر حجاز اور مسلمان ارکان گول میز کانفرنس اور دیگر حاضرین نے کندھا دیا۔ باہر انگریزوں کا ہجوم تھا۔ اور اندر بھی تمام جماعتوں کے انگریز نمایندے تھے۔ ہال میں نماز ہوئی۔ کفن کا بکس یہاں بہت خوبصورت بناتے ہیں اور قیمتی ہوتا ہے۔

ایک چھوٹی آئینہ کی کھڑکی تھی، جس میں سے چہرہ نظر آتا تھا۔ اخبار والے موجود تھے، سب نے فاتحہ کے بعد زیارت کی اور ایک گھنٹہ کے بعد میت پھر قیام گاہ پر گئی۔ خوبصورت پھولوں کے ہار مہاراجہ پٹیالہ مہاراجہ دھولپور، مہارانی کوچ بہار حیدر آباد دکن کے وزرا، اور لندن کے ہندوستانی طلبہ کی طرف سے رکھے تھے۔ دو طھا اچھا تھا۔ قریب ہی میں سوتا تھا۔ دن اور رات تلاوت قرآن مجید ہوتی تھی۔
۵ رجنوری کو نماز جنازہ ہوگئی۔ آج صبح میت جہاز پر گئی۔ ہندوستان لاتے تھے، مگر فلسطین کا تذکرہ عبدالرحمن صاحب صدیقی نے کیا تھا۔ اور بعد کو مفتی اعظم کی دعوت اور تمام برادران وطن کی دعوت پر مسجد اقصیٰ میں دفن کا قصد کیا گیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلقات برادران عرب سے وابستہ ہو جائیں۔ ۲۱ کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ بیگم صاحبہ اور زاہد جہاز سے بعد تجہیز و تکفین بمبئی آئیں گے اور میں خشکی سے شام اور بغداد ہوتا ہوا کراچی جہاز سے پہنچوں گا۔ ہاں ہمارے عزیز دوست اور قابل فخر مجاہد رؤف بے بھی موجود تھے اور میت کو کندھا دے رہے تھے۔ اخبارات اور تاروں میں تمام جگہوں سے اظہار ہمدردی ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ اس مجاہد اسلام کی موت بھی کام زندگی سے اچھا کرے گی۔ دعا فرمایئے۔ بمبئی کے تاروں سے ہمدردی کی خبر ملی۔ خدا تم کو جزائے خیر دے۔ بمبئی تو مسلمانوں کی خدمت کچھ کر گیا۔

ضمیمہ (نمبر ۱۴)

آخری لمحے اور وصیتیں

از

(جناب حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر ایم ایل سی کانپور)

مولانا محمد علی کے میرے تعلقات ۱۸۹۴ء سے تھے، جب کہ میں اور وہ دونوں علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے۔ یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ جو تعلقات برادرانہ اس وقت قائم ہوگئے تھے، ان میں باوجود اکثر اختلاف آراء کے کبھی کمی نہ ہوئی، بلکہ اور زیادہ مستحکم ہوتے گئے۔

خلافت کے زمانہ میں بھی میں نان کوآپریٹر نہیں تھا، لیکن جب وہ آتے میرے یہاں ہی ٹھہرتے۔ اختلاف آراء سے ذاتی تعلقات میں فرق نہ آیا۔

جس جوان مردی سے انھوں نے ملک اور قوم کی خدمت کی وہ عدیم المثال ہے، آخر میں ان کو برادران ہنود سے بہت شکایت پیدا ہوگئی تھی، وہ علانیہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہرگز وہ اس حیثیت میں نہیں دیکھ سکتے جس میں کہ ہندو ان کو رکھنا چاہتے ہیں، ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو جناب نواب صاحب چھتاری نے ——— اپنے چند ہندوستوں کو ایٹ ہوم اپنے جائے قیام الگزنڈرہ ہوٹل لندن میں دیا تھا۔ اس میں صاحب وزیر ہند مسٹر ویجوڈ بین بھی تشریف لائے تھے، میں اور مولانا ایک کوچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مسٹر بین نے مجھ سے کہا کہ مولانا سے باتیں کرنا فخر ہے، تم اکیلے ہی یہ فخر کیوں کر حاصل کر سکتے ہو، مجھ کو بھی حصہ دو۔ میں ہٹ گیا اور مسٹر بین

مولانا کے پاس بیٹھ گئے اور بہت دیر تک دونوں میں ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، مولانا نے وہاں بھی مسلم مطالبات کی تائید و ترجمانی کی تھی، ۱۵ر نومبر سے مولانا محمد علی کی حالت اچھی نہیں تھی. لیکن باوجود سخت بیماری کے مولانا راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جاتے اور حصہ لیتے تھے۔ پرائم منسٹر سے ان کو یہ شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مسلم مطالبات کو سننے پر ہمدردانہ طریقہ سے طیار نہیں ہیں، وفات کے چند روز قبل وہ صاحب فراش ہوگئے تھے، میں ان کو دیکھنے جب مجھے فرصت مل جاتی تھی برابر جاتا تھا، بعض مرتبہ روز بعض مرتبہ دوسرے تیسرے روز. اپنی وفات سے کچھ ہی قبل ایک نہایت معرکۃ الآرا مضمون مسلم مطالبات پر انھوں نے لکھواکر پرائم منسٹر کو بھیجا جو ممبران راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو بھی بھیجا گیا. جس روز ان کا انتقال ہوا ہے اس دن بھی میں ان کو دیکھنے گیا تھا. مجھ کو انھوں نے یٰسین شریف تلاوت کرنے کو کہا اور اسکے بعد آخری وصیت مسلم مطالبات کے متعلق انھوں نے یہ کی کہ ہندوستان میں پانچ صوبے مسلمانوں کی اکثریت والے قائم کرانے میں بجان و دل کوشش کرنا اور اگر یہ پانچ صوبے قائم ہو جائیں تو انتخاب جداگانہ کو اس طرح ترمیم کر دینا کہ مسلمانوں کے انتخاب میں چالیس فی صدی کم سے کم مسلمانوں کے ووٹ ہوں اور کم سے کم دس فیصدی دیگر اقوام کے ووٹ ہوں. آخر الذکر ترمیم میں چند دقتوں کا ہونا انھوں نے تسلیم کیا، لیکن یہ کہا کہ میں انتخاب جداگانہ کو ترک کرنے کی رائے نہیں دے رہا ہوں بلکہ اس میں ترمیم کی رائے دے رہا ہوں. گفتگو بہت صاف تھی اور آخر وقت تک ہوش و حواس بجا تھے، افسوس کہ مسلمانوں کا ایک ایسا چراغ کہ جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی گل ہوگیا۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو بخش دیا اور اپنے الطاف سے اس کو مالا مال کر دیا. لیکن مسلمانوں کو اس کی رہبری سے محروم کر دیا۔

اس کتاب کے جملہ حقوق نقل و ترجمہ دار المصنفین کے حق میں
محفوظ ہیں، مہتمم صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی اقدام نہ فرمایا جائے

اشاریہ

محمد علی حصہ دوم

(اشخاص)

ALLAMA IQBAL LIBRARY
19105

محمد علیؒ

(حصۂ اوّل)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح وحالات و وقائع زندگی، جو مولانا عبد الماجد دریابادی کے ذاتی علم ومشاہدہ وتجربہ میں آئے، اور جن میں وہ اُن کے برابر کے شریک اور معاون ومددگار رہے، اس حصہ میں ۱۲ء کے آغاز ملاقات سے ۲۷ء تک کے واقعات وحالات ہیں جس میں قید فرنگ، قید تنہائی، کانگریس کی صدارت، گاندھی جی کی میزبانی، ہمدرد وکامریڈ کے اجراء، شریفی سعودی جنگ، پیر ومرید کی آویزش، حج اور وفد خلافت، قوم کی قدر دانی اور بیزاری وغیرہ کے واقعات بڑی تفصیل کیساتھ، ۶۷ ابواب، اور ۴۲۰ صفحات میں آئے ہیں، ایں تو بظاہر یہ ذاتی ڈائری کے چند ورق لیکن انہی چند اوراق میں مولانا محمد علیؒ کے دور کی ہندوستان کی مکمل سیاسی وقومی تاریخ قلمبند ہوگئی ہے، قیمت :- ہیر

حکیمُ الامّت

حکیمُ الامّت، شیخ وقت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری ۱۵ سالہ حصۂ زندگی کا ایک نرالا مرقّع، فقہ وتفسیر، حدیث وسنّت، سلوک وکلام، ادب وحکمت، صحافت وسیاست کے صدہا مضامین کا گلدستہ، قیمت : ہیر

سفرِ حجاز

مولانا دریابادی کا سفر حجاز، عازمین حج کے لئے بہترین زادراہ، اور بہترین مشیر ورہنما، ادب وانشاء کی خوبیاں اس پر مستزاد اور حواشی اور ضمیمون کے اضافہ کے ساتھ، قیمت :- صہ ر

(طابع وناشر صدیق احمد)